عروضِ سخن

ڈاکٹر سید تقی عابدی ایم ڈی

عروسِ سُخن

تاریخی، تحقیقی، تخلیلی اور تنقیدی تحریروں کا مجموعہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، ایم۔ڈی

القمر انٹرپرائزز
غزنی سٹریٹ
اردو بازار ۰ لاہور

گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد

پیدا است کہ با ایں سر و ساماں چہ نویسم
گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد

تقریباً تیس سال سے روزنامہ ''سیاست'' دکن میں مضامین، مقالات اور مطالب لکھنے کی مشق سخن جاری رکھی۔ حیدر آباد کی آبادی کو چھوڑ کر خانہ بدوشی کی بربادی کو پسند کیا۔ معاش کے لیے آسائش اور رہائش کو قربان کیا، لیکن ہر دور زمانہ میں میدان سخن میں اشہب قلم کو دوڑایا، کبھی اشہب قلم سے گرا تو یہ کہہ کر دل بہلایا:

گرتے ہیں شہسوار ہی، میدان جنگ میں

دیارِ غربت میں اردو کا چہرہ زرد و بے رنگ نظر آیا تو طلسم قلم سے رنگ بھرنے کی کوشش کی، چنانچہ نیویارک سے شائع ہونے والے معروف و مقبول ہفتہ وار ''اردو ٹائمز'' میں مختلف عنوانات پر ادبی مطالب لکھے، تاکہ شمالی امریکا میں اردو کے شیداؤں کی کسی حد تک تشفی ہو سکے، کیوں کہ سیاسی مطالب تو یہاں مل جاتے ہیں لیکن ادبی مضامین کی کمی اور قلت ہے، بقول بابائے ظرافت جناب ضمیر جعفری: ''ان ملکوں میں اردو کی کتابوں سے زیادہ تعداد میں کتے نظر آتے ہیں۔''

اس مجموعہ سخن میں پچاس مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تمام مضامین ہفتہ وار ''اردو ٹائمز'' میں شائع ہوئے، جنھیں تمام تر شمالی امریکا میں پسند کیا گیا: چوں کہ ان مضامین میں تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مباحث شامل ہیں، جو اردو ادب کے طالب علموں کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے اردو فارم شمالی امریکا کے روح رواں اور ''اردو ٹائمز'' کے مدیر اعلیٰ کی سفارشات پر انھیں بطور گلدستہ سخن: بعنوان ''عروس سخن'' پیش کیا جا رہا ہے۔

میں نے اس مجموعے میں ان مطالب پر روشنی ڈالی ہے، جو اس دور کے

سخنوروں اور سخن دانوں کے لیے باعث امتنان اور اطمینان ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس مجموعے میں یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ کتابت کی غلطیاں بڑی حد تک دور ہو جائیں اور مضامین یک جا ہونے کی وجہ سے تسلسل برقرار رہے اور قاری کے لطف و سرور میں فرق نہ آنے پائے۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو گا کہ ان مضامین میں سے بعض مضمون ''سیاست'' دکن اور ہفتہ وار ''پاکستان لنک'' میں شائع کیے گئے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی

ایم۔ ڈی

حرفِ چند

زیرِ نظر مجموعہ تقی عابدی صاحب کے پچاس تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے: جو نیویارک کے ہفت روزہ ''اردو ٹائمز'' میں بالالتزام شائع ہوتے رہے ہیں- ان میں سے بعض مضامین ''سیاست'' دکن اور ''پاکستان لنک'' لاس اینجلس میں بھی اشاعت پذیر ہوئے تھے- عابدی صاحب چوں کہ نقاد و محقق کے علاوہ خوش گو شاعر بھی ہیں' غالباً اسی لیے انھوں نے اپنی تنقید و تحقیق کو بہت حد تک شعراے قدیم و جدید کی حیات' فن اور کلام تک محدود رکھا ہے-

تقی عابدی صاحب اردو کے علاوہ فارسی میں بھی قدرتِ اظہار رکھتے ہیں- ان کا شمار ان چند گنے چنے فارسی داں اہل علم میں کیا جا سکتا ہے جنھیں قدیم فارسی کے پہلو بہ پہلو جدید فارسی پر بھی قابلِ رشک حد تک دسترس حاصل ہے- حافظ اور بالخصوص خسرو کی اپنے مرشد سے عقیدت' ان کی شاعری اور ان کے کلام کے ترجمے سے متعلق مضامین: عابدی صاحب کی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں- انھوں نے اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب کے علاوہ جدید اردو شاعری کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے' چناں چہ چند ایک ہم عصر شعرا کی شخصیت' شاعری اور کتب سے متعلق تحریروں کے علاوہ اردو شاعری کی آبرو میر' غالب اور انیس کے شاعرانہ مرتبے' اور خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال کی شاعری' شخصیت اور نظریے کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے نہایت بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں- ان میں سے بعض بلا شبہ اقبالیات میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں- عابدی صاحب نے ان مضامین میں عقیدت کو بھی ملحوظ رکھا ہے' لیکن بے لاگ تجزیے اور غیر جانب دارانہ تنقید اور تحقیق کے ساتھ-

''عروسِ سخن'' اپنے متنوع مضامین اور نئی فکری' تحقیقی اور تنقیدی حیات کے سبب اردو تنقید میں یقیناً اضافے کا حکم رکھتا ہے-

محسن بھوپالی

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602.

''عروسِ سخن'' ایک تبصرہ

یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کے تحریر کردہ مختلف مضامین کو ''عروس سخن'' کے نام سے کتابی شکل دی جا چکی ہے اور بہت جلد یہ گراں بہا تصنیف منصۂ شہود پر آ جائے گی۔ انشاء اللہ!

سب سے پہلے اتنا عرض کرتا چلوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے میری پہلی ملاقات' میرے پیارے' میرے جگری دوست مرحوم سید ضمیر جعفری کے توسط سے ہوئی۔ وہ یوں کہ عرصہ ہوا ایک دن میں ضمیر جعفری سے (جن کو مرحوم لکھتے بڑا دکھ ہوتا ہے) فون پر بات کر رہا تھا کہ دورانِ گفتگو ڈاکٹر عابدی کا ذکر آ گیا۔ ضمیر نے مجھے پوچھا کہ میں عابدی سے ملا ہوں' انھیں جانتا ہوں کہ نہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا' تو فرمایا: ''جانی! ملو گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی: بڑا پڑھتو' بڑا قابل' بڑا پیارا بندہ ہے۔'' خدا غریق رحمت کرے! میرے یار کو کہ اس نے ڈاکٹر عابدی کے متعلق جیسا کہا تھا' میں نے ویسا ہی پایا۔

معزز قارئین کو یقیناً تعجب ہو گا کہ آج تک ڈاکٹر عابدی سے میری ملاقات بالمشافہ نہیں ہوئی ہے۔ عجب ستم ظریفی ہے۔ ہم لوگ مصروفیتوں اور مسافتوں کا شکار ہیں۔ اگر کبھی قسمت نے یاوری کی تو میں نے یا پھر ڈاکٹر صاحب نے فون کر لیا: تو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں میرے تمام تر تاثرات کی اساس ڈاکٹر صاحب کی نگارشات کا مطالعہ اور ان کی خوش کلامی ہے۔

معلوم ہوا کہ ''عروسِ سخن'' میں ڈاکٹر عابدی کے تقریباً پچاس مضامین جمع کیے

گئے ہیں، جو پہلے نیویارک کے ہفتہ وار جریدے ''اردو ٹائمز'' میں شائع ہو چکے ہیں- چند مضامین ایسے بھی ہیں جو حیدر آباد دکن کے مشہور اخبار ''سیاست'' اور ''پاکستان لنک'' میں شائع ہوئے تھے- ان مضامین کا: جو ''پاکستان لنک'' میں شائع ہوئے اور ''اردو ٹائمز'' میں مجھے دستیاب ہوئے؛ میں نے بڑی دلچسپی سے اور بغور مطالعہ کیا ہے- مجھے یہ اعتراف، بلکہ یہ اعلان کرنے میں قطعاً نہ تو کوئی تامل ہے، نہ کوئی پس و پیش کہ ڈاکٹر عابدی کو جو عبور فارسی اور اردو زبان و ادب پر حاصل ہے، اس پر وہ جتنا بھی فخر کریں، نازاں ہوں، تو حق بجانب ہے-

اول تو ڈاکٹر عابدی کا انتخاب موضوعات و عنوانات اتنا معیاری اور پایے کا ہوتا ہے، لہذا جس موضوع پر، جس عنوان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں، تو پورا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں- اس پر طرّہ یہ کہ ان کا ادبی تجسس اور جذبہ حقیقت نگاری؛ سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں- عنوانات میں اس قدر تنوع اور کشش ہوتی ہے کہ ہر شعر و ادب کا دلدادہ بغیر محظوظ ہوئے رہ نہیں سکتا- اختصار مدِ نظر ہے ورنہ اس اجمال کی تفصیل کرتا-

''عروسِ سخن'' کی سب سے بڑی خوبی جو مجھے نظر آئی اور جس نے مجھے بے حد متاثر کیا، وہ اس کتاب کی افادیت ہے، یعنی یہ کہ ''عروسِ سخن'' میں بیشتر ایسے تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں، جن میں اتنے سیر حاصل مباحث ملتے ہیں، جو اردو ادب کے طالب علموں کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں؛ استفادے کی اس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی ہے-

عالم یہ ہے کہ اب تک برصغیر ہندو پاکستان کے اکثر بڑے نابغہ روزگار اساتذہ، نثر نگار، نقاد، ادیب؛ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں- مرحومین: آغا بابا اور ضمیر جعفری نے سفر آخرت اختیار کر کے اس دیارِ غیر کو اور بھی ویران کر دیا- اس قحط الرجال میں ڈاکٹر تقی عابدی جیسے عاشقان و فدائیان زبان و شعر و ادب کی شخصیات، مانا کہ معدود چند ہی سہی، ہمارا بیش بہا کلچرل، ثقافتی، تمدنی اور ادبی سرمایہ ہیں- اللہ تعالیٰ انھیں طولِ عمر، صحت و توانائی ارزانی فرمائے، تاکہ ہمارے اہلِ قلم، زبان و ادب کی جی بھر کے، سالہا سال خدمت کر سکیں-

میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کو ان کی مایہ ناز کتاب ''عروسِ سخن'' پر دلی مبارک باد

دیتا ہوں:

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ افق زبان و ادب کا یہ تابندہ ستارہ ایک دن مہر نیم روز بن کر چمکے۔

بریگیڈیئر (ر) علی طباطبائی راز لکھنوی، کیلے فورنیا

☆......☆......☆

''عروسِ سخن''

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے شناسائی' ایک مدت طویل پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا شمار شمالی امریکا کے ان چند سنجیدہ لکھنے والوں میں ہوتا ہے' جو شہرت' نام و نمود یا عظمت و بلند اقبالی کے لیے نہیں لکھتے' بلکہ اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنا ان کی سرشت بھی ہے اور ورثہ بھی۔ تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ لکھنے والا وہی قابلِ مطالعہ ہوتا ہے' جو کم لکھے اور زیادہ پڑھے۔ کیوں کہ اس بات کا ثبوت' کہ لکھنے والے کا مطالعہ کتنا وسیع ہے: اس کی تحریریں فراہم کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریریں بلا شبہ ان کے وسعتِ مطالعہ کی مظہر ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں' پہلے اس کی افادیت اور اہمیت پر اچھی طرح غور کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحریر کردہ مضامین: موضوعیت اور علمیت کا حق ادا کر دیتے ہیں' اور ان کی اثر پذیری دو چند ہو جاتی ہے۔ وہ موضوع کے انتخاب اور اس میں نیا پن یا جدت پیدا کرنے کے فن سے بھی واقف ہیں' چناں چہ ان کی تحریریں اپنے موضوعات کے اعتبار سے بڑی منفرد' متنوع اور اچھوتی ہیں' اور قاری پر فہم و ادراک کے نئے در کھولتی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بعض ظاہراً غیر اہم موضوعات پر اس ہنر مندی سے مضامین تحریر کیے ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد وہ موضوعات بے حد اہم نظر آنے لگتے ہیں' مثلاً: ''علامہ اقبال اور مہاراجا کشن پرشاد'' ''علامہ اقبال کا تصور زمان و مکاں'' ''اقبال کیسے علامہ سے سر ہو گئے'' ''علامہ اقبال کا شاہین'' وغیرہ: اسی طرح بعض ایسے موضوعات پر مضامین تحریر کیے ہیں' جو لکھنے والے عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں: ''سلام بر حسین'' ''اقبال اور عشقِ علی'' ، جمالِ محمد ﷺ اردو اشعار کے آئینے میں'' ، ''اقبال: عاشقِ حسین'' اور'' مرزا غالب کا سلام اور مرثیہ'' وغیرہ۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین کی ایک واضح خاصیت' جو براہِ راست دل پر اثر

کرتی ہے: ان مضامین میں ان کا محققانہ اندازِ فکر ہے۔ وہ تحقیق کی طرف سے تنقید کی طرف آتے ہیں؛ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تحقیق کی راہ سے تنقید کی طرف آتے ہیں؛ تو اس سے مراد یہ ہے کہ تنقید کے سماجی، تاریخی، جمالیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں کے علاوہ وہ سائنس کو بھی جدید تنقید کا ایک حصہ سمجھتے ہیں؛ اور جیسا کہ ایلیٹ نے کہا تھا کہ "ہر زمانہ و عہد اپنا تنقیدی ذوق خود متعین کرتا ہے" تو ضروری ہے کہ جدید تنقید میں دوسرے تمام علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم سے بھی استفادہ کیا جائے؛ چناں چہ آج کے کئی اہم ناقدین اس طرف توجہ بھی دے رہے ہیں؛ خاص طور پر ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنی کتاب "جدید اردو تنقید" میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے گفتگو فرمائی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا سائنسی علوم سے گہرا تعلق ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مختلف موضوعات کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھنے کا سائنسی عمل موجود ہے اور ان تجربات سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں؛ انھیں ادبی پیرائے میں بیان کر دینے کا بھی۔ ان کے تحریر کردہ مضامین کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ ڈاکٹر اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی تشریحات کی ضرورت کے قائل بھی؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو و فارسی کے اہم شعرا، خسروؔ، حافظؔ، میرؔ، انیسؔ، غالبؔ اور دبیرؔ کے فن پر بھی اہم مضامین قلم بند کیے ہیں؛ اور ان شعرا کو نئے انداز سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان مضامین کی اہمیت اور ان کے علمی و ادبی معیار کے علاوہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے چھن کر منظرِ عام پر آئے ہیں؛ جو سادگی، خلوص اور محبت سے لبریز ہے اور جس میں بغض و عناد و تعصب کا شائبہ تک نہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے عقائد میں بھی بڑے محکم ہیں؛ جن سے ان کی فکر طاہر ہو کر مزید روشن ہو گئی ہے اور وہ اس روشنی کو تمام تاریک اذہان میں داخل کر کے انھیں بھی منور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل مستحسن ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طاہر اذہان ہی علوم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑے موضوعات کی اختصار بندی کی اور انھیں عام فہم انداز میں تحریر کیا؛ تاکہ عوام الناس ان مضامین سے استفادہ کر سکیں۔ نیویارک کے

اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کا دائرہ قرات بہت وسیع ہے اور لوگ انھیں بڑی رضا و رغبت سے مطالعہ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی' شمالی امریکا کے ایک ایسے محترم اردو اہل قلم ہیں' جنھیں نثر و نظم : دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے' اور جن کی' اردو زبان و ادب کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کو : یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

عابد جعفری (ٹورنٹو)

صدر رائٹرز فورم

☆.....☆.....☆

امیر خسرو دہلوی

مفتاح السماع، نایک، محمد کاسہ لیس، ترک اللہ، عدیم المثل، طوطی شکر مقال، امیر خسرو کا نام یمین الدین تھا۔ آپ کے والد سیف الدین محمود نے آپ کا نام یمین الدین رکھا اور آپ کے پیر: شیخ مشائخ، محبوب سبحانی حضرت نظام الدین اولیا نے ترک اللہ، محمد کاسہ لیس اور مفتاح السماع کے خطابات اور ناموں سے یاد کیا۔ علاء الدین خلجی شہنشاہ ہندوستان نے موسیقی میں مہارت دیکھ کر ''نایک'' کا خطاب دیا، جو سات سو سال کے بعد بھی کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔ شہنشاہ جلال الدین خلجی نے امیر خسرو کا خطاب دیا جو آگے چل کر یمین الدین کی شناخت بن گیا اور آپ امیر خسرو دہلوی کے نام سے معروف ہوئے۔

ملا شہاب معمائی نے دو مادہ ہائے تاریخ وفات نکالے جو لوحِ مزار پہ کندہ ہیں: شد ''عدیم المثل'' یک تاریخ او = دیگری شد ''طوطی شکر مقال''۔

خاندان خسرو:

امیر خسرو ۱۲۵۳ عیسوی مطابق ۶۵۱ ہجری کو آگرہ کے قصبے پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ ۷۲ سال عمر پائی اور ۱۳۲۵ عیسوی مطابق ۷۲۵ ہجری کو اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کے پائنتی دہلی میں دفن ہوئے۔ تذکرہ ''ریاض الشعرا'' میں والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو، ہندستان کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ ترکستان میں پیدا ہوئے۔ بہرحال، یہ ضعیف روایت ہے اور بقول شبلی نعمانی کہ والہ داغستانی کو کیوں کر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔ امیر خسرو کا تعلق قبیلہ ہزار لاچین سے تھا۔ خسرو کے والد قبیلے کے سردار تھے اور آپ کا تعلق ترکستان کے شہر ''کش'' سے تھا۔ آپ بھائیوں کی نااتفاقی اور لڑائیوں سے تنگ آ کر چند دوستوں کے ہمراہ شہر بلخ کے

قریب مقیم ہو گئے' لیکن کچھ عرصے بعد وہاں سے ہجرت کر کے کابل کے قصبے غور کو اپنا وطن بنایا اور جب چنگیز خان' کابل کی طرف غارت گری کے لیے بڑھا تو تنگ فرار کو فخر قرار پر ترجیح دے کر دہلی آئے اور امراؤں کی صف میں شامل ہو گئے- سیف الدین کے تین بیٹے تھے' جن میں خسرو منجھلے تھے- جب سیف الدین کسی لڑائی میں شہید ہو گئے' تو اس وقت خسرو کی عمر صرف پانچ سال تھی' چناں چہ سلطانِ دہلی نے اس خاندان کی قدر دانی کی اور خسرو کے ساتھ ان کے بھائیوں کو اعزازات اور انعامات عطا کیے- امیر خسرو نے بعد میں باپ کی شہادت پر جو مرثیہ لکھا' اس کا مطلع یہ ہے:

سیف از سرم گذشت و دل من دو نیم شد
دریای من رواں شد و دزم یتیم ماند

یعنی سیف میرے سر سے گذر گئی اور میرا دل دو ٹکڑے ہو گیا' میرا سارا دریا بہ گیا اور میں درِ یتیم کی طرح باقی رہ گیا ہوں-

امیر کے بڑے بھائی علی شاہ تھے' جن کو امیر عزیز الدین کا خطاب دیا گیا' اور آپ کے چھوٹے بھائی احمد شاہ کو امیر حسام الدین کا خطاب عطا ہوا- خسرو کی والدہ' عماد الملک کی بیٹی تھیں' جو امرائے شاہی میں سے تھے- امیر اپنی ماں سے بہت پیار کرتے تھے اور ان کی دوری بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے' چناں چہ اسی لیے اودھ کی ملازمت چھوڑ دی' تاکہ دہلی میں ماں کے پاس رہیں- ایک موقع پر جب ماں نے محبت سے سینے لگایا تو بے اختیارانہ شعر منہ سے نکل گیا' جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے' اسی لیے دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں- جب خسرو کی ماں کا انتقال ہوا' اس وقت خسرو کی عمر ۴۸ سال تھی- اسی سال ۶۹۸ ہجری میں خسرو کے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا؛ چناں چہ ماں اور بھائی کی وفات پر دل سوز مرثیہ لکھا' جس کے چند اشعار یہ ہیں:

امسال دو نور ز اختران رفت
ہم مادرم و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ زبخت خفتہ من
گم شد دو مہ دو ہفتہ من
چوں مادر من بہ زیر خاک است

گر خاک بسر کنم چہ باک است
ہر جای کہ زپای تو غباری ست
ما را ز بہشت یادگاری ست

(ترجمہ) اس سال میرے نصیب کے ستارے سے دو نور چلے گئے' یعنی میری ماں اور بھائی گذر گئے- ایک ہی ہفتے میں' مجھ بد نصیب سے' دو چودھویں کے چاند گم ہو گئے- کیوں کہ میری ماں خاک کے نیچے ہے' اگر میں اپنے سر پر خاک ڈالوں تو عجیب بات نہیں ہے- ماں! جہاں پر بھی تیرے نقش قدم کی خاک ہے' میرے لیے وہ جنت کے برابر اور یادگار ہے-

خسرو اور سلاطین :

خسرو نے گیارہ حکمرانوں کی ملازمت کی' جن میں سات سلطان اور شہنشاہ شامل تھے- انھی ملازمتوں اور مصاحبتوں کی وجہ سے دہلی' آگرہ' اودھ' ملتان اور بنگال میں مقیم ہوئے- گردشِ ایام ایسا بھی سر پر آیا کہ دو سال بلخ میں اسیر رہے- امراؤں اور شہنشاہوں کی نوکری اور ان کے درباروں میں دن رات حاضری سے متاثر ہو کر مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' کے خاتمے میں لکھتے ہیں:

شب تا سحر و ز صبح تا شام
در گوشہ غم نہ گیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود داری
پیش چو خودی ستادہ برپای

یعنی شب سے سحر اور صبح سے شام تک مجھے کسی گوشے میں آرام نہیں ملتا- اپنی نفس پروری کی وجہ سے' اپنے ہی جیسے کے آگے' صبح سے شام تک کھڑا ہوں-

چناں چہ اسی لیے ان تمام دنیاوی چیزوں کو ٹھکرا کر اپنے نام کو' جس سے سلطانی کی بو آتی تھی' بدل کر محمد کاسہ لیس یا محمد کا کٹورا چاٹنے والا بن کر سلطان مشائخ کی خانقاہ میں زندگی اور بندگی کا مزا لوٹا اور حضرت نظام الدین اولیا کے دل میں وہ مقام پیدا کیا کہ آپ نے فرمایا: اگر خدا روزِ قیامت مجھ سے پوچھے گا کہ نظام الدین ہمارے دربار میں کیا لایا ہے' تو میں خسرو کو پیش کر دوں گا- امیر خسرو نے پہلے دو سال امیر کشلو خان معروف بہ چھجو خان کی ملازمت کی' پھر سلطان غیاث الدین بلبن کے چھوٹے بیٹے

بغرا خان اور بڑے بیٹے محمد قآن کی بنگال اور ملتان میں نوکری کی- محمد قآن' جو خان شہید کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے : بڑا قابل شخص تھا اور خسرو کی بڑی قدر کرتا تھا- خسرو نے تقریبا پانچ سال اس کی ملازمت کی اور اس کے مرنے پر بڑا دل سوز مرثیہ لکھا- خسرو پھر کیقباد' جو سلطان غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا' اور پھر اس کے بیٹے کے دربار سے منسلک ہوئے- بلبن خاندان کے خاتمے پر سلطان جلال الدین خلجی کے ندیم ہوئے- اس سلطان نے خسرو کی قدر دانی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی- امیر کا خطاب' معقول مشاہرہ درباری لباس اور شاہی کمر بند : اسی کی عطا تھی- اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے نائک کا خطاب دیا' ایک ہزار تنکہ سالانہ مشاہرہ دیا- خسرو نے علاء الدین کے بعد شہاب الدین اور پھر قطب الدین خلجی کی درباری کی' جس نے خسرو کی تالیف مثنوی ''نہ سپہر'' پر ہاتھی تول کر روپے دیے- خلجی خاندان کے خاتمے پر خسرو' سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار سے وابستہ ہوئے اور ''تغلق نامہ'' لکھا- تغلق آباد کا قلعہ اسی بادشاہ کی یادگار ہے- سلطان کیقباد کی خواہش پر خسرو نے چھ مہینوں میں ''قران السعدین'' لکھی' جس میں باپ اور بیٹے کے مراسلات اور معاملات کا تفصیلی ذکر ہے- خسرو کی عمر اس وقت ۳۶ سال تھی- جلال الدین خلجی کی فتوحات کو نظم کر کے ''تاج الفتوح'' نام دیا- علاء الدین خلجی کی فتوحات کو منظوم کیا اور ''خزاین الفتوح'' نام رکھا-

ان تمام مصروفیات کے باوجود' جن میں دربار اور خانقاہ شامل تھے : یہ جان کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ امیر خسرو نے چار پانچ لاکھ بیت لکھے اور ۹۲ سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور موسیقی میں کئی نئی راگیں ایجاد کیں' اور نائک کا خطاب حاصل کیا- امیر خسرو نے ''غرۃ الکمال'' میں لکھا ہے کہ میرے رباعیات کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم ہے- اوحدی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کا جتنا کلام فارسی میں ہے' اس سے زیادہ ہندی بھاشا (ابتدائی اردو) میں ہے' لیکن متاسفانہ ! آج یہ کلام ہمارے درمیان موجود نہیں ہے- شبلی نے ابیات کے لفظ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قدما کے محاورے میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں' چناں چہ یہاں چار پانچ لاکھ سے مراد اشعار اور نثری سطریں ہیں-

☆......☆......☆

''لسانُ الغیب خواجہ حافظؔ شیرازی''

آج سے چار سو سال قبل' تذکرہ ''میخانہ'' کے مولف ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی نے خواجہ شمس الدین محمد تخلص حافظ کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ''عندلیب دلفریب' انجمن سخنوری' بلبل داستانسری' چمن نکتہ پروری' قطب مرکز فصاحت و بلاغت' مقبول طبیعت' اصحاب ارادت' طوطی بوستان سخن پردازی' لسان الغیب' ترجمان اسرار خواجہ حافظ شیرازی قدس سرہٗ۔''

شمس الدین محمد حافظؔ شیرازی کا شمار' ایران کے چار عظیم شعرا' جنہیں عناصر اربعہ سخن بھی کہتے ہیں' کیا جاتا ہے۔ ان اربعہ سخن میں فردوسیؔ رزمیہ کا عظیم شاعر' جس کا ''شاہنامہ'' زندہ شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ دوسرا شاعر عمر خیام' رباعیات کا خدائے سخن ہے چنانچہ رباعیات خیام سے انکار محال ہے۔ تیسرا عظیم شاعر سعدی جس کی ''بوستان'' و ''گلستان'' کی خوشبو سے کون آشنا نہیں۔ چوتھا حافظؔ جس کے دیوان نے تمام شاعروں کے مجموعہ کلام سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ''شعر العجم'' میں شبلی نعمانی نے بہت سچ کہا ہے کہ خواجہ حافظ کے بہت کم حالات ہم تک پہنچ سکے' جو بڑے افسوس اور تعجب کی بات ہے۔ حافظ کا پہلا تذکرہ' جو آپ کے مرنے کے تقریباً ایک سو سال بعد لکھا گیا ہے وہ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ہے۔ آپ کا دوسرا تذکرہ ''تذکرہ میخانہ'' ہے' جسے ملا عبدالنبی قزوینی نے جہانگیر کے عہد میں ۱۰۳۶ ہجری میں مرتب کیا۔ اس کے علاوہ ''تاریخ فرشتہ'' خواند مری کی ''حبیب السیر' جامی کی'' ''بہارستان'' خان آرزو کی ''مجمع النفائس'' لطف علی بیگ کی ''آتشکدہ'' ہدایت قلی خان کی ''مجمع الفصحا'' اور ''ریاض العارفین'' میں بھی کچھ کچھ مطالب موجود ہیں' جن سے انیسویں صدی کے مورخین: اوسلے Ousley' ایڈورڈ براؤن Edward Brown اور شبلی نعمانی نے استفادہ کیا ہے' لیکن اغلب کتابوں اور تذکروں میں واقعات یکساں ہیں۔

حافظؔ ۱۳۲۶ء میں شیراز میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۱ء میں شیراز ہی میں دفن

ہوئے- آپ نے ۶۵ سال عمر پائی- حافظ کے دادا اصفہان سے شیراز آئے- آپ کے والد نے شیراز میں تجارت کی' لیکن جوانی ہی میں انتقال کر گئے' اور تین بیٹے یادگار چھوڑے- حافظ سب سے چھوٹے فرزند تھے- حافظ نان بائی کی دکان پر آٹا گوندھتے تھے اور اس سے جو آمدنی ہوتی' اس کا ایک تہائی اپنی ماں کو ایک تہائی معلّم کو' جو ان کو قرآنی تعلیم دیتا' اور باقی' جو اپنی ضروریات سے باقی رہتا' غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے- اس زمانے میں شاعری کا بڑا چرچا تھا' چنانچہ حافظ نے پہلے بے تکے شعر کہنا شروع کیے' تو شہر میں ان کی لغو گوئی کی شہرت ہو گئی- لوگ ان کا مذاق اڑانے لگے- دو سال تک تقریباً یہی حالت رہی' چنانچہ جب لوگوں کا طنز و مذاق حد سے بڑھ گیا' تو حافظ رنجیدہ ہوئے اور شیراز میں بابا کوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے- خواب میں حضرت علیؑ کو دیکھا جنھوں نے ایک لقمہ کھلایا اور کہا کہ جا! اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے- خواب سے جاگے تو یہ غزل لکھی

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندران ظلمت شب' آب حیاتم دادند

یعنی کل رات وقت سحر مجھے غصہ و رنج سے نجات دی گئی- اسی تاریک رات میں مجھے آب حیات دیا گیا-

جب حسب معمول لوگوں کے سامنے اشعار پڑھے' تو لوگوں نے سمجھا کہ کسی سے غزل لکھوائی ہے' چنانچہ امتحان کے لیے مصرع طرح دیا گیا' تو پھر حافظ نے عمدہ غزل لکھی' اور اس طرح حافظ کا چرچا گھر گھر ہونے لگا-

حافظ نے ساری عمر شیراز رکن آباد کے ارد گرد گزار دی- صرف تین بار مختصر مدت کے لیے شیراز کے باہر گئے' جن میں ہرمز' یزد اور اصفہان شامل ہیں- جنوبی ہند دکن سے سلطان محمود بہمنی نے دعوت دی' مگر نہ جا سکے اور غزل لکھ کر بھیج دی:

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد
بے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

یعنی ایک لمحہ غم میں زندگی بسر کرنے کے بدلے' تمام دنیا حاصل کرنا بے سود ہے- اگر ہماری پوشاک کو فروخت کر کے شراب حاصل کی جائے' تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے-

بنگال سے سلطان غیاث الدین نے دعوت دی تو جواب میں غزل بھیج دی۔

شکر شکن شوند ' ہمہ طوطیان ہند
زین قند فارسی کہ بہ بنگالہ میرود

یعنی تمام طوطیانِ ہندوستان شکر خوار ہو گئے ہیں' کیوں کہ فارس کی شکر بنگال جا رہی ہے۔

بغداد کے سلطان احمد شیخ اویس نے' جو خود شاعر اور قابل بادشاہ تھا : دعوت دی تو غزل لکھ کر بھیج دی :

نمی دھند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلی و آب رکناباد

مجھے سیر و سیاحت کی اجازت نہیں ملتی' نسیم مصلی اور رکناباد کے پانی سے' لیکن کبھی شیراز کی ناقدری پر بھی گلہ کرتے نظر آتے ہیں :

رہ نبردیم بہ مقصود خود اندر شیراز
خرم آن روز کہ حافظ رہ بغداد کند

خواجہ حافظ نے کئی سلاطین کا دور دیکھا۔ پہلے ابو اسحٰق انجو کے ساتھ رہے۔ یہ بادشاہ خود شاعر اور علم دوست تھا اور حافظ کی بڑی قدر کرتا تھا۔ فوجیں فصیل کے نیچے کھڑی تھیں اور بادشاہ عیش و نوش اور بزم آرائی میں مگن تھا۔ جب کسی نے دشمن کی فوجوں کی اطلاع دی تو کہا:

بیا تا یک امشب تماشا کنیم
چوں فردا شود فکر فردا کنیم

یعنی آؤ! آج کی رات تماشا کریں' اور اگر کل آئے گی' تو پھر کل ہی اس کی فکر کریں۔

چنانچہ یہ بادشاہ اسی معرکہ آرائی میں قتل کر دیا گیا۔ حافظ اس کے بعد مبارزالدین محمد کی حکومت سے منسلک ہوئے' پھر شاہ شجاع برسر تخت و تاج آیا اور حافظ اس کے ہم رکاب ہوئے۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا زین العابدین تخت نشین ہوا۔ آخر میں شیراز پر تیمور کے حملے شروع ہوئے اور خاندان آلِ مظفر کا خاتمہ ہو گیا۔

حافظ کے اہل و عیال کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ان کی بیوی کا نام شاخِ نبات' یعنی مصری کی ڈلی تھا' جس کا ان کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا۔ حافظ

کے دو بیٹے تھے: ایک کا نام شاہ نعمان تھا' جس نے سفر ہندستان میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا جس کا مزار قلعہ برہان پور میں ہے؛ حافظؔ کا دوسرا لڑکا شیراز ہی میں انتقال کر گیا' چنانچہ حافظؔ نے اس کی موت پر مرثیے کے اشعار بھی کہے ہیں- حافظؔ کی زندگی میں ہی ان کے اشعار کو قبول عام کا درجہ حاصل ہو گیا تھا' چنانچہ خود کہتے ہیں:

ز شعرِ حافظؔ می گوید و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

یعنی حافظؔ شیرازی کے اشعار پڑھتے ہیں اور رقص کرتے ہیں' کالی آنکھوں والے کشمیری اور گورے سمرقند کے ترک لوگ- اسی لیے تو حافظؔ نے کہا تھا:

عراق و فارس گرفتی بہ شعرِ خود' حافظؔ!
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

عراق اور ایران تو' حافظؔ! تو نے اپنے اشعار سے فتح کر لیا' اب آ کہ تبریز اور بغداد تیرے منتظر ہیں- گوئٹے' جو مشہور اور مشکل خیال غزل کا شاعر تھا؛ حافظؔ کا دلدادہ تھا' اور حافظؔ کے دیوان سے متاثر ہو کر اس نے اپنا دیوان تدوین کیا- حافظؔ کا دیوان' ان کی زندگی میں مرتب نہ ہو سکا- قیوم الدین عبداللہ نے کئی بار اصرار کیا کہ ان قیمتی موتیوں اور جواہرات کو ایک رشتے میں پرونا چاہیے' تاکہ یہ قیمتی مالا وقت کی دلھن کی گردن کی رونق بنا رہے' لیکن حافظؔ نے ہم عصروں کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے' کبھی دیوان مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی- محمد گل اندام نے حافظؔ کا دیوان مرتب کیا اور دیوان وقت پر مرتب نہ ہونے اور حافظؔ کی عدم فرصتی کی مختلف وجوہات بتلائیں-

۱- حافظؔ کی' حفظِ قرآن اور تعلیمات قرآنی سے وابستگی-
۲- حافظؔ کی' کاروبارِ سلطنت میں شرکت-
۳- حافظؔ کا' آٹھ پہر اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ' جن میں زمخشری کی تفسیر قرآن ''کشاف'' ، عربی گرامر ''مصباح'' اور ''مفتاح العلوم'' قابلِ ذکر ہیں- چنانچہ انھی وجوہات نے حافظؔ کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اپنا دیوان مرتب کر کے منظر عام پر لا سکیں-

شہزادہ ابو الفتح فریدون نے ۹۱۵ ہجری میں جو دیوان ترتیب دیا' اس میں یہ رباعی لکھی:

ایں گنج معانی، کہ تہی از عیب است
نقشے کہ از صحیفۂ لاریب است
مشہور جہاں بہ فیض روح القدس است
مذکور زبان ما بہ لسان الغیب است

یعنی یہ معانی کا خزانہ جو عیب سے خالی ہے، یہ صحیفۂ لاریب کا نقش ہے اور اس کی شہرت روح القدس کے فیض سے ہوئی اور اسے ہم اپنی رائج زبان میں زبان غیب کہتے ہیں۔

دیوان حافظ میں تقریباً ۵۰۰۷ اشعار موجود ہیں۔ اس میں ۵۹۳ غزلیات، ۹۷ رباعیات، ۳۰ قطعات، ۲۸ مفرد اشعار، ۵ قصیدے، ۴ ساقی نامے اور ایک ایک مخمس، مسدس، مثنوی، ترکیب اور ترجیع بند نظر آتے ہیں۔

ایک اور خاص بات، جو دیوان حافظ سے نسبت رکھتی ہے، وہ فالنامہ ہے، جو ایک خاص طریقے سے نکالا جاتا ہے، جس میں غزل کا ایک شعر نکلتا ہے، جس کے معنی سے فال کو سمجھا جاتا ہے۔ اس فالنامے کے بارے میں کئی داستانیں موجود ہیں، جو ہمارے اس مضمون کے بیان سے خارج ہیں۔

فضائل و شمائلِ محمد ﷺ کی جھلک

اردو اشعار کے آئینے میں

نعت گوئی میں جن موضوعات کو سرمایۂ سخن بنایا گیا ہے' ان میں شاعر کی عجز و انکساری' قرآن میں حضور ﷺ کی توصیف نگاری سرکارِ دو عالم کا اسوۂ حسنہ' آپ کے جمال و کمال' فضائل و شمائل کے ذکر کے علاوہ خواہش دیدار مدینہ دعا کی دست گاری اور شفاعت وغیرہ شامل ہیں- نعت گوئی کا سب سے اہم اور مشکل موضوع سرور کائنات کے فضائل و شمائل اور کمالات کا بیان کرنا ہے- عرفی شیرازی اور دوسرے نعت گو اکابرین نے اسی موضوع کی وجہ سے نعت کے راستے کو تلوار سے زیادہ تیز راستہ کہا ہے' کیوں کہ یہ اس بندۂ خالص کا ذکر ہے' جس کو خود خدا نے رفعت بخشی- یہ وہ بندۂ کامل ہے' جو نفس مطمئنہ کہلایا- یہ وہ بندۂ واحد ہے' جو صاحب معراج ہوا' اور یہی بندہ: حبیب خدا' خیر الوریٰ' خاتم الانبیا' اشرف الانبیا' یٰسین و طاہا' رحمت اللعالمین' سید المومنین' شفیع المذنبین' بشیر' نذیر' سراج منیر' شافع محشر' ساقی کوثر' طاہر' اطہر' مزمل و مدثر قرار پایا اور اسی لیے تو خدا نے اور فرشتوں نے اس محبوب سبحانی پر سلام بھیجا اور مومنین کو بھی اس کی تاکید کی- یہ صحیح ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے پیکر نوری کا سایا نہیں تھا' لیکن آپ کا سایۂ رحمت' تمام جہانوں پر چھایا ہوا تھا اور آپ کے فضائل و شمائل' تمام کائنات کا حصار کیے ہوئے تھے- عربی اور فارسی کی نعتوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقریباً تمام نعت نگاروں نے حضور ﷺ کے فضائل و شمائل کے موضوع پر اشعار رقم کیے اور اس کی نسبت' دوسرے موضوعات پر کم تر توجہ کی' جو ان کے ماحول اور تہذیب کا نتیجہ تھا- بہر حال' جو شخص خود مکہ یا مدینہ کا باشندہ ہو' اس کے لیے دیار محمد ﷺ کے دیدار میں آنسو بہانا کیا معنی رکھے گا- ہندوستانی مہذب ماحول جو اب برصغیر کہلاتا ہے' دیار محمد ﷺ کے دیدار کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کے سراپا کو نظم کرنے میں بڑی ترقی کی اور اس زمین میں بڑی رنگین

گل کاری کی مگر جہاں تک فضل و کمال و خصال محمد ﷺ کا تعلق رہا' عربی' فارسی اور اردو کی نعتیں تقریباً ایک سبک پر ہیں کیوں کہ اس موضوع میں قرآن مجید کی نعت گوئی اور شریعت کی حدود کا خاص خیال رکھا گیا- نعت' اردو شاعری کی وہ صنف ہے' جس میں عربی کے الفاظ سب سے زیادہ استعمال ہوئے ہیں- بعض مقامات پر تو آیات اور حدیث کے جملے' اپنے پورے حسن و جمال سے نظم کیے گئے ہیں- بقول علامہ اقبال

لوح بھی تو' قلم بھی تو' تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ، رنگ' ترے محیط میں حباب
نگاہ عشق و مستی میں' وہی اول' وہی آخر
وہی قرآں' وہی فرقاں' وہی یٰسین' وہی طاھا

دکنی نعتیں گواہ ہیں کہ فضائل و شمائل میں اردو نعت نے عربی اور فارسی نعتوں کی تقلید کی' اور اس کا اثر آج بھی بڑی حد تک باقی ہے- آج سے چار سو سال قبل' دکنی شاعر صنعتی نے اپنی نعت میں کہا تھا:

نبی کریم' شفیع امین
رسول خدا رحمت العالمین
ثناء جس کی' بولیا سبحان ہے
سو' طاھا و یٰسین و قرآن ہے
قاد حی علی عبدہ کا شرف
بزاں حق نے نازل کیا کج طرف

تقریباً ۳۵۰ سال قبل ولی دکنی نے لکھا:

لامکاں' پر بنا احمد' جو بنا بھلایا
تب ملائک نے' وہیں' صلو علیکم گایا
یٰسین و طاھا والضحیٰ' نازل ہوئے' تج شان میں
واللیل اور والشمس ہے کچھ' زلف و مکھ کے دھیان میں
معانی قل ھو اللہ احد کے' ہیں یہاں' ناتخ!
برائے قافیہ' رکھا ہے میں نے' میم احمد کا

(ناسخ)

وہ مزمل، وہ مدثر، وہ طاہا اور یسین
پکارا نام کس کس طرح سے پیارا محمدؐ کا

(یزدانی)

عنوان کرم کے در منثور
قرآن شریف کے سورۂ نور
ہے جس کی شگفتہ رنگ تقریر
ینطق من ہوی کی تفسیر
ورفعنا لک ذکرک پہ تصدق
سب اونچوں سے اونچی ہے شوکت تری

(حسن بریلوی)

ہے جسم محمدؐ سراج منیر
کہ ہے شان میں جس کے ذکرا کثیر
جو منظور خالق ہوئی رہنمائی
محمدؐ کو بھیجا بشیرا نذیر

(اکبر میرٹھی)

اردو نعت گویوں نے نہ صرف الفاظ و معانی و آیات قرآنی سے استفادہ کیا بلکہ قرآن کو فضائل محمد ﷺ کا استعارہ قرار دے کر لفظ ''قرآن'' اور کلام پاک سے فائدہ اٹھایا اور نئے نئے مضامین پیدا کیے:

مصحف کو نہ کیوں فخر ہو اس صورت پر
قرآن سے پہلے یہ کتاب آئی ہے

(دبیر)

خداوند دو عالم ہے ترا مداح قرآں میں
تری تعریف لکھنے کی کہاں طاقت ہے انساں میں
داب لی ہے منہ میں اپنے صورت غنچہ زباں
ہم نے قرآں میں ترے وصف و ثنا کو دیکھ کر

(یزدانی)

کہ کلام مجید نے کھائی شاہا
تیرے شہرہ و کلام و بقا کی قسم
(رضا بریلوی)

خدا ان کی تعریف خود کر رہا ہے
نہیں نعت کہنے میں محمود تنہا
(راجا رشید محمود)

نٓ و قلم سے یٰسین ہے توقیر قلم
جز خدا نام تیرے کیسے کرے کوئی رقم
(غلام رسول)

اگرچہ شاعر کی بے بضاعتی عجز و انکساری خود ایک مستقل موضوع ہے لیکن اس کو حضورؐ کے فضائل و شمائل سے بھی جدا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ عجز بیانی کی وجہ حضور ﷺ کی بلند و برتر ذات گرامی ہی ہے یعنی لامحدود فضائل کو محدود لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں اشعار ملاحظہ کیجئے:

محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں
ہوا ہے نہ ایسا نہ ہو گا کہیں
کہوں اس کے رتبہ کا کیا میں بیاں
کھڑے ہوں جہاں باندھ صف مرسلاں
(میر حسن)

مدح سرکار ہے کس کے امکان میں
آپؐ کی مدحتیں تو ہیں قرآن میں
حمد کے حرف لکھوں کہ میں نعت کے
ہوں بڑی احتیاطوں کے میدان میں
اس کو کہتے ہیں تکمیل انسانیت
ساری اچھائیاں ایک انسان میں
وہ مجسم شریف سراپا یقین

بولتی آیتیں، شکل انسان میں
(محشر بدایونی)

اے زہے تقدیر! یہ نکلا محمدؐ کا مقام
کوئی انساں و خدا کے درمیاں، درکار تھا
(احسان دانش)

ہماری عقل کہاں، رتبہ رسولؐ کہاں
کمال عشق سے ممکن ہے جستجوے رسول
(ہاشم رضا)

پہنچا نہ کوئی تیرے مقام بلند تک
موسیٰ ز ہوش رفت، بیک جلوہ صفات
جھکتا ہے تکبر، تری دہلیز پہ آ کر
ہر شاہ، تری راہ میں اک خاک نشیں ہے
(سالک)

خاتم الانبیا، اشرف المرسلین کو دوسرے نبیوں سے نسبت دے کر ان کی قدر و منزلت کو ظاہر کرنے کا مضمون قدیم ہے، اگرچہ بعض شعرا نے اس زمین میں تقابل کر کے دوسرے انبیاؤں کے رتبے کو گھٹانے کی کوشش کی ہے جو غلط ہے، لیکن بہرحال سردار کو سردار کہنا سزاوار ہے اور کہنے والا سزا کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں کچھ اشعار دیکھیے:

نبی کون، یعنی رسولؐ کریم
نبوت کے دریا کا درِ یتیم
(میر حسن)

اے سرورؐ دو کون، شہنشاہ ذوالکرم
سرخیل مرسلین و شفاعت گرام
صدقے زمیں کے ہوتا نہ، پھر کیسے، آسماں
رکھتا نہ سر زمین پہ اگر اپنا تو قدم
(دبیر)

اول بعثت میں ختم الانبیا، پایا لقب

رتبہ حاصل' ابتدا میں' انتہا کا ہو گیا
انبیا کو تھی امام انبیا کی آرزو
کارواں کو اک امیر کارواں درکار تھا
سارے نبیوں کا وہ سرتاج و فخر آدم
جس کا رحمت ہے لقب سرورؐ ہر دو عالم
(رسول ازہر)

میرے حبیبؐ حبیب خداؐ سراج منیر
تو ہی بشارت عیسیٰؑ تو ہی دعائے خلیلؑ
(کامل القادری)

صاحب معراج ہونے کا شرف' بجز حضورؐ اور کسی احد کو حاصل نہیں ہوا' اس لیے شعرا نے اس فضیلت کو' مختلف اچھوتے مضامین کے ساتھ رقم کیا:

معراج نبیؐ میں جائے تشکیک نہیں
ہے نور کا تڑکا' شب تاریک نہیں
قوسین کے قرب سے' یہ صادق ہے
اتنا کوئی اللہ کے نزدیک نہیں
(دبیر)

عالم ناسوت میں اور عالم لاہوت میں
کوندتی ہے ہر طرف' برق جمال مصطفیٰ
(اصغر گونڈوی)

معراج میں وہ قرب تھا' حق کی جناب میں
ناز و نیاز ایک تھے اوئی حجاب میں
(ابراہیم آزاد)

زمیں سے تافلک' جس کو جرات پرواز
وہ میر قافلہ' وہ رہبر یگانہ ملا
(حفیظ ہوشیار پوری)

ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا

حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ میں آپ کے کردار، گفتار، رفتار، خلق عظیم، محبت اور شفقت کے واقعات فرواں تاریخوں میں ملتے ہیں، جن کو پیش نظر رکھ کر نعت گویوں، جن میں غیر مسلم شعرا بھی شامل ہیں، آپ کو انسان کامل، نفس مطمئنہ اور عظیم الشان رہبر دنیا و آخرت بتلایا ہے۔ ہم مضمون کے اختصار کی وجہ سے صرف چند اشعار مشتے از نمونہ خروار لے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، غریبوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
(حالی)

نام اسی کا باب کرم ہے، دیکھ یہی تو محراب حرم ہے
دیکھ خم ابروے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(بیدم)

نظارہ فروزی کی عجب شان ہے پیدا
یہ شکل و شمائل، یہ عبائیں یہ قبائیں
(حسرت موہانی)

درخشانی نے تری، قطروں کو دریا کر دیا
دل کو دریا کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا
ہیں رحمت، آپ سارے جہانوں کے واسطے
آئے ہیں آپ سارے زمانوں کے واسطے
(کامل القادری)

لوگ کہتے ہیں، کہ سایا تیرے پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں: جہاں بھر پر ہے سایا تیرا

(احمد قاسمی)

محمدؐ عربیؐ التفات کا پیکر
محمدؐ عربیؐ کائنات کا محور
محمدؐ عربیؐ افتخار لوح و قلم
محمدؐ عربیؐ افتخار جن و بشر
ہر ایک دل، ہے فدائے شمائل حضرت
ہر اک نظر، ہے طلب گار خواجۂ لولاک

(حفیظ تائب)

تمدن کو شائستگی، تو نے بخشی
محبت، کرم، دوستی، نام تیرا
عدالت، امانت، قناعت میں یکتا
حیات، آشتی، راستی، نام تیرا

(ضمیر جعفری)

وہ سر تا پا فضائل ہیں، وہ بے مثل و یگانہ ہیں
شجاعت میں، بسالت میں، مروت میں، سخاوت میں
دو جہاں میں عدیم المثال، آپؐ ہیں
صاحب خلق ہیں، خوش خصال آپؐ ہیں
لا جرم آپؐ کی ذات خیرؐ البشر
آدمیت کا اوج کمال آپؐ ہیں

(ضمیر جعفری)

ساقی بلبل کے اوصاف جب پڑھے
محفل تمام، مست ہے بے خودی ہوئی

(ابوالکلام آزاد)

ہو گئیں منسوخ، سب توراتؐ انجیل و زبور
اہل دنیا پر، ہوا نازل جو قرآن، آپؐ کا
چمکا ہے، تری ذات سے، انساں کا مقدر

تو خاتم دوراں کا درخشندہ نگیں ہے
(صوفی تبسم)

اس امت عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا!
نازک ہے بہت غیرت سلطان مدینہ
(جگر مراد آبادی)

ترے قدم پہ جبیں سا روم و عجم کی نخوتیں
ترے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خود سری
(جوش)

میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے
(فراز)

بشیر کہیے نذیر کہیے انہیں سراج منیر کہیے
جو سر بسر ہے کلام ربی وہ مرے آقا کی زندگی ہے

☆......☆......☆

اقبال اور عشقِ علی علیہ السلام

کسی بھی شاعر کا کلام اس کی فکر و تخیل، علم و دانش اور شعریت کا آئینہ ہوتا ہے یعنی شعر بڑی حد تک شاعر کی شخصیت کی تفسیر اور اس کے جذبات کی تصویر ہوتا ہے۔ انھی نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال کے کلام میں عشق حضرت علی کی قدروں کے مطالبے سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ علامہ سچے محب اور حقیقی عاشق علی تھے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے قرآنی تفاسیر کے ساتھ ساتھ احادیث نبوی ﷺ اور تاریخ اسلامی کا بہ تحقیق مطالعہ کیا، اور انھی گراں قدر علوم کے ذریعے راہ حق دریافت کیا چناں چہ علامہ نے ابتدائی دینی تعلیم مولوی میر حسن صاحب سے حاصل کی، جو آپ کے عربی اور فارسی کے استاد بھی رہے، پھر اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لیے اسلامیات کے ساتھ ساتھ فارسی کے عظیم شعراء کے کلام سے مستفید ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں علامہ حضور سرور مرتبت سے والہانہ محبت رکھتے تھے، وہاں پر بے پناہ عشق حضرت علی کی ذات سے بھی کرتے تھے، کیوں کہ وہ اچھی طرح یہ جانتے تھے کہ حضرت علی نے نصرت و حفاظت اور محبت رسول ﷺ پر اپنی زندگی کے ہر لمحے کو قربان کر دیا تھا۔ خود فرماتے ہیں:

ہیچ کس رازی کہ من گویم نگفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت

(کسی نے بھی میری طرح گراں قدر راز و رموز بیان نہیں کیے اور کسی فکر نے میری طرح معنوی موتی نہیں پروئے۔)

اس خصوصی تحریر میں تمام تر کوششیں یہی کی گئی ہیں کہ اقبال اور عشق علی کا موضوع، انھی کے کلام کے ذریعے روشن ہو سکے، تاکہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ اقبالیات میں اسلام کا مرکز اور ایمان کا محور عشق محمدؐ اور عشق علی ہی تھا۔ اگرچہ صد ہا اشعار اردو اور فارسی ''کلیات اقبال'' میں موجود ہیں، لیکن مضمون کے عنوان اور انحصار کو

پیش نظر رکھتے ہوئے صرف چند اشعار، جو حضرت علی کی ذات گرامی سے وابستہ ہیں، پیش کیے گئے ہیں۔

علامہ اقبال نے فارسی ''مثنوی اسرار خودی'' میں ایک ۱۰۵ اشعار کی نظم، حضرت علی کے ناموں کے اسرار کی تشریح کے عنوان کے تحت لکھ کر حضرت علی کے بارہ سے زیادہ نام، کنیات، خطابات اور القاب کی تشریح بڑے دلکش انداز میں کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے فرمایا:

ہر کہ دانائے رموز زندگی ہست
سر اسمائے علی داند کہ چیست

(اس شخص نے زندگی کے تمام رازوں کو پہچان لیا ہے جس نے حضرت علی کے ناموں کے اسباب اور رازوں کو جان لیا)

مسلم اول شہ مردان علی
عشق را سرمایہء ایمان علی

اس شعر میں علامہ اقبال نے حضرت علی کی تین بڑی فضیلتیں، جو دیگر مسلمانوں کو میسر نہ ہو سکیں، بیان کی ہیں: پہلی فضیلت کہ حضرت علی سب سے پہلے مسلمان تھے۔ ابو حازم اور زید بن ارقم سے مروی ہے کہ ''علی اول من اسلم'' یعنی علی نے سب سے پہلے دعوت اسلام پر لبیک کہا۔ حضرت علی کی دوسری فضیلت کہ وہ مردوں کے شاہ قرار پائے، چناں چہ تاریخیں گواہ ہیں کہ بدر، احد، خندق، خیبر اور دیگر غزوات میں آپ ہی کی شجاعت نے اسلام کی لاج رکھ لی اور آپ کی تلوار ذوالفقار ہی نے، جو فلک سے آپ پر اتری تھی: دشمنان اسلام کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تیسری فضیلت حضرت علی کی محبت ہے، جو ایمان کا اساس اور سرمایہ رہی، کیوں کہ آپ نے ہمیشہ حضور اکرم ﷺ کے پسینے پر اپنا خون بہانا پسند کیا اور شب ہجرت بستر رسول ﷺ پر سو کر پیغمبر ﷺ کی جان بچائی اور اس طرح اپنا نفس خوشنودی خدا میں فروخت کر کے ہدایت خدا حاصل کی۔ اس پر آپ فرماتے ہیں:

مرسلؐ حق کرد نامش بو تراب
حق ید اللہ خواند درام الکتاب
مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن ست

بوتراب از فتح اقلیم تن است

حضرت رسول کریم ﷺ نے علی کو بوتراب ''مٹی کا باپ'' کی کنیت سے سرفراز فرمایا- حضرت علی اس لیے ابوتراب ہوئے کہ آپ اپنے سفالی بدن کی خواہشات' نفس امارہ پر مکمل قابو کر کے ''نفس مطمئنہ'' ہو گئے تھے- علامہ فرماتے ہیں: خداوند عالم نے حضرت علی کو سورہ الفتح میں ''ید اللہ'' خدا کا ہاتھ قرار دیا' کہ آپ نے اپنی رضا اور مرضی کو رضائے خدا کے سپرد کر دیا تھا- آپ مرتضیٰ' یعنی ''منتخب و پسندیدہ'' اس لیے ہیں کہ آپ کی تلوار اور آپ کے جہاد نے باطل کو مٹا کر حق کا بول بالا کیا:

زیرپاش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

(حضرت علی نے دنیا میں فاتح خیبر ہونے کا شرف پایا' تو دوسری طرف عرش پر کوثر کو تقسیم کرنے والے کی فضیلت سے ہم کنار ہوں گے-)

ذات او دروازۂ شہر علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم
مرد کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خود داری است

علامہ ''مشہور حدیث پیغمبر ﷺ ''انا مدینۃ علم وعلی بابھا'' یعنی میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں' کی طرف اشارہ کر رہے ہیں- حضرت علی کے خطاب ''کرار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کو اس وقت تک کامیابی اور فتح حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ آور نہ ہو' جس طرح سے علی نے علم حاصل کر کے قلعہ خیبر فتح کر لیا تھا- علامہ فرماتے ہیں:

ہر کہ در آفاق گرد بو تراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

(آپ معجزہ ردالشمس کا اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں' جو شخص اس دنیا میں بوتراب ہونے کا لقب حاصل کرتا ہے' وہی گردش آفتاب کو مغرب سے پلٹ سکتا ہے-)

علامہ اقبال کو حضرت علی سے بے پناہ محبت تھی اور اسی عشق کو وہ اپنی کامیابی اور پرواز کا راز سمجھتے تھے' چناں چہ ایک غزل میں کہتے ہیں:

یہ ہے اقبالؔ! فیض یادِ نامِ مرتضیٰ جس سے
نگاہِ فکر بینؔ خلوت سرائے لامکاں تک ہے

ایک اور موقع پر" اسرارِ خودی" میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:

از ولایت دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر بندہ ام

(یعنی حضرت علیؑ کے عالی خاندان کی الفت اور محبت سے زندہ ہوں اور اسی محبت و الفت کے باعث سارے عالم میں میری شہرت کی روشنی ہے۔)

زم زم ار جوشد از خاکِ من از اوست
مے اگر ریزد ز تاکِ من از اوست

(یعنی چوں کہ حضرت علیؑ علم و حکمت و دانش کا سمندر ہیں' اس لیے علامہ کی فکر سے ابلتے ہوئے چشمے اور چھلکتی ہوئی معرفت کی شراب کی منبع ذاتِ مولا علیؑ ہی ہے۔) ایک اور مقام پر" بانگِ درا" میں" میں اور تو" کے ذیل میں کہتے ہیں:

تیری خاک میں ہے اگر شرر' تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
نہ سیر گاہِ جہاں نئیؔ نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہیؔ وہی مرحبیؔ وہی عنتریؔ

"ضربِ کلیم" میں ارشاد فرماتے ہیں:

مرے لیے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب' فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
ہے جراتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا' وہ عشق یداللّٰہی
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

پھر فرماتے ہیں:

امارت کیا' شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زور حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

''طلوع اسلام'' کے زیر عنوان ''بانگ درا'' میں رقم کرتے ہیں:

مٹایا ہے قیصر و روم کے استبداد کو جس نے

وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ فقر بوذرؓ صدق سلمانی

''اسرار و رموز خودی'' میں کہتے ہیں:

نعرہ حیدرؓ نوائے بو ذر است

گرچہ از حلق بلال و قنبر است

ایک اور مقام پر ''جاوید نامہ'' میں کہتے ہیں:

پیش او نہ آسمان نہ خیبر است

ضربت او از مقام حیدرؓ است

''جاوید نامہ'' میں اجنبی تعلیم و تربیت کو غارت گری اور قوت حیدرؓی نہ ہونے کی وجہ سے مسندؓ قلعہ خیبر کی شکل میں بدل گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

دانش فرنگیاں غارت گری

دیرہا خیبر شد از بی حیدری

اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کرتے ہوئے ''مسافر نامہ'' میں ارشاد کرتے ہیں:

می شناسی معنی کرار چیست

این مقامی از مقامات علی ست

امتاں را در زمان بی ثبات

نیست ممکن جز بہ کراری حیات

مسلم ہندی چرا میداں گذاشت

ہمت او بوی کراری نداشت

(یعنی جانتے ہو کرار کے معنی کیا ہیں۔ یہ مقام فضیلت علیؑ کے فضائل کا ایک جزو ہے۔ اس دار فانی کی امتیں بغیر کراری کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ ہندستان کے مسلمانوں نے میداں اس لیے چھوڑا ہے کہ ان کی ہمت میں کراری کی خوبو موجود نہ

تھی۔) کبھی ''بال جبریل'' میں عشق علی میں مست ہو کر فرماتے ہیں:

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

''جاوید نامہ'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

عشق با نان جویں خیبر کشاد
عشق در اندام مہ چاکی نہاد

(یعنی: یہ عشق الٰہی تھا' جس کی قوت نے دروازہ خیبر اکھاڑا' جس کی غذا جو کی روٹی تھی اور جس کے اشارے پر چاند کے بدن میں شگاف ہوا)۔ علامہ اقبال کی ایک خاص مناجات ''سپاس جناب امیر'' تھی وہ ہر روز بعد نماز فجر پڑھا کرتے تھے اور جو جنوری ۱۹۰۵ء میں مجلہ ''مخزن'' میں بھی شائع ہوئی تھی اس کے ۴۴ اشعار میں سے صرف چند شعر پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ پوری مناجات ''باقیات اقبال'' میں موجود ہے:

اے باب مدینہ محبت!
اے نوح سفینہ محبت!
اے سر خط وجوب امکاں!
تفسیر تو سورہ اے قرآں
اے سر نبوت محمدؐ!
اے وصف تو مدحت محمدؐ!
بے تو نتواں با او رسیدن
بے او نتواں با تو رسیدن

از ہوش شدم مگر بی ہوشم
گوئی کہ نصیری خموشم
اما چہ کنم مے تولا
تند است بیرون فتد زمینا
اندیشہ عاقبت رہیدم
جنس غم آل تو خریدم

(اے شہر محبت کے دروازے! اے محبت کے سفینے کے ناخدا! اے معبود اور عبد کے درمیانی رشتے! اے قرآنی سورتوں کی تفسیر! اے راز دار نبوت محمد! جس کی روح، روح محمد ہے، تیرے بغیر (علی) محمد تک نہیں جا سکتے اور اس کے (محمد) کے بغیر (علی) تک نہیں پہنچ سکتے - میں ہوش کی زیادتی سے بے ہوش ہو گیا ہوں یعنی یہ کہ سکتا ہوں کہ ایک خاموش نصیری کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں- کیا کروں کہ تری محبت کی شراب اتنی تیز اور وہ آتشہ ہے کہ میرے دل کی صراحی سے چھلک چھلک کر گر رہی ہے- مجھے اب آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، کیوں کہ میں نے تیری (علی) کو اولاد کی محبت اور ان کی اطاعت کو آخرت کا اثاثہ سمجھ کر خرید رکھا ہے-)

مسلمانوں کے حق میں دعا کرتے ہوئے ''بال جبریل'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوے حیدرؓ بھی عطا کر

آخر میں نمونے کے طور پر صرف چند اشعار، جو علامہ اقبال کے شدید عشق علی سراغ دیتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

فیض، اقبال ہے! اسی در کا

بندہ شاہِ افق ہوں میں
(فریادِ امت)

کرم کرم کہ غریب دیار ہے اقبالؔ
مریدِ پیرِ نجف ہے، غلام ہے تیرا
(التجائے مسافر)

دل میں ہے، مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہل بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدرؑ مجھے
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا، خاکِ مدینہ و نجف

☆......☆......☆

''شرح مرغوب القلوب''

اردو نثر کی قدیم ترین کتاب

محققین اور دانشوران اردو ادب کے نزدیک تقریباً پچاس سال سے یہ مسئلہ بھی مورد بحث ہے کہ اردو ادب کی پہلی نثری کتاب کون سی ہے؟ اور اس کا مصنف یا مولف کون ہے؟ اردو ادب کے کئی نامور محققین نے اپنے مطالبات' مشاہدات اور تحقیقات کے نتیجے میں مختلف کتابوں اور مصنفوں کے نام پیش کیے' جن میں بعض مورد تائید ہوئے اور بعض رد کر دیے گئے' چنانچہ ملا وجہی کی تصنیف ''سب رس'' فضل علی فضلی کی کتاب ''کربل کتھا'' اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کتاب ''معراج العاشقین'' جسے آج مخدوم شاہ حسین بیجاپوری کی تصنیف کہتے ہیں' بڑی مدت تک اردو کی قدیم ترین نثری کتابیں تسلیم کی گئی تھیں' آج جدید تحقیق کی روشنی میں صحیح نہیں مانی جاتیں- ادب کی جدید تحقیق کا جوہر' موجودیت ہے' یعنی تحقیق صرف ان ہی کتابوں پر مشتمل ہو گی' جو آج ہمارے درمیان موجود ہیں- اگر کسی کتاب میں کسی دوسری کتاب کا تذکرہ یا اقتباس ہو گا' تو اسے ایک مکمل کتاب کی سند حاصل نہیں ہو گی-

جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں' کئی معتبر محققوں کی کاوشوں کے نتیجے میں' جن میں ڈاکٹر مشتاق احمد' ڈاکٹر گیان چند' ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر جمیل جالبی سرفہرست ہیں' آج یہ بات بارسوخ علمی' تاریخی اور ادبی حوالوں سے ثابت ہوتی ہے کہ حضرت میراں جی شمس العشاق بیجاپوری' وفات ۹۰۲ھ کی تصنیف ''شرح مرغوب القلوب'' جو تقریباً ۵۲۵ سال قدیم ہے' اردو ادب کی قدیم ترین نثری کتاب ہے- اس کتاب کا ایک قلمی مخطوطہ جو ۱۰۶۸ ہجری کا لکھا ہوا ہے' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں موجود ہے- حضرت میراں جی شمس العشاق صوفی منش بزرگوار تھے' جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے متاثر تھے- اس کتاب میں' جو دس حصوں پر مشتمل ہے' تفصیل سے صوفیانہ عقائد اور

تصوف شریعت اور طریقت پر روشنی ڈالی گئی ہے- اس کتاب کی تحریر میں فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں اور انشاء پر بھی فارسی آہنگ اور نثر غالب ہے' اور صرف افعال و ضمائر دکنی اردو لکھے گئے ہیں- ملاحظہ کیجیے:

''اے ایمانی! یاد کر خدا کوں' جھوٹ یاد کر' ہور رو کر یاد کر' ہور یگانہ ہوا
سالک اپنے توں باج تو یہ بندگی کرتا یوں ہے جوں جھالاں کا بانی جھوٹ ہے
اے بندگی بی جھوٹ ہے-''

اس کتاب کے علاوہ شمس العشاق نے تصوف کے بیان میں دو رسالے ''جل ترنگ'' اور ''گل باس'' بھی تصنیف کیے- چنانچہ اس جدید تحقیق کی رو سے میراں جی شمس العشاق کی کتاب ''شرح مرغوب القلوب'' قدیم ترین کتاب قرار پائی ہے' اور ''معراج العاشقین'' جسے حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف اور قدیم ترین کتاب نامزد کیا گیا تھا' علمی شواہد' ادبی' تاریخی اور اسلوبی دلیلوں سے حضرت مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف قرار پاتی ہے' جو ''شرح مرغوب القلوب'' کے تقریباً دو سو سال بعد لکھی گئی- ''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے' اس ضمن میں بحث کی ہے' جو اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کافی ہے-

اگر اردو ادب کے تین سو سال قدیم قلمی مخطوطات' تصنیفات' تالیفات اور رسالہ جات کو جمع کیا جائے تو ان کی موجودہ تعداد تقریباً (۳۰) کے لگ بھگ ہوتی ہے- امید ہے کہ آگے چل کر یہ تعداد زیادہ ہو جائے' کیوں کہ آئے دن نئے نئے مخطوطات برآمد ہو رہے ہیں- اردو ادب کی محقق محترمہ رضیہ سلطانہ کی رپورٹ کے موجب حیدر آباد دکن کے ادبی ذخائر میں عربی' فارسی اور اردو مخطوطات کی تعداد انیس ہزار سے زیادہ ہے- کے معلوم اس ذخیرہ میں کتنی قدیم اور نادر اردو کی کتابیں ہوں گی' جسے صرف اگلا وقت ہی بتا سکے گا-

اگرچہ اردو کی قدیم ترین کتاب ۵۲۵ سال پرانی ہے' لیکن ہمیں اردو نثر کے نمونے' جو فارسی کتابوں میں نظر آتے ہیں' ان کی عمر سات سو سال سے بھی زیادہ ہے- جن فارسی کتابوں میں اردو کے جملے موجود ہیں' ان میں سے ایک کتاب مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف ''سیر الاولیا'' ہے' جو تقریباً سات سو سال قبل لکھی گئی- مولانا مبارک' حضرت نظام الدین اولیا کے مصاحب اور مرید خاص تھے- ''سیر

اولیا'' میں مولانا مبارک نے حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج (۵۶۹-۶۶۴ھ) کے حالات فارسی زبان میں بیان کرتے ہوئے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے' جس میں ایک کنیز نے حضرت شکر گنج کو مخاطب کر کے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے طفل صغیر کے بارے میں کہا: ''خوجا بالا ہے'' یعنی یہ بچہ ابھی چھوٹا ہے' جس پر حضرت فرید الدین شکر گنج کے منہ سے فی البدیہہ یہ جملہ نکلا کہ ''پونوں کا چاند بھی بالا ہے'' یعنی چودھویں کا چاند بھی پہلے چھوٹا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے حضرت بو علی قلندر کا سات سو سالہ قدیم اردو کا جملہ ''تو کا مکھ سجھ دا ہے'' نقل کیا ہے جسے انھوں نے امیر خسرو کو مخاطب کر کے اس وقت کہا جب امیر خسرو ان کا تصوفی کلام سن کر رونے لگے تھے' چنانچہ اگر ان اردو جملوں کی تاریخی حیثیت کو قبول کیا جائے تو یہ قدیم ترین اردو کے جملے ہوں گے' جو فارسی کتابوں کے سینوں میں دفن ہیں۔ ان جملوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ آج سے سات سو سال قبل صوفیاے کرام نے عوام کی زبان میں' جسے ہم ابتدائی اردو کہہ سکتے ہیں' تبلیغ اسلام کی خاطر گفتگو کی تھی۔

''شرح مرغوب القلوب'' اور ''معراج العاشقین'' کے علاوہ دکن کے دیگر صوفیاے کرام اور علماے عظام' جن میں شمس العشاق کے صاحبزادے حضرت برہان الدین جانم (وفات ۹۹۰ہجری) اور آپ کے پوتے حضرت امین الدین اعلیٰ (وفات ۱۰۸۶ہجری) نے بھی کئی کتابیں اور رسالے اردو میں لکھے۔ حضرت برہان الدین جانم کی نثری کتابیں ''وجودیہ'' اور کلمۃ الحقائق'' آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ''کلمۃ الحقائق'' کے قلمی نسخے کو ادارہ ادبیات حیدر آباد نے شائع کیا۔ اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاے کرام کا کام'' میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: شاہ جانم کا اسلوب' فارسی اور دکنی آمیز سے تیار ہوا مگر اس پر ہندوی اثر غالب نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اللہ کرے سو ہوئے کہ قادر توانا توئے کہ قدیم القدیم اس قدیمی کا بھی کرتا دانج بج سو تیرا و تمہارا بج ہوا بھی تج تھے یار جرہان کچھ بھی نہیں تھا' دوجا شریک کوئی نہیں۔''

''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''سید شاہ امین الدین اعلیٰ'' میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے حضرت امین الدین اعلیٰ کو صوفی شاعر اور ادیب لکھ کر ان کی

تالیفات ''گفتار امین'' ''رسالہ وجودیہ'' ''کلمۃ الاسرار'' ''رسالہ ظاہر و باطن'' ''عشق نامہ'' ''شرح کلمہ طیب'' اور ''گنج مخفی'' بتلایا ہے۔ حضرت امین کی زبان ان کے دادا اور ان کے والد کی زبان سے صاف' آسان اور نرم ہے۔ ''گنج مخفی'' میں لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے امین دیکھ ہوا' امین' شاہد کہتے ہیں' یوں دونوں ذات کے دو طور ہیں' ذات نے اس کو دیکھا' اس کو نظر کہتے ہیں' دیکھ کر گواہی دی تو اسے شاہد کہتے ہیں' یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔''

اس کے علاوہ حسین خدا نما' وفات ۱۰۷۳ ہجری کی تصانیف ''چہار وجود'' ''رسالہ قربیہ'' اور ''شرح تمہیدات ہمدانی'' جو عبداللہ بن محمد کی عربی تصنیف کا دکنی ترجمہ ہے' اور میران یعقوب کی تالیفات ''شمائل الاتقیا'' اور دلائل الاتقیا'' جو خدا نما کے ہم عصر تھے قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام کتابیں عادل شاہی دور کی نثری یادگاریں ہیں' جنھیں صوفیائے کرام کی مذہبی تصنیفات کہہ سکتے ہیں۔

اردو نثر کی پہلی ادبی کتاب' جسے ادبی تخلیقی شاہکار کہا جاتا ہے ''سب رس'' ہے' جسے قطب شاہی سلطنت کے ملک الشعرا ملا اسد اللہ وجہی (وفات ۱۰۷۰ ہجری) نے تصنیف کیا۔ یہ کتاب درحقیقت ابن سیبک نیشا پوری کی فارسی تصنیف ''دستور عشاق'' کا بڑی حد تک ترجمہ ہوتے ہوئے بھی بذات خود ایک خاص ادبی شاہکار ہے۔ موجودہ تحقیق نے ''سب رس'' کے علاوہ ''تاج الحقائق'' اور ''قطب مشتری'' کو بھی ملا وجہی ہی کی تصنیفات قرار دیا ہے' جن میں ملا وجہی کا خاص رنگ ظاہر ہے' جو اس زمانے کے صوفیانہ مصنفین کی روایات کے خلاف تھا۔ ''سب رس'' کی صاف ستھری زبان' روانی اور رنگینی دیکھیے۔ ''راگ میں عجب ہے تاثیر' عاشق کے دل کو یوں لگا جوں تیر بہتے ہوئے پانی کو کھڑا کرے۔ اڑتے جناور کو پاڑے' سیانے کوں دیوانہ کرے' ہوشیار کو مست کر پچھاڑے۔''

جدید مشاہدات سے یہ پتا چلتا ہے کہ شمالی ہندستان میں اردو نثر کی تالیفات' دکن کی تصنیفات کے تقریباً دو سو سال بعد منظر عام پر آئیں۔ شمالی ہند کی اولین نثری کتاب ''کربل کتھا'' ہے' جو فضل علی فضلی ۱۱۴۵ھ ہجری کی تالیف ہے۔ ''کربل کتھا'' ملا حسین کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں ترجمہ ہے' جو بارہ مجلسوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجالس پہلی محرم سے بارہ محرم تک پڑھی جاتی تھیں۔ اس کتاب کا مقصد

فارسی مطالب کا سادہ اردو زبان میں ترجمہ تھا' جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکیں اور مجلس میں گریہ و زاری ہو سکے اور ثواب دارین حاصل ہو سکے۔ فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' بڑی مدت تک پڑھی اور سنی جاتی رہی۔ ''کربل کتھا'' کے چند سال بعد اردو ادب کی قدیم ترین داستان' عیسوی خان بہادر ہندی نے ''قصۂ مہر افروز و دلبر'' کے نام سے تالیف کی' جو رنگینی اور سادگی کی آمیزش سے لکھی گئی تھی' ملاحظہ کیجیے: ''پھرتی ہیں اور آپس میں کھیلتی ہیں کہ کوئی تالیاں دے دے کر دوڑتی ہے' کوئی چھپ رہی ہے' کوئی اسے ڈھونڈتی پھرتی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

ان کتابوں کے علاوہ شمالی ہندستان میں جو اردو کی قدیم تحریریں نظر آتی ہیں' ان میں ۱۷۶۶ء کا محمد رفیع سودا کے دیوان مرثیہ کا دیباچہ' ۱۷۷۶ء کی محمد حسین علی خاں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' ۱۷۸۸ء کی مہر چند کھتری کی داستان ''نو آئین ہندی'' ۱۷۹۰ء کی شاہ حسین بریلوی کی داستان ''جذب عشق'' اور ۱۷۹۳ء کی شاہ عالم کی داستان ''عجائب القصص'' شامل ہیں' جو وقت کے ساتھ ساتھ صاف ستھری' نرم' آسان اور رواں زبان میں لکھی جانے لگیں۔ ہم اپنی گفتگو کو مہر چند کھتری کی داستان ''نو آئین ہندی'' جسے قدیم دور کی آخری کڑی یا جدید نثر کی ابتداء کہ سکتے ہیں' تمام کرتے ہیں: ''چمن کے درمیان ایک بارہ دری' سونے اور جواہر سے آراستہ' اس میں مخمل کا فرش اور کمخواب کا چھت' اس خوبی سے لگا تھا کہ جس پر نظر نہ ٹھہرے۔''

☆......☆......☆

حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ امیر خسرو دہلوی کا ذکر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے تذکرے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ محبوب سبحانی، سلطان المشائخ شیخ نظام الدین کا نام محمد تھا۔ آپ احمد بن علی بخاری کے فرزند تھے۔ تذکرہ ''میخانہ'' کے مولف کے مطابق سلطان المشائخ ۲۷ صفر ۶۳۶ھ کو بدایوں (یوپی) ہندستان میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر پانچ برس کی تھی، امیر خسرو کی طرح آپ کے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور آپ کی والدہ نے آپ کی تربیت اور پرورش کی۔ خواجہ، ماں اور باپ کی طرف سے حسینی سید اور نجیب الطرفین تھے۔ بدایوں میں مولانا علاالدین اصولی سے علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۶۴۹ھ میں دہلی تشریف لائے اور شمس الدین خوارزمی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ دہلی میں اقامت کے دوران خواجہ کے تعلقات خواجہ شیخ نجیب الدین متوکل، برادر شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج سے قائم ہوئے، چنانچہ اسی توسط سے آپ نے ۶۵۲ھ میں شیخ فرید الدین شکر گنج (۵۶۹-۶۶۴ہجری) کی بیعت کی اور شیخ سے خرقہ خلافت حاصل کر کے دہلی واپس ہوئے، اور ریاضت و اعتکاف میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ نظام الدین اولیا نے روحانیت اور تصوف میں اس قدر ترقی کی کہ غوثیت اور قطبیت کے مدارج طے کر کے مرتبہ محبوبیت تک جا پہنچے۔ خواجہ نے نوے سال کی عمر میں ۷۲۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور دہلی میں دفن ہوئے، جہاں آج لاکھوں عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیا کی مشہور منقبت، جو ۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے نمونے کے طور پر صرف چار اشعار، مع ترجمہ کے، پیش کیے جا رہے ہیں:

مطلع:

اگر خواہی کہ در محشر شفیعت مصطفیٰ باشد
قسیم جنت و دوزخ علی مشکل کشا باشد

یعنی: اگر تو چاہتا ہے کہ روز محشر حضرت محمد ﷺ تیری سفارش کریں، تو یاد

رہے کہ علیؑ جو لوگوں کی مشکلات حل کرتے ہیں، اس دن جنت اور دوزخ کی تقسیم کریں گے۔

میان کعبہ و زمزم ہزاروں عمر بگذاری
گرت مہر علی نبود ہمہ عمرت ہبا باشد

یعنی: اگر کعبہ اور زمزم کے درمیان حج کرتے ہوئے ہزاروں عمریں بھی گذار دے تو پھر بھی اگر تیرے دل میں علیؑ کی محبت نہ ہو تو ساری عمر کی عبادتیں بے کار ہوں گی۔

مرا دو مرکز عالم محمدؑ حجت قائم
بہ امر حق شود ظاہر کہ ختم اولیا باشد
نظام الدین حیا دارد کہ گوید بندہ شاہم
ولیکن قنبر او را کمینہ یک گدا باشد

یعنی عالم کی مراد اور اس کا مرکز حضرت صاحب الزماں محمدؑ حجت قائم ہیں، جو خدا کے حکم سے ظاہر ہوں گے، جن پر اولیا کا خاتمہ ہوا ہے، یعنی وہ دنیا کے آخری ولی ہیں۔ نظام الدین اولیا کو یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ وہ حضرت علیؑ کا غلام ہے، لیکن شاید یہ ممکن ہو کہ وہ حضرت علیؑ کے غلام قنبر کا ادنی سا غلام بن جائے۔ ان اشعار سے سلطان المشائخ کے جذبات عقیدت کے علاوہ ان کی فن شاعری پر گرفت ظاہر ہوتی ہے۔

امیر خسرو سلطان المشائخ سے ۱۶ سال چھوٹے تھے۔ امیر خسرو کو ان کے والد نے آٹھ برس کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لیے بیعت کرا دی تھی، چنانچہ شیخ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے خسرو پر اپنا کام کرتی رہی اور شیخ المشائخ کا عشق اس طرح خسرو کے رگ و ریشے میں سما گیا کہ خود اپنی تالیف ''افضل الفوائد'' میں لکھتے ہیں کہ ۶۷۱ ہجری میں، یعنی ۱۲ سال کی عمر میں، دوبارہ خواجہ اولیا کے ہاتھ پر بیعت کر کے مریدان خاص میں داخل ہوئے۔ تذکرہ ''میخانہ'' میں ملا عبدالنبی قزوینی اور قدرت اللہ قدرت نے ''طبقات الشعراء'' میں لکھا ہے کہ امیر خسرو نے تمام دولت اور مال، شیخ المشائخ کے قدموں پر نثار کر دیا اور شاہی لباس اتار کر لباس فقر زیب تن کیا اور خواجہ سے چار گوشہ ٹوپی لے کر خانقاہ کی تعریف میں یہ قطعہ کہا:

جدار خانقاہ او بہ تقدیم
حطیم کعبہ را ماند بہ تعظیم

ملک کردہ بہ سقفش آشیانہ
چو اندر سقفہا گنجشک خانہ

یعنی: اس خانقاہ کی عظمت ایسی ہے کہ کعبہ بھی اس کی تعظیم کرتا ہے۔ اس خانقاہ کی چھت میں ملائک اپنے گھر بنا کر اس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں، جس طرح چڑیاں چھتوں میں اپنا گھونسلا بناتی ہیں۔

شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ مولانا سید محمد بن مبارک علوی کرمانی، متوفی ۷۶۸ ہجری نے اپنی کتاب "سیر اولیا" میں لکھا ہے کہ سلطان المشائخ نے خسرو کو مخاطب کر کے فرمایا: میں اس دنیا میں سب سے تنگ آ چکا ہوں، بجز تیرے، کیوں کہ تو میرے دل کا سکون ہے۔ پھر فرمایا: جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین تو کیا لایا ہے؟ تو خسرو کو پیش کر دوں گا۔ جب خواجہ دعا مانگتے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے: الٰہی! بہ سوز سینہ ایں ترک مرا بہ بخش۔ شیخ نے خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا، جس پر فخر کرتے ہوئے امیر خسرو نے کہا تھا:

بر زبانت چوں کہ نام بندہ ترک اللہ رفت
دست ترک اللہ بگیر وہم باللہ بخش سپار

یعنی: جیسا کہ تیری زبان سے اس غلام کا نام ترک اللہ نکلا ہے بس اس ترک اللہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے خدا کی مغفرت کے حوالے کر دے۔ امیر خسرو کی شان میں خواجہ کی یہ رباعی نہ صرف خسرو کی جامع کمالات شخصیت، بلکہ خواجہ کی والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔

رباعی

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن ایں خسرو راست
ایں خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدای ناصر خسرو ماست

یعنی نثر اور نظم میں خسرو کی مثال نہیں ملتی، کیوں کہ وہ ملک سخن کا بادشاہ ہے۔ یہ ہمارا خسرو ہے اور ایرانی شاعر ناصر خسرو نہیں ہے، بہرحال خدا ہمارے خسرو کا دوست و مددگار ہے۔ یقیناً یہ خدا ہی کی مدد تھی کہ خسرو کا کلام اس درجہ قبولیت کو پہنچا کہ سات سو

سال گذرنے کے بعد بھی خسرو کی غزلیں' ان کے گیت' محفلوں کی زینت اور قوالیوں کی شان بنے ہوئے ہیں۔

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

مولانا عبدالرحمان جامی نے ''نفحات'' میں لکھا ہے کہ خسرو نے اپنے پیر خواجہ نظام الدین سے درخواست کی کہ ان کے نام کو بدل دیا جائے' کیوں کہ وہ امیر خسرو نام سے خوش نہیں ہیں۔ اس نام سے سلطنت اور دربار کی بو آتی ہے۔ اس کے بدلے کوئی ایسا درویش یا فقیری نام عطا کیا جائے کہ جس پر روزِ قیامت' فخر کیا جا سکے۔ خواجہ نے فرمایا: کسی موزوں وقت یہ کام انجام ہو جائے گا۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد امیر خسرو کو محمد کاسہ لیس کے نام سے پکارا اور کہا کہ یہ نام' یعنی محمد کا کٹورا چاٹنے والا' تمھیں غیب سے ملا ہے۔ محمد بن مبارک نے ''سیر اولیا'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب خسرو پیدا ہوئے' تو ان کے والد نے انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر' برکت کے لیے کسی درویش کی گود میں ڈال دیا' جس پر اس مجذوب نے کہا کہ یہ بڑا ہو کر فارسی کے ممتاز شاعر خاقانی سے بھی دو قدم آگے رہے گا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ امیر خسرو' اول جوانی سے شیخ المشائخ کی خدمت میں' جب بھی موقع ملتا' جاتے اور اپنا کلام سناتے' چنانچہ ایک دن خواجہ نے فرمایا کہ ''صفاہان'' کی طرز میں اشعار کہو' یعنی عشق و عاشقی' سوز و درد اور زلف و خال آمیز اشعار لکھو' چنانچہ اسی سفارش پر خسرو نے رومانیت بھرے اشعار نظم کیے۔ امیر خسرو جب بھی کوئی تالیف یا تصنیف تکمیل کر لیتے' تو اس کو شیخ المشائخ کے ہاتھ پر رکھ دیتے' پھر خواجہ اس پر فاتحہ پڑھتے اور کتاب کھول کر چند سطروں کا مطالعہ کرتے' اور خسرو کو واپس کر دیتے' یعنی ان مطالب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو کی اغلب کتابوں کی رونمائی سات سو سال قبل' محبوب سبحانی خواجہ نظام الدین اولیا نے انجام دی تھی۔

☆.....☆.....☆

ما قبلہ راست کردیم بہ طرف کج کلاہی

خسرو

مشہور قصہ ہے کہ ایک بار سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا دریا کے کنارے، کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کی عبادت کا تماشا کر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے آپ کی ٹوپی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ خواجہ صاحب نے خسرو سے کہا: دیکھو! ''ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی''۔ یعنی: ہر سیدھی قوم کا راستہ، دین اور قبلہ صحیح ہوتا ہے۔ اس وقت امیر خسرو نے خواجہ کی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

ما قبلہ راست کردیم بہ طرف کج کلاہی

یعنی: ہم نے اپنا قبلہ، ٹیڑھی ٹوپی کی طرف کر دیا ہے۔ اس مصرعے کا ذکر ''تزک جہانگیری'' میں شہنشاہ جہانگیر نے بھی کیا ہے۔

اگرچہ امیر خسرو کی تمام عمر، مشہور فارسی محاورے کے مطابق تھی، یعنی: کمر بہ خدمت سلطان بند و صوفی باش، لیکن اس کے ساتھ ساتھ موسیقی میں مہارت کامل حاصل تھی، اس سے متاثر ہو کر خواجہ نے انھیں ''مفتاح السماع'' کا خطاب دیا۔

مولانا جامی نے ''نفحات'' میں ذکر کیا ہے کہ خواجہ نظام الدین نے امیر خسرو کے اصرار پر اپنا لعاب دہن، ان کے منہ میں ڈالا، تاکہ خسرو کے خیالات میں جدت آفرینی اور کلام میں شیرینی بڑھ جائے۔ جامی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے سعدی شیرازی کے منہ میں اپنا آب دہن ڈالا، جس کی بدولت ان کے کلام میں حلاوت اور شیرینی آ گئی، لیکن جامی نے ان حکایات کے حوالے پیش نہیں کیے۔ تمام علمائے ادب و شعر نے حافظ شیرازی کی بابت یہ روایت نقل کی ہے کہ حافظ پہلے غلط اشعار لکھتے تھے اور لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے، چنانچہ ایک رات جب وہ بابا کوہی کے مزار پر رنجیدہ ہو کر سو رہے تھے تو خواب میں حضرت علی کو دیکھا۔ آپ نے ایک سفید

لقمہ حافظ کے منہ میں رکھ دیا' چنانچہ صبح اٹھ کر معروف غزل لکھی تو لوگوں کو یقین نہیں ہوا کہ یہ حافظ ہی کی غزل ہے' چنانچہ خود غزل کے مطلع میں اس واقعہ کی طرف اشارہ موجود ہے:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

یعنی: کل وقت سحر مجھے رنج سے نجات دی گئی اور اس تاریک رات میں مجھے آب حیات پلایا گیا-

تاریخ گواہ ہے کہ امیر خسرو کی زندگی کے آخری (۱۴-۱۵) بارہ پندرہ سال' دن رات' خواجہ کی خدمت میں گذرے- کہتے ہیں کہ امیر خسرو ہی قوالی کے مخترع بھی ہیں-

محمد ابن مبارک ''سیر اولیا'' میں لکھتے ہیں کہ ایک دن سلطان المشائخ کی شان میں خسرو نے چند اشعار پڑھے- خواجہ نے خوش ہو کر فرمایا: جو چاہتا ہے' مانگ لے! کیوں کہ خسرو کو شاعری کا چسکا تھا' اس لیے خواجہ سے کلام میں حلاوت اور شیرینی اور ندرت بیانی کو طلب کیا' چنانچہ خواجہ نے کچھ بتاشے شکر کے' سر پہ وار کر خسرو کو کھانے کے لیے دیے' جس کے اثر سے خسرو کے کلام میں وہ کشش پیدا ہوئی کہ ان کا کلام شش جہات میں معروف ہو گیا-

خواجہ نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر چند اشعار اور خطابات' خسرو کو عطا کیے' جنھیں امیر خسرو نے تعویذ بنا کر اپنے بازو پر باندھا اور وصیت کی کہ یہ تعویذ' دفن کے وقت' ان کے ساتھ کفن میں رکھی جائے- خواجہ نظام الدین اولیا' امیر خسرو سے اتنی محبت کرتے تھے کہ کئی بار فرماتے تھے' کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی قبر میں خسرو کو بھی دفن کراتا-

علمائے ادب نے لکھا ہے کہ امیر خسرو تہجد گذار تھے اور ہر رات سات پارے قرآن کے' پڑھتے تھے- ایک دن خواجہ نے پوچھا کہ خسرو کیسی گزر رہی ہے' تو خسرو نے فرمایا: خواجہ رات عبادت اور صبح گاہی' گریہ و زاری میں صرف ہو رہی ہے- یہ سن کر خواجہ خوش ہوئے اور ارشادات فرمائے جنھیں خسرو نے اپنی کتاب ''افضل الفوائد'' میں رقم کیا ہے-

جس وقت سلطان المشائخ نے رحلت فرمائی' امیر خسرو' دہلی میں موجود نہ تھے

بلکہ بنگال میں تھے، چنانچہ جیسے ہی خواجہ کی رحلت کی اطلاع ملی دیوانہ وار ماتمی کپڑے پہن کر خاک پھیرے اور سر پر مل کر مزار پر پہنچے اور گریہ کناں اشعار پڑھتے رہے، جس کا ایک مصرع یہ ہے:

جامعہ دراں چشم چکاں خون دل مزار پر آیا ہے

پھر قدیم اردو یا بھاشا زبان میں یہ دوہا پڑھا:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو گھر اپنے رات بھئی چوندیس

خواجہ کے گذرنے کے چھے مہینوں تک قبر پر مجاورت کی۔ بڑے غم اندوہ کے اشعار لکھے

درویش تو ای از بہ کس بس کہ منم
در راہ غمت کمینہ تر خس کہ منم

یعنی: میرے سوا اور کوئی تیرے پاس نہیں ہے اور تیرے غم میں سب سے زیادہ مغموم یہی ناچیز ہے، چنانچہ فارسی اور بھاشا زبان میں جو اشعار دل سے نکلے آج بھی زندہ ہیں۔ وہ کون قوال یا موسیقار ہے، جس نے ان اشعار کو گایا نہیں ہے۔ امیر خسرو خواجہ کے فراق میں چھے مہینے بعد، یعنی جمعہ کی رات ۱۸ شوال ۷۲۵ ہجری کو اس دار فانی سے انتقال کر کے جنت میں اپنے پیر کی خدمت میں پہنچ گئے اور خواجہ کی پائنتی دفن ہوئے۔ کتاب ''خزینۃ الاصفیا'' میں خسرو کی رحلت سے متعلق یہ اشعار ملتے ہیں:

خسرو دہلوی بحکم خدا
بہ شب جمعہ شد ز دار فنا
عمر ہفتاد و پنج سالش بود
کہ آں زمان شد بہ حضرت معبود
ہژدہم بود از مہ شوال
کہ گذشت او ازیں جہان ملال
خسرو دہلوی بہشتی بود
سال نقلش بگو کہ ''چشتی بود''

یعنی: خسرو دہلوی خدا کے حکم سے جمعہ کی رات کو ۷۵ سال کی عمر میں، ۱۸

شوال کو اس دردہ بھری دنیا سے گذر گئے۔ خسرو دہلوی جنتی تھے اور ان کی وفات کی تاریخ ''جنتی بود'' نکلتی ہے۔ جس کے عدد ۷۲۵ مطابق ۷۲۵ ہجری ہیں۔

شہنشاہ بابر نے خسرو کی وفات کے ۲۷۰ سال بعد' ۹۹۷ ہجری میں' سید مہدی خواجہ کے ذریعے مقبرہ تعمیر کروایا۔ ملا شہاب معمائی نے دو مادہ تاریخ وفات' قبر کی لوح پر کندہ کرائے' جن سے ۷۲۵ ہجری تاریخ نکلتی ہے' جو ''عدیم المثل'' یعنی: جس کی نظیر نہیں اور ''طوطی شکر مقال'' یعنی: طوطی جس کے بول شیریں ہوں۔

قطعہ یوں ہے

میر خسرو خسرو ملک سخن
آن محیط فضل و دریا کمال
نثر او دلکش تر از ماء معین
نظم او صافی تر از آب زلال
بلبل دستانسرای بی قرین
طوطی شکر مقال بی مثال
ازپی تاریخ سال فوت او
چون نہادم سر بہ زانوی خیال
شد ''عدیم المثل'' یک تاریخ او
دیگری شد ''طوطی شکر مقال''

یعنی: امیر خسرو ملک سخن کا تاجدار ہے' جو فضل اور کمال کا دریا ہے' جس کی نثر ماء معین سے دلکش اور جس کی نظم' آب زلال سے صاف ہے۔ وہ بلبل داستاں اور طوطی شکر مقال ہے۔ اس کی تاریخ وفات پر جب میں نے خیال کیا تو دو تاریخیں نکلیں' ایک ''عدیم المثل'' جس کی کوئی نظیر نہیں' اور دوسری ''طوطی شکر مقال''۔

☆......☆......☆

جمالِ محمد ﷺ ...... اُردو اشعار کے آئینے میں

نعت: یہ تین حرفی عربی لفظ دنیائے ادب کے معتبر ترین لفظوں میں شمار کیا جاتا ہے، جس کے لغوی معنی: تعریف، توصیف اور تجلیل کے بتائے گئے ہیں۔ تاریخ نعت شاہد ہے کہ اسلامی معاشرے میں یہ لفظ پہلی بار حضرت علیؓ نے پیغمبرِ اسلام کی مدح و ثنا کے لیے استعمال کیا، چنانچہ تقریباً ۱۴ سو سال سے نعت کا لفظ مدحت و توصیف نبی ﷺ کے لیے ہی مختص ہو گیا ہے۔ نعت ایک موضوعی صنف سخن ہے اور اسی لیے عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں میں اس کی ہیئت کسی خاص شکل میں محدود نہ ہو سکی۔ ہر صنف سخن یعنی دو بے، چو مصرعے، قطعے، نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مثلث، مستزاد، مخمس، مسدس، ترجیع اور ترکیب بند وغیرہ، غرض ہر ہیئت میں توصیف و تعریف و تجلیل حضور اکرم ﷺ کی گئی اور اسے نعت ہی کہا گیا۔ موضوعی اعتبار سے جس طرح حمد صرف تعریف و ستائش اللہ کا نام ہے، اسی طرح نعت صرف اور صرف مدحت محمد ﷺ کا نام ہے، چونکہ یہ اس بندۂ کامل کا ذکر ہے، جس کو خود خدا نے رفعت بخشی ہے اور جس کی ذات، بقول جامی:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نعت کے متعلق یہ بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ نعت کہنا بہت آسان ہے اور بہت مشکل بھی۔ بے شک جو شاعر عشق محمد ﷺ کی دولت سے سرشار ہو اور شاعری کے فن سے آشنا تو پھر وہ اپنی دلی کیفیت کو شعری ہیئت میں آسانی کے ساتھ بیان کر سکتا ہے، چنانچہ اردو شعر و ادب گواہ ہے کہ بعض معمولی شعرا نے بڑی آفاقی نعتیں کہی ہیں۔ نعت کہنا مشکل اس لیے ہے کہ اس کی سرحدیں حمد کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہیں۔ ایک طرف خالق دو عالم ہے، تو دوسری طرف وجہ تخلیق دو عالم، ایک طرف خالق کائنات ہے، تو دوسری طرف سرور کائنات، ایک طرف رب العالمین ہے، تو دوسری طرف رحمت العالمین، شفیع المذنبین، سید الواصلین، طاھا، یٰسین، چنانچہ اگر شاعر کا قدم اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو ثواب کے بجائے عتاب نازل ہو سکتا ہے، یعنی ذرا سی لغزش، ایمان کو کفر میں بدل سکتی

ہے- عبد اور معبود نے اس باریک رشتے کو الفاظ کے تاروں سے سجانے کے لیے علم اسلامی' عشق محمدیؐ اور زبان پاکیزہ کی یکجا ضرورت ہوتی ہے' چنانچہ اسی لیے تو دربار اکبری کا مشہور فارسی شاعر عرفی شیرازی نے اپنی نعت میں کہا تھا:

عرفی! مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

یعنی: عرفی! جلدی نہ کر- یہ نعت کا راستہ کوئی صحرا نہیں- آہستہ قدم اٹھا! کیوں کہ یہ راستہ تلوار کی دھار سے تیز بنا ہوا ہے- نعت میں جن موضوعات کو مشق سخن بنایا گیا- ان میں شاعر کی کم مائیگی' بے بضاعتی سخن' خواہش دیدار اور دیار محمدؐ کے علاوہ جمال' جلال' کمال' خصال و آل محمدؐ سے لے کر بلال محمدؐ تک کے مطالب کی توصیف و تقدیر کی گئی- اس مضمون میں چونکہ ہمارا موضوع جمال محمدؐ ہے' وہ حسن لاثانی جو آدم بایں دم خوبصورتی اور خوب سیرتی میں یکتا بشر کائنات پایا گیا ہے' اور کیوں کہ شعرا میں جمالیاتی حس دوسرے افراد کی نسبت زیادہ ہوتی ہے' اس لیے نعت کا یہ پہلو کسی قدر رنگین اور تغزلانہ رنگ کا مظہر بن کر نکھرا ہے- تاریخ گواہ ہے کہ سب سے پہلے نعتیہ اشعار محسن اسلام حضرت ابو طالب نے کہے اور سب سے پہلی مکمل نعت حضرت حسانؓ بن ثابت نے خود دربار رسالت میں پیش کی' جس کے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے: ''آپ سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا' اور آپ سے زیادہ جمیل' عورتوں نے کوئی بچہ نہیں جنا''-

صدر اسلام کے نعت خوانوں میں حضرت علیؓ' عبداللہؓ بن رواحہ' کعبؓ بن زہیر قابل ذکر ہیں- ایک اور مشہور نعت گو جنھیں شاعر چادر رحمت کا خطاب دیا گیا' جناب بوصیریؒ جن سے قصیدہ بردہ شریف منسوب ہے- فارسی زبان میں سعدیؒ' خسروؒ رومیؒ جامیؒ' عرفیؒ' قدسیؒ کی نعتیں بہت مشہور ہوئیں- تقریباً ۷۵۰ سال گذرنے پر بھی سعدیؒ کا نعتیہ کلام ''بلغ العلیٰ بکمالہ'' زبان زد عام ہے' جن پر کئی قدیم اور جدید شعرا نے تضمینیں لکھی ہیں اس کی تضمین کرتے ہوئے دو سو سال قبل لکھنو کے مشہور مرثیہ گو شاعر پناہ علی بیگ افسردہ ''جمال محمدؐ'' میں فرماتے ہیں:

وہ بادشاہ انبیاؐ شمس الضحیٰ اجلالہ
وہ شمع نور کبریاؐ نجم الہدیٰ افضالہ

بسم الله الرحمن الرحيم

عروسِ سخن

خوبصورت، معیاری کتابیں

القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول: 2004ء
مطبع: عرفان افضل پرنٹرز ○ لاہور
تزئین: ساجد قریشی
قیمت: 300 روپے

فہرست

1۔	گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد (ڈاکٹر سید تقی عابدی۔ ایم۔ ڈی)	1
2۔	حرفے چند (محسن بھوپالی)	3
3۔	''عروس سخن'' ایک تبصرہ (بریگیڈیر (ر) علی طباطبائی، راولپنڈی)	4
4۔	''عروس سخن'' (عابد جعفری، صدر، رائٹرز فورم ٹورنٹو)	7
5۔	امیر خسرو دہلوی	10
6۔	لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی	14
7۔	فضائل و شمائل محمد ﷺ (اردو اشعار کے آئینے میں)	19
8۔	اقبالؒ اور عشقِ علیؑ	28
9۔	''شرح مرغوب القلوب'' (اردو نثر کی قدیم ترین کتاب)	36
10۔	حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو	41
11۔	ما قبلہ راست کردیم بہ طرف کج کلاہی (خسرو)	45
12۔	جمال محمد ﷺ اردو اشعار کے آئینے میں	49
13۔	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟	56

14۔	ضمیر جعفری (لاشعوری احساس کا باشعور شاعر)	62
15۔	لذت گفتار کی سحر آفرینی	68
16۔	علامہ اقبال کی مثنوی (سورۂ اخلاص کا پہلا مکمل ترجمہ)	76
17۔	خلاصہ مطالب مثنوی (در سورہ اخلاص)	85
18۔	ہیر وارث شاہ کا پہلا منظوم اردو ترجمہ (مرحوم علامہ مجاہد یکتا کے شاہکار کا جائزہ)	95
19۔	اقبالؔ عاشق امام حسینؑ	107
20۔	دیوان حافظؔ کے تراجم	113
21۔	دیوان حافظؔ کا اردو منظوم ترجمہ	116
22۔	غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے	121
23۔	چراغ سخن 'شہر کا' بجھ گیا	126
24۔	رنائی رباعیات (رباعی کا مختصر تاریخی' عروضی اور تحقیقی جائزہ)	133
25۔	حمیرا رحمٰن کے ایک شعر کا تنقیدی' تجلیلی اور تفصیلی تجزیہ	141
26۔	علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ کرشن پرشاد	147
27۔	خاندان میر انیسؔ (دنیائے ادب کا واحد ممتاز اور منفرد سلسلہ)	151
28۔	علامہ اقبالؔ اور حیدرآباد دکن	156
29۔	رزمیہ شاعری کے خدائے سخن: میر انیسؔ	160
30۔	شاعروں کی قسمیں (حضرت امیر خسروؔ کی نظر میں استاد شاعر کون ہے؟)	166
31۔	سلام بر حسینؑ (سلام پر ایک تاریخی' ادبی اور تحقیقی گفتگو)	175

32۔ غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی (نور احمد میرٹھی کی کتاب ''بہر زماں بہر زباں'' کی روشنی میں) 183

33۔ اقبال کا تصورِ زمان و مکاں (معروف سائنسدان ڈاکٹر رضی الدین کی تصنیف پر تبصرہ) 190

34۔ علامہ اقبالؔ کی دعا 196

35۔ میر تقی میر کا رثائی کلام 201

36۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ (آسمانِ مرثیہ کے آفتاب اور ماہتاب) 206

37۔ سفیرِ اردو ڈاکٹر انعام الحق جاوید (نیویارک میں) 210

38۔ قصیدہ بردہ (بوصیری اور علامہ اقبال) 215

39۔ علامہ اقبالؔ کا شاہین 219

40۔ واقعہ نگاری کا تاجدارِ سخن...... میر انیس 231

41۔ دیارِ محمد ﷺ (اردو اشعار کے آئینے میں) 238

42۔ انیسؔ کے سلام (اعلیٰ تغزلانہ کلام) 251

43۔ مرزا غالبؔ کا سلام اور مرثیہ 257

44۔ عرفان عبد ''صنم کدہ'' میں 262

45۔ جعفر زٹلی سے جعفر رضوی تک (یونہی مذاق میں) 269

46۔ معلم اقبالؔ شمس العلماء میر حسن 273

47۔ سحر آثار کی سحر نمائی (چھوٹی بحر کا بڑا شاعر) 277

48۔ یہی تو حرف معتبر ہے 283

49۔ اقبال کیسے علامہ سے سر ہو گئے 292

50۔ محسن شعر وادب (محسن بھوپالی) 296

51۔ ''نغمہ زنجیر'' کی تاثیر (عبدالرحمٰن صدیقی کے مجموعہ کلام پر تبصرہ) 301

52۔ رسم رونمائی مجموعہ کلام (ادبی بدعت جو ادبی سنت بن گئی) 307

53۔ خالد عرفان کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ 311

54۔ صداقتوں کا شاعر (قتیل شفائی) 318

55۔ گلدستہ شہادت عظمیٰ 324

56۔ نائک امیر خسرو اور علم موسیقی 334

وہ سرور شاہ، کہ الفقر فخری قال
وہ دُرِ بخش اولیا، والفقر منی حال
بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلو علیہ وآلہٖ

امیر خسرو نعتیہ شاعری سے ابھی تک زندہ ہیں اور سات سو سال کا عرصہ گذرنے پر بھی امیر خسرو کے اشعار ہمارے درمیان اسی تازگی سے موجود ہیں:

خدا خود میر مجلس بود شب جای کہ من بودم
محمدؐ شمع محفل بود شب جای کہ من بودم

شاہ جہاں کے دربار کے مشہور شاعر حاجی محمد جان قدسی کی عشق محمدی میں ڈوبی ہوئی نعت ابھی بھی زبان زدِ عام ہے جس پر مومن اور غالب جیسے شعرا نے تضمین کی۔

مرحبا! سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

فارسی میں عطار، رومی، شمس تبریزی، معین الدین چشتی، فرید الدین شکر گنج، نظام الدین اولیا، شہاب بدایونی، بو علی قلندر، نظامی، صائب تبریزی، حسین نظیری اور کئی شعرا کے کلام میں نعتیہ اشعار اور جمال محمدؐ اور سراپاے محمدؐ کی توصیف نظر آتی ہے، لیکن مضمون کی نوعیت سے ہم صرف اردو اشعار پر توجہ دینا چاہتے ہیں۔ اردو ادب میں شاید ہی کوئی نامور شاعر ایسا گذرا ہوگا، جس نے حضورؐ کی مدح نہ کی ہو، لیکن ہر بڑے شاعر نے صرف مختصر طور پر اس عبادتِ سخن میں شرکت کی۔ انیسویں صدی کے معروف شعرا جنھوں نے نعت کو نیا رنگ و جمال عطا کیا۔ ان میں محسن کاکوروی، امیر مینائی، احمد رضا بریلوی اور حالی قابلِ ذکر ہیں۔ اردو کی سب سے پرانی نعت سید محمد فراقی سے منسوب ہے:

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا، تو کیا کرتا
محمدؐ کی گلی فرتا، فنا ہوتا، تو کیا کرتا

دوسرا مستند نعت گو شاعر، جو صاحب دیوان گذرا ہے، محمد قلی قطب معانی ہے:

اسم محمدؐ تھے جگ میں اہے سو خاقانی مجھے
بندہ نبی کا جسم اہے بخشی ہے سلطانی مجھے

اس کے علاوہ ولی دکنی سے لے کر ستار وارثی تک نعتیہ موضوع پر اشعار رقم

ہوتے رہے۔ علامہ اقبال نے عشق رسول ﷺ کو اپنے پیام کا محور بنایا اور مخصوص انداز اور عنوان سے نعتیہ اشعار کہے۔ "بانگ درا" کی نظم "بلال" میں ان کے عشق دیدار حضور ﷺ کو پیش نظر رکھ کر جسے بلالؓ عین عبادت جانتے اور کبھی اس عبادت سے سیر نہیں ہوتے تھے فرماتے ہیں:

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

رؤف عبدالمتین نے سچ کہا ہے:

سروقد دیکھے ہیں تاریخ نے لاکھوں لیکن
قد کسی کا بھی تیرے قد سے نہ اونچا نکلا

جمال محمد ﷺ میں حضورؐ کے خدوخال، رنگ و چال، لب و دہن، رخسار و بینی، چشم و گوش، زلف و ریش، دست و پا، خوشبوئے بدن اور دیگر ظاہری حسن لامحدود کو محدود الفاظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ اسی لیے تو کہا گیا ہے:

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیکن اس کو محدود سمجھ کر کسی شاعر نے کہا:

آپ کے اور محاسن بھی ہیں بے حد و شمار
حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا کے سوا

اصغر گونڈوی کہتے ہیں:

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود

حسین سروش نے کہا ہے:

تخلیق ازل خود ہی جس حسن پہ نازاں ہو
اے کاش کوئی دیکھے وہ جلوہ انساں

مشہور مرثیہ اور نعت گو شاعر عاصی کرنالی کہتے ہیں:

نگاہ! دیکھ کہ ہے روبرو دیار جمال

ہے ذرہ ذرہ یہاں آفتاب کیا دیکھوں؟

میر انیس نے آپ کے جلوے کا نقشہ یوں کھینچا ہے

روشن تھے بام و در رخِ روشن کے نور سے
آئینہ بن گئی تھی زمیں تن کے نور سے
گیسو تھے وہ مفسر واللیل اذا سجیٰ
رخ سے عیاں تھے معنی والشمس والضحیٰ
وہ ریش پاک اور رخِ سرورِ انبیا
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآں کھلا ہوا

گیسوئے مبارک اور رخِ پرنور پر آخری تاجدار دہلی شاہ ظفر کا کلام دیکھیے

واللیل ترے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا
والشمس ہے ترے رخِ پرنور کی قسم

امیر مینائی کی صلی اللہ علیہ وسلم نعت کس نے نہیں سنی فرماتے ہیں:

سرو خراماں چہرہ گلستاں جبہ تاباں مہر درخشاں
سنبل پیچاں زلف معنبر صلی اللہ علیہ وسلم

محسن کاکوری کا نام اردو نعت گوئی میں بہت اہم ہے۔ آپ نے حضور کا سراپا خاص طریقہ پر اپنے ''مسدس سراپائے رسول اکرمؐ'' اور ایک اور نعت بشکل مثنوی ''چراغ کعبہ'' میں رقم کیا ہے جو صفتوں کی کثرت تلمیحات کی بھرمار اور اقتباسات کی وجہ سے اپنا جمالیاتی حسن بڑی حد تک کم کر چکا ہے:

حقا کہ وہ جسم سر سے تا پا
ہے شاہد غیب کا سراپا
کھینچی باکمال حسن تدبیر
نقاش ازل نے اپنی تصویر
گل خوش رنگ رسولِ مدنی و عربی
زیب دامان ابد طرۂ دستار ازل

حافظ منیر کے دو شعر دیکھیے:

صورت نبی کی خواب میں گر دیکھ پائیں ہم

سوتے ہوئے نصیب کو اپنے جگائیں ہم

ہے آیۂ رحمت خط رخسار محمدؐ
لولاک لما جبہ و دستار محمدؐ

اردو شاعری میں جس طرح مولانا احمد رضا بریلوی نے نعتیہ کلام میں جمال محمدؐ اور سراپائے محمدؐ بیان کیا ہے کوئی اور شاعر اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ مولانا نے حضورؐ کا سراپا، زلف سے ناخن پا تک، بڑے ہی دلکش انداز میں لکھا ہے جو اغلب نعتیہ محفلوں کی گرمی اور روشنی تصور کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کے قد، دہن، ریش، لب، تبسم اور عرق بدن پر اشعار ملاحظہ کیجیے

طائران قدسِ جس کی ہیں قمریاں
اس سہی سرو قامت پہ لاکھوں سلام
وہ دہن جس کی ہر بات وحی خدا
چشمہ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام
خط کی گرد دہن وہ دل آرا پھبن
سبزہ نہر رحمت پہ لاکھوں سلام
ریش خوش معتدل مرہم ریش دل
ہالہ ماہ ندرت پہ لاکھوں سلام
جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑے
اس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام
شبنم باغ حق یعنی رخ کا عرق
اس کی سچی براقت پہ لاکھوں سلام

ابرو، چشم، زلف، خوشبوئے بدن اور ایڑیوں سے ناخن پیر تک توصیف دیکھیے:

ہے جلوہ گہ نور الٰہی وہ رو
قوسین کے مانند ہیں دونوں ابرو
آنکھیں یہ نہیں سبز مژگاں کے قریب
چرتے ہیں فضائے لامکاں میں آہو
چمن طیبہ میں سنبل جو سنوارے گیسو

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟

نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خان بہادر غالبؔ سے کون واقف نہیں۔ ۱۷۹۷ء میں آگرہ (اکبر آباد) میں پیدا ہوئے۔ ۷۳ سال عمر پائی اور ۱۸۶۹ء میں دہلی میں دفن ہوئے۔ خاندانی نسب افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا تھا حسب مغلیہ تھا اور کسب صدیوں سے سپاہ گری تھا۔ خود فرماتے ہیں:

غالبؔ از خاکِ پاکِ تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آپ کے دادا سمرقند سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے اور جاگیر و مقام حاصل کیا۔ آپ کے والد عبداللہ بیگ خان دہلی میں طوائف الملوکی کے ہنگامے کے بعد پہلے لکھنو گئے اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوئے پھر حیدر آباد دکن گئے اور نظام علی خان بہادر کی سرکار میں شامل ہوئے۔ چند سال بعد وطن لوٹے اور راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی اور کسی معرکے میں مارے گئے۔ اس وقت غالبؔ کی عمر پانچ سال تھی چنانچہ شفیق چچا نصر اللہ بیگ خان نے سرپرستی کی لیکن چار سال بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔ ابھی تک غالبؔ کی زندگی عیش و راحت میں گذر رہی تھی۔ چچا کے انتقال پر لاکھوں روپوں کی جائیداد اور جاگیر کے وارث ہوئے لیکن زمانے کی نیرنگیوں نے اس وسیلے کو چھین لیا چنانچہ معمولی سے گذارے پر گذر ہونے لگی۔ ۱۸۲۶ء میں کلکتہ پہنچ کر استغاثہ کیا اور اڑھائی سال بعد ناکام واپس ہوئے۔ اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ نے سالانہ ۵۰۰ روپے وظیفہ مقرر کیا تھا جو دو سال بعد سلطنت کے ختم ہونے پر ختم ہو

گیا- دہلی کے شاہ ظفر نے سات سال تک معمولی مدد کی- آخر میں رامپور کے نواب نے ایک سو روپے کا ماہانہ مقرر کیا- قصہ مختصر غالب کو ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبی میں زندگی بسر کرنی پڑی- چونکہ طبیعت بلا کی شوخ تھی ہر غم کو ہنس کر غلط کر دیتے- کبھی دل کو یہ کہ کر بہلا لیا:

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

اور کبھی شعر میں رازِ درون کو یوں بیرون کر دیا:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

دس برس کی عمر میں شاعری شروع کی- ۱۳ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش کی بیٹی امراؤ بیگم جن کی عمر ۱۱ سال تھی شادی کی جو آخری عمر تک غالب کے گلے کا ہار بنی رہی چنانچہ غالب اپنے شاگرد امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے مرنے پر کہتے ہیں: ''اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے-'' غالب کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے لیکن سب ایک دو سال جی کر مر گئے- غالب نے فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم آگرے کے ایک جگت استاد محمد معظم سے حاصل کی- ایک ایرانی شخص عبدالصمد سے جو دو سال غالب کے ساتھ رہا فارسی زبان اصطلاحات اور محاورات سیکھے- مرزا غالب نے پہلے اپنا تخلص اسد رکھا جو نام کی نسبت اسد اللہ سے تھا لیکن جب کسی مشاعرے میں یہ معلوم ہوا کہ ایک معمولی شاعر کا تخلص بھی اسد ہے تو فوراً اسی دن ۱۸۲۸ء میں حضرت علی کے لقب اسد اللہ غالب کی مناسبت سے تخلص غالب اختیار کیا کیوں کہ بقول محمد حسین آزاد غالب عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے-

غالب کا اصلی جوہر انفرادیت تھا- وہ ایک منفرد شخصیت اور خصوصیت کے مالک تھے- جس زمانے میں ہر شخص اردو پر سر دھنتا تھا اس وقت وہ فارسی کی قلمیں لگا رہے تھے- جس دور میں شعرا اپنے کو اردو شاعر کہتے ہوئے اتراتے تھے غالب اردو سے کتراتے اور فارسی نظم و نثر کو اپنا فخر سمجھتے تھے- جہاں لوگ درباری مدح و ثنا کو مایہ افتخار سمجھتے تھے

غالب اسے سایہ ننگ و عار جانتے تھے- جہاں سلیس اور آسان لفظوں میں شعر کہنا صنعت سمجھا جاتا' وہاں غالب ندرت خیال اور مشکل بیان کو ترجیح دیتے تھے- خود کہتے ہیں:

مشکل ہے' زبس' کلام مرا' اے دل!
سن سن کے اسے' سخنوران کامل
آسان کہنے کی' کرتے ہیں فرمائش
''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل''

غالب کے ہم عصر اردو پن پر سراہ رہے تھے' تو غالب فارسی زدگی پر ناز کر رہے تھے- انفرادیت' لباس اور حلیے میں بھی ملحوظ رکھی- خود لکھتے ہیں: ''یہ یاد رکھیے' اس بھونڈے شہر (یعنی دہلی میں) ایک وردی عام ہے- ملا' حافظ' بساطی' نیچہ بند' دھوبی' سقہ' بھٹیارہ' جولاہا' منہ پر داڑھی اور سر پر لابے بال' لیکن میں نے جس دن داڑھی رکھی' اسی دن اپنا سر منڈایا''- اسی طرح غالب' عام لوگوں سے جدا' لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی پہنتے تھے اور ہزاروں کے مجمع میں فوراً شناخت کیے جاتے تھے- ۱۲۷۷ہجری میں جب دہلی میں شدید وبا (ہیضہ) پھیلی اور ہزاروں لوگ مر گئے' تو اس کا حال اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے خط میں لکھتے ہیں: ''میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لیے لائق نہ سمجھا- واقعی اس میں میری کسر شان تھی-'' یعنی غالب' عوام کے ساتھ مرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے- اردو ادب کے چار عظیم شعرا میں میرتقی' میر انیس اور علامہ اقبال نے اپنے اپنے دور میں کسی نہ کسی کو اپنا استاد بنایا اور اپنے ابتدائی دور میں ان سے فیض حاصل کیا' لیکن مرزا غالب وہ تنہا عظیم شاعر ہیں' جنھوں نے کبھی شاگرد کی حیثیت سے' کسی کے سامنے اپنا زانو خم نہیں کیا- علمائے ادب اور محققین نے اشارات کیے ہیں کہ مرزا غالب بعض اوقات علوم عروض و قواعد و نحو میں مصطفیٰ خان' شیفتہ سے مشاورت کرتے تھے' لیکن بہرحال' کسی کے کبھی بھی شاگرد نہ رہے-

یہ بھی عجیب ہے کہ غالب نے اپنے کو ہمیشہ فارسی کا شاعر جانا' لیکن آج سارے جہان میں غالب کی پہچان' آن بان سب اردو شاعری اور نثر سے باقی ہے- غالب اپنی فارسی شاعری پر فخر کرتے اور اسی کی وجہ سے زندہ و جاوید رہنے کی امید رکھتے

تھے:

غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را کتاب ایزدی ایں بودے

یعنی اگر شاعری دین ہوتا تو میرا دیوان اس کی آسمانی کتاب ہوتا۔ کہیں کہتے ہیں:

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یعنی میرا ستارہ میرے مرنے کے بعد چمکے گا اور میری شاعری کی شہرت دنیا میں میرے بعد ہوگی۔ غالبؔ نے پہلے عبدالقادر بیدلؔ کے رنگ تخیل میں شعر کہنا شروع کیا:

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدلؔ پسند آیا
طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پچیس سال کی عمر تک غالبؔ پر بیدلؔ کی نازک خیالی اور مشکل پسندی سوار رہی ہے اور غالبؔ اس امتحان میں کوئی خاص امتیاز پیدا نہ کر سکے‘ چنانچہ بعض دوستوں‘ جن میں مفتی صدر الدین قابل ذکر ہیں‘ ان کی نصیحتوں پر عمل کر کے اپنے رنگ کو بدلا اور پھر فصاحت و بلاغت‘ سلاست و روانی‘ بیان اور مضمون آفرینی کی جولانیاں دکھانے لگے اور زمانے میں ابھرنے لگے لیکن ابھی بھی ان کی زبان پر نعرہ وہی تھا:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

یعنی اگر نقش رنگی دیکھنا ہے تو فارسی کلام دیکھو کیوں کہ اردو کا میرا مجموعہ بے رنگ ہے۔

ناظم ہروی نے ایک نظم میں مشاہیر شعرائے فارسی کی نام بنام مدح کی ہے اور انھیں استاد فن ٹھہرایا:

ز خسروؔ چوں نوبت بہ جامیؔ رسید

ز جامی سخن را تمامی رسید

غالبؔ نے فارسی سخن تمام کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا:

ز جامیؔ بہ عرفیؔ و طالبؔ رسید
ز عرفیؔ و طالبؔ بہ غالبؔ رسید

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں بھی مقطع میں غالبؔ نے اپنے نام کو استعمال کیا ہے، وہ شعر قدرتی طور پر بلند، مشہور اور معروف ہوا۔ چند مقطعے ملاحظہ کیجیے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں، خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

پانی سے، سگ گزیدہ ڈرے جس طرح، اسدؔ!
ڈرتا ہوں آئینے سے، کہ مردم گزیدہ ہوں

غالبؔ! ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو، جز مرگ، علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، سحر ہونے تک

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو، غالبؔ! یہ خیال اچھا ہے

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت، غالبؔ!

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ بغیر لطیفے کے بیان غالب نا تمام ہے- ایک دن مرزا صاحب کے ایک رشید شاگرد نے کہا کہ حضرت! میں آج امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا- مزار پر کھرنی کا درخت ہے- اس کی کھرنیاں دل کھول کر کھائیں- کھرنیوں کا کھانا تھا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا- دیکھیے تو میں کتنا فصیح ہو گیا ہوں- مرزا نے کہا: ارے میاں! تین کوس کیوں گئے میرے پچھواڑے میں جو پیپل کا درخت ہے اگر اس کی پیپلیاں کھا لیتے تو تمہارے چودہ طبق روشن ہو جاتے-

آخر میں غالب ہی سے مدد لیتے ہوئے ہم بھی یہی کہتے ہیں:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

☆.....☆.....☆

ضمیر جعفری

لاشعوری احساس کا باشعور شاعر

جناب سید ضمیر حسین شاہ معروف بہ ضمیر جعفری ' یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو ضلع جہلم کے موضع چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد سید عبدالخالق' تقریبا چار سو سال قبل ایران سے ملتان آئے اور جس مقام پر سکونت اختیار کی' اس کو چک عبدالخالق کہتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے بھی ایک منفرد گاؤں ہے کہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی نہ یہ گاؤں پھیلا اور نہ اس کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ ضمیر جعفری کے پرنانا سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ' پنجابی پوٹھواری کے مقبول شاعر تھے۔ اسی علاقے کے دوسرے مشہور صوفی شاعر سیف الملوک بھی گذرے ہیں۔ پیر سید محمد شاہ کے ابیات اکٹھے کر کے ''من کے تار'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے اور اس کا منظوم اردو ترجمہ خود ضمیر صاحب نے کیا ہے۔ بقول موصوف: میرے شعری شعور کی چنگاری پیر سید محمد شاہ کی شاعری سے پھوٹی' جسے میں بچپن سے اپنی ماں سے سنا کرتا تھا۔ ضمیر جعفری نے ۱۹۳۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران فوج میں بھرتی ہوئے۔ جس ہیڈ کوارٹرز سنگاپور میں مشغول کار ہوئے' اس میں کرنل فیض احمد فیض' میجر چراغ حسن' کیپٹن ن م راشد' میجر آغا بابر' کرنل مسعود' کمانڈر حسن عسکری جیسے ممتاز اہل قلم حضرات شامل تھے۔ ۱۹۴۹ء میں ملٹری سے استعفیٰ دے کر مختلف روزنامہ جات کی مدیریت اختیار کی' لیکن پھر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۵ء تک' فوج میں برسر خدمت ہوئے اور میجر کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ تقریبا پندرہ سال تک پاکستان کے مختلف ترقیاتی اداروں کی سرپرستی کی اور کئی مقامات پر بحیثیت ڈائریکٹرز مشغول کار رہے۔ اگرچہ ضمیر جعفری متعدد اعزازات کے حامل ہیں لیکن جو قابل ذکر ہیں' ان میں ۱۹۳۶ء کا ہمایوں گولڈ میڈل ہے' جسے جناب عبدالقادر نے عطا کیا۔ یہ تمغا موصوف کی نظم ''گاؤں کی ایک شام'' پر عطا کیا گیا۔

۱۹۶۷ء میں تمغا قائد اعظم آپ کی حسن خدمت اور ۱۹۸۵ء میں صدارتی تمغا آپ کی حسن کارکردگی پر دیا گیا- اس کے علاوہ موصوف نے اکبر الہ آبادی ایوارڈ' مع خطیر رقم' بطور احتجاج بھارتی ظلم کشمیر لینے سے انکار کر دیا- موصوف تقریباً ۴۵ عدد کتب کے مولف اور مصنف ہیں اور آپ کا کلام پاکستان کے تمام صوبوں کے نصاب میں شامل ہے- موصوف کا شمار اسلام آباد کی پہلی اینٹ رکھنے والے اشخاص میں ہوتا ہے- آپ نے اس شہر کے حسن کو دوبالا کرنے میں بڑی سخت محنت کی اور کئی مقامات کو خوبصورت ناموں سے موسوم کیا- موصوف کے گاؤں چک عبدالخالق کو شہر سے ملانے والی سڑک کو آپ ہی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے- موصوف کے بڑے فرزند احتشام ضمیر پاکستان میں فوج کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں' اور دوسرے فرزند امتنان ضمیر امریکہ میں مقیم ہیں- جناب ضمیر جعفری کو بچپن ہی سے ادبی' علمی' سماجی اور شعری لگاؤ تھا' چنانچہ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کی ساتویں آٹھویں جماعت سے ہی شعر کہنا شروع کیا اور اپنے سکول کے ملک الشعرا تسلیم کیے جانے لگے' چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ صحیح معنوں میں ادبی اور شعری نشوونما کالج میں ہوئی' جہاں میں نے باقاعدہ شاعری شروع کی' لیکن کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ لینے کا خیال آیا' البتہ استفادہ سب سے کیا اور اب تک کرتا ہوں- متعدد مجلّہ جات' ہفتہ وار اور روزنامہ اخبارات سے وابستگی رہی اور مدیریت کے درجے پر فائز بھی رہے' جن میں روزنامہ ''احسان'' لاہور' ہفتہ روزہ ''شیرازہ'' ہفت روزہ ''سدا بہار'' ' روزنامہ ''باد شمال'' ' ''اخبار جوان'' ' اخبار'' غالب'' قابل ذکر ہیں- آج کل بھی موصوف مختلف ہندو پاک کے مشہور مجلّہ جات کو اپنے گرانقدر قلم سے مزین کرتے رہتے ہیں اور ماہنامہ ''چہار سو'' راولپنڈی کے مدیر اعلیٰ ہیں- جناب ضمیر جعفری تقریباً چھ دہائیوں سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں- بچپن میں آغوش مادر میں اپنے پرنانا پیر محمد شاہ کے ابیات سن کر اور پھر پرائمری اسکول میں ایک باذوق استاد نور حسین وفا کے اثر کی وجہ سے ذہن میں شاعری کی شمع ایسی روشن ہوئی کہ مشرق و مغرب کو روشن کر دیا- ابتدا سنجیدہ شعر کہے لیکن طبیعت کا میلان چونکہ ظرافت کی طرف تھا' پھر ہائی سکول اور کالج میں مزاحیہ شاعری کو قبولیت اور اہمیت حاصل ہوئی' تو رجحان بیشتر طنز و مزاح کی طرف ہی رہا' اگرچہ طنز و مزاح کے پس پردہ آپ کے ضمیر کی آواز صاف سنائی دیتی رہی' متین اور سنجیدہ' چنانچہ خود موصوف فرماتے ہیں کہ میں تو مزاحیہ شاعری کو سنجیدہ ہی سمجھتا ہوں' کیوں کہ اس کی بنیاد

بھی تو آنسوؤں پر ہی ہے یہ مسکراتے ہوئے آنسو ہیں- آزاد شاعری کے بارے میں ضمیر صاحب فرماتے ہیں کہ تازہ ہوا کے بغیر ادب بھی پودے کی طرح سوکھ جاتا ہے- آزاد شاعری نے اپنی اہمیت کو منوالیا ہے اور یہ ادب کی ضروریات میں سے ہے-

جناب ضمیر جعفری نہ صرف ایک مقبول شاعر نثر نگار کالم نویس اور بذلہ سنج شخصیت ہیں بلکہ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پنٹون (Ponton) کا اردو میں ترجمہ کیا اور جب آپ نے پنٹون کو پنجاب کے ماہیا اور سرحد کی موسیقی و آہنگ کے ساتھ ملایا تو اس میں کمال پیدا کر دیا- پنٹون ملایا اور انڈونیشیا کی شاعری میں اظہار خیال کی مقبول ترین صنف کا نام ہے- یہ ایک ایسا قطعہ ہوتا ہے جس کا پہلا اور چوتھا مصرع اور دوسرا اور تیسرا مصرع آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں- جناب ضمیر جعفری کا تخلیق کردہ ایک پنٹون ملاحظہ کیجیے:

بعد مدت آج بہت کم! تیری یاد آ گئی
جیسے گھر جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ
جیسے مایوسی میں لب پر دفعتاً آ جائے راگ
یا کوئی مچھلی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

جناب ضمیر جعفری ۴۵ سے زیادہ کتابوں کے خالق ہیں- متعدد شعری مجموعوں میں ''جزیروں کے گیت'' ''مافی ضمیر'' ''میرے پیار کی زمین'' ''ولایتی زعفران'' (انگریزی نظموں کا ترجمہ) ''من میلہ'' ''متاع ضمیر'' ''زبور وطن'' ''مسدس بدحالی'' ''کارزار'' ''لہو ترنگ'' ''قریہ جاں'' ''ارمغان ضمیر'' اور ''ضمیریات'' قابل ذکر ہیں:

جناب فرمان فتحپوری صاحب نے سچ کہا کہ جسے ہم سنجیدہ ظرافت نگار یا طنز و مزاح کے حوالے سے فنکار کہتے ہیں وہ اندر سے اوروں کی نسبت زیادہ حساس ہونے کے سبب زیادہ دکھی ہوتا ہے- قدیم شعرا میں نظیر اکبر آبادی اور غالب کے یہاں طنز و مزاح کے بہت حسین اور کامیاب نمونے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اپنے فکر و فن کی کامل حیثیت میں خالص طنز و ظرافت کا شاعر کہے جانے کا مستحق ہے تو وہ اکبر الہ آبادی ہیں- چونکہ شاعری سوسائٹی میں جنم لیتی ہے اور آسمان سے نازل نہیں ہوتی اس لیے ہر خطے اور ہر دور میں یہ رحمت بشکل سنجیدہ اور ظرافت ظہور پذیر ہوتی ہے چنانچہ خود ضمیر جعفری فرماتے ہیں: ''مزاح زمین کی چیز ہے ظرافت آسمانوں میں نہیں ہوتی- انسان اس

وقت بالغ ہوتا ہے جب پہلی بار اپنے اوپر ہنستا ہے''۔ چند طنز و مزاح کے اشعار جن میں حسن اور ظرافت بھری ہے' ملاحظہ فرمایئے:

تیرے کوچے میں یوں کھڑا ہوا ہوں
جیسے ہاکی کا گول کیپر ہوں

''مسدس بدحالی'':

ستارہ نظر مہ جبیں لڑ رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نشیں لڑ رہے ہیں

نہ منزل' نہ جادہ' نہ کوئی ارادہ
رضا کار کم یاب' لیڈر زیادہ

جان محفل تھا خدا بخشے! حقیر
اب تو اک مدت سے شوہر ہو گیا

میری بیوی
قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے
اور میں بھی ہوں آرام سے

میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

تھی ابھی لرزاں' فضاؤں میں ہی' بانگِ اتحاد
ہو گیا مرغوں میں برپا' ایک انڈے پر فساد

چند سنجیدہ' عشقیہ' انقلابی اور ملی اشعار ملاحظہ فرمایئے:

حسن ہر روپ میں کافر ہے' یہ مانا' لیکن
اک قیامت ہے' جوانی میں بشر کی صورت

دل میں ہر وقت کوئی شکل جمائی رکھنا
اپنے گھر کا کوئی گلدان نہ خالی رکھنا

جو بھی عورت ہے' خوبصورت ہے

یہ مری روح کی ضرورت ہے
بادشاہوں کو کہیں، بے شک، نظر آیا نہیں
کون سے رستے میں درویشوں کا گھر آیا نہیں
اس کے بال و پر کو خاک و خس کی رسوائی ملی
جو پرندہ اڑ سکا اور شاخ پہ آیا نہیں
تتلیوں کے پر پہ بھی، کچھ حسرتیں تحریر تھیں
ہم کو اس املا کے پڑھنے کا ہنر آیا نہیں
مٹی رخ پر، پپڑی لب، پر چھالے ننگے پاؤں میں
چرواہا جب لے کے آیا، اپنی بھیڑیں، گاؤں میں
صدیاں، کچھ ایسے لمحوں کی بھیک پہ زندہ رہتی ہیں
مائیں دوڑیں مقتل کو اور کانپیں ہاتھ دعاؤں میں
آج کل جو صورت ایام ہے
یہ چراغوں کے دھویں کی شام ہے
یہ کس بازار میں بکنے کی خاطر آ گیا ہوں میں

جو ہر قیمت پہ گویا اپنی قیمت پا گیا ہوں میں
گمرہوں کا ہمسفر رہنا بھی اچھی بات ہے
راستے میں بے خبر رہنا بھی اچھی بات ہے
جب لفظ لبوں پہ سل جائیں
زنجیر بجاؤ پاؤں سے
سمجھو کوئی طوفان آئے گا
جب پیاس اٹھے دریاؤں سے
یہ بہت کم ہے، جہاں کی تیرگی کے واسطے
کوئی سورج اور، یا رب! روشنی کے واسطے
اپنے بیٹے احتشام کے نام:
ہم نے بچپن میں تجھے پالا، وطن کے نام پر

بارک اللہ! آج دے ڈالا وطن کے نام پر
پاک لشکر کا جواں بننا مبارک ہو تجھے
اپنا پرچم تھام کر چلنا مبارک ہو تجھے

زندگی کا اس سے بڑھ کر بانکپن کوئی نہیں
تیری وردی سے مقدس پیرہن کوئی نہیں
مقتول کے لہو سے گلابی ہوئی ہیں
قاتل کے پاس کچھ نہیں شمشیر کے سوا
حریت ضمیر سے جینے کے واسطے
کیا راستہ ہے اسوہ شبیرؑ کے سوا
رہنے کے اب اس شہر میں ڈھنگ نہیں ہیں
سفاک بہت پھرتے ہیں اور سنگ نہیں ہیں
رشتے باہم بڑھتے ہیں، کم چلنے والی گلیوں میں
شہر میں جتنی بھیڑ بھرو گے اتنی ہی تنہائی ہو گی

میں نے دانستہ طور پر کئی دیگر عنوانات پر روشنی نہیں ڈالی، جس پر ایک تفصیلی گفتگو درکار ہے، جس میں موصوف کی پنجابی شاعری، تصوف، زندگی اور انقلابی حرکتیں شامل ہیں۔

☆......☆......☆

لذت گفتار کی سحر آفرینی

شاعر کے لغوی معنی کچھ بھی ہوں، لیکن اس کے شعری معنی صرف خیال تراش یا خیال نگار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ شاعر، فکر و خیال کے آسمانوں میں آزادانہ پرواز کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو فن کے زندان میں بند رکھتا ہے۔ چونکہ فکر و خیال لامحدود ہیں اور اس کا اظہار محدود، اور پھر محدودیت کی حدیں ہر شخص کی فنی قدرت پر مشتمل ہوتی ہیں، اس لیے ہر شاعر کے اظہار خیال کا معیار جدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر جو کچھ بھی کہتا ہے، وہ اپنی جگہ اہم ہوتا ہے، لیکن وہ بات کس طرح کہتا ہے، یہ بھی کوئی کم اہم بات نہیں ہے۔

فیض احمد فیض لکھتے ہیں کہ فن کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے تو غالب دیدہ بینا بھی کافی نہیں ہے۔ چونکہ شاعر کو قطرے میں دجلہ نہ صرف دیکھنا پڑتا ہے بلکہ دوسروں کو دکھانا بھی پڑتا ہے۔ قطرے میں دجلہ کا مشاہدہ اس کے دیدہ بینا پر ہے اور دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر ہے، اور اگر اس کے نطق و لب نے اس کی یاوری نہ کی تو پھر شاعر اپنے فن میں پوری طرح سرخرو نہیں ہوتا۔ یہی نطق و لب کی یاوری دراصل شاعری کی دلکشی کی ضامن ہوتی ہے۔ شعر درحقیقت شاعر کے خیال اور اظہار خیال کا سنگم ہوتا ہے۔ شاعری صرف علم عروض کی بندشوں کا نام نہیں، بلکہ ارض و سما کی راہ نوردی کا نام ہے۔ شاعری قافیہ پیمائی نہیں بلکہ قافیہ نگاری اور معنی آفرینی ہے، بحر گنجی اور کوزہ گری نہیں، بلکہ کوزے کو سمندر میں بند کرنا ہے، بادہ و ساغر کی شعبدہ گری نہیں بلکہ مشاہدہ حق کی گفتگو ہے۔ شاعری بچوں کا کھیل نہیں، بلکہ بچوں سے کھیلنا ہے جو بڑا دشوار کام ہے۔

رسم رونمائی اردو ادب میں زیادہ قدیم نہیں، بلکہ صرف ۳۰-۳۵ سال سے رائج ہے، لیکن کیوں کہ پسندیدہ عموم رہی اس لیے بڑی تیزی سے مقبول ہوئی۔ آپ اس کو بدعت سخن کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اسلاف سخن نے اسے نہیں برتا، لیکن چونکہ شاعری پیغمبری ہے اس لیے ہر شاعر، جو پیغمبرانہ صفات کا حامل ہو، اپنی سنت سخن کو قائم کر سکتا ہے اور اپنے

دیوان کو اپنا مصحف نطق و بیان بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ اردو ادب میں پہلے شعرا کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ آج سے کوئی ڈھائی سو سال قبل ۱۷۵۲ء میں میر تقی میر نے پہلا عظیم ''تذکرہ نکات الشعرا'' لکھا۔ پھر ۱۸۸۹ء میں محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' جیسا معروف تذکرہ اور تبصرہ قلمبند کیا۔ ۱۷۵۲ء سے ۱۸۸۰ء تک یعنی اس ۱۳۰ سال کے عرصے میں اردو ادب میں ستر سے زیادہ تذکرہ ہائے شعرا نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل سے تنقید، تبصرہ اور تقاریر کا عمل تذکروں میں زیادہ نظر آنے لگا۔ اغلاط کی تلاش اور ذہنی تعصب کی چھاپ، فن تنقید کا اصلی جوہر بنی۔ ادب کے دامن رنگین کو تنقید کے نشتر سے چھلنی کرنے کا حوصلہ ہر کس و ناکس میں ابھرنے لگا اور گلشن شاعری کا ہر پھول تنقید و تعصب کی نوک پر خار سے پتی پتی ہونے لگا۔ چونکہ یہ رویہ سازش اور ذہنی تعصب اور اپنے ہواداروں کی طرف داری کے لیے اردو ادب کے نام نہاد مفتیوں کا آلہ کار بنا اور غالب کے مشہور شعر کا مصداق ہوا:

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

تو ادب کے دلسوز علما نے پھر غالب ہی کے مصرعے سے مدد لیتے ہوئے کہ ''ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں'' اس کا حل تلاش کیا اور اس طرح ایک شاعر کے مجموعہ کلام پر مختلف شخصیتوں اور مختلف ناقدین فن سے کسب مشورہ اور اظہار خیال کو جمع کر کے بصورت گلدستہ رونمائی پیش کیا، اور ہر شخص کی فکر سنجی کو اس کی قدرت فکری کی کسوٹی پر تولا گیا۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

رونمائی میں دراصل کلام کی نکہت اور صاحب کلام کی شخصیت کی عظمت شامل ہیں ... بھی ... [illegible]

تبصرے اور مقالات، رونمائی کی محفلوں میں رونما ہوتے ہیں، ان کی نوعیت تین طرح کی ہوتی ہے۔ پہلی شکل، جو آسان ہے، اس لیے رواج عام بنی، وہ کسی مجموعے کا مطالعہ کیے بغیر تبصرہ کرنا ہے جس کے لیے مقرر چند خاص لفظوں یا محاوروں سے اپنا نمائش کرتا ہے اور قاری اور صاحب کلام کو نہ صرف سبز باغ دکھاتا ہے بلکہ خود بھی دیکھتا ہے۔ دوسری نوعیت، جس میں کتاب کا مطالعہ تو شامل ہے لیکن صاحب کلام کی شخصیت سے بے بہرہ ہے، چنانچہ اس میں مبصر کا ذاتی تعصب اور اس کی حد فکر، صحیح مطالب تک پہنچنے نہیں

یتی- تیسری نوعیت وہ ہے جس میں کلام کا مطالعہ اور صاحب کلام کی شخصیت سے واقفیت شامل ہیں' جو اگرچہ کہ مشکل اور دشوار راہ ہے لیکن موردِ تائید ہوتی ہے اور جس سے شاعر کو بڑی حد تک صحیح اندازہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے محاسن و عیوب کا بھی پتا چلتا ہے اور جس کا فائدہ زادِ راہ بن کر منزل تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے- ہر وہ شخص' جس میں شعریت موجود ہو' لازم نہیں کہ شاعر بھی ہو' اور ہر وہ شخص' جو شاعر کہلائے' لازم نہیں کہ شعریت کا حامل ہو- شاعر اور متشاعر کے مابین چار حروف مشترک اور دو حروف مختلف ہیں- متشاعر کا مصدر اور سبب بھی شاعر ہی ہے اور یہ شاعر نوازی اور بندہ پروری سے حاصل ہوتا ہے- بہرحال' یہ بحث متنازع ہے اور متنازع بحث میرا مسلک نہیں' چونکہ مرا عقیدہ تو ہمشیر غزل حضرت حافظ شیرازی کے اس مصرعے پر ہے کہ:

در طریقت ما جز دل آزاری گناہی نیست

جس طرح کسی تخم کی نشوونما کے لیے پانی' غذا اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسے ہی یہ عوامل میسر ہوتے ہیں' تخم کا Genetic effect فوری Phenotypic Shape اختیار کر لیتا ہے' یعنی تخم' درخت بن جاتا ہے' اسی طرح اگر شعریت رگ و پیکر میں ہو گی تو ماحول کے سازگار ہوتے ہی قدرتِ شاعری ظاہر ہو گی' اور جس کے لیے عمر سات سے ستر برس بھی ہو سکتی ہے- حسن کا مدعا ظہور ہے' چونکہ جب حسنِ مطلب خدا متعال نے یہ صورت اختیار کی تو حسنِ فانی کس طرح اس سے روگردانی کر سکے گا- صاحبِ جشن جناب باقر زیدی کو شعری نمو نسل در نسل خون کی رنگت میں ملی- آپ کے پردادا امیر اصغر حسین بصیرؔ آپ کے دادا سید اکرام حسین کلیمؔ اور آپ کے والد سید فرزند حسن زیدی' صاحبِ بیاض اور سر شناس شعرائے وقت تصور کیے جاتے ہیں- موصوف کو شعری ذوق نے مطالعہ اور شعر و سخن کی محفلوں میں سرگرم رکھا لیکن فکرِ معاش' خیالِ خانوادہ اور غمِ روزگار نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے اظہار سے دور رکھا اور جیسے ہی ان مسائل سے ذرا سی فرصت ہوئی' تھوڑی مدت میں یہ بیج ایک تنومند شجر کی صورت اختیار کر گیا' اور ایسے ثمر دیئے' جس کی لذت کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہر شخص کی گفتار میں لذت محسوس ہونے لگی' اور اس لذتِ گفتار سے اردو ادب کے سبد میوہ جات میں آج ایک اور لذیذ ثمر کا اضافہ ہوا- تقریباً ایک ہزار اشعار پر مبنی یہ مجموعہ کلام' جو ۷۲ غزلیات پر مشتمل ہے قارئین کو بڑی حد تک صاحبِ کلام کے کلام سے روشناس کرانے کے لیے کافی

ہے۔

اردو شاعری میں غزل کی دو خاص روایتیں ملتی ہیں، ایک وہ جو فکر و خیال کی بلندیوں سے تخلیق ہوتی ہیں اور فکر و خیال ہی اس کا جوہر اصلی ہوتا ہے، دوسری روایت جس میں فکر و خیال سے زیادہ زبان اور زبان کو برتنے کا سلیقہ اپنا جادو جگاتا ہے اور غزل کے پیکر میں چار چاند لگاتا ہے۔ لذت گفتار میں ان دونوں دبستانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں پر فکر و خیال کی بلندی کے ساتھ ساتھ زبان کو برتنے کے سلیقے سے خاص فائدہ اٹھایا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب جنبش نے بڑی مدت تک ادب و شعر کا وسیع مطالعہ کیا اور علم سے تجہیز ہو کر میدان شاعری میں قدم رکھا اس لیے شاعری کے زینے طے کیے بغیر استاد کے عہدے پر فائز ہوئے خود لکھتے ہیں:

نقد سخن تھے صرف سخنہار ہم نہ تھے
غالب کے قدر دان تھے طرفدار ہم نہ تھے
ایسا نہیں ہوا کہ سردار ہم نہ تھے
مانا کہ اس قبیلے کے سردار ہم نہ تھے

قبیلۂ سخن کے سرداروں کی آنکھیں جب اس نوخیز آفتاب سخن کی روشنی سے چکاچوند ہونے لگیں تو ان شعاعوں کے سفر کی رفتار کو روکنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کا نتیجہ جو بھی ہوا، وہ ان اشعار سے ظاہر ہے:

بند ہمیں ہم کو کسی حال گوارا ہی نہیں
ہم تو وہ لوگ ہیں، دیوار کو در کرتے ہیں
دل پہ کرتے ہیں، دماغوں پہ اثر کرتے ہیں
ہم عجب لوگ ہیں، ذہنوں میں سفر کرتے ہیں
وقت کی تیز خرامی ہمیں کیا روکے گی
جنبش کلک سے صدیوں کا سفر کرتے ہیں

پھر اپنے کلام پر ارباب سخن کو چیلنج کرتے ہوئے اس طرح داد لی:

تذکرہ میر کا غالب کی زباں تک آیا
اعتراف ہنر ارباب ہنر کرتے ہیں

علم عروض کے بانی خلیل ابن احمد لکھتے ہیں کہ خیال اور اظہار خیال کا رشتہ اتنی

طرح سے ہے جیسا پانی اور پیالہ- اگر پانی کو کوزے کے بجائے چاندی اور سونے کے پیالے میں پیش کیا جائے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے یعنی اگر شاعر اپنے خیال کو بلند اور عظیم لفظوں میں بیان کرے تو اس کی منزلت بڑھ جاتی ہے لیکن اس فلسفے کی مخالفت فارسی عروض کے محرک جناب جامی نے اس طرح کی کہ پیالہ خواہ مٹی کا ہو یا سونے اور چاندی کا پانی کا خوشگوار ہونا بہت ضروری ہے بدمزہ پانی کو سونے کے پیالے میں بھی خوشگوار نہیں بنایا جا سکتا ہاں اگر خوشگوار پانی کو جام طلائی میں پیش کیا جائے تو اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے- اس مسئلے پر باقر زیدی نے کس کمال سے چند اشعار نظم کیے ہیں ملاحظہ کیجیے:

ہنر کا حسن تھا جام سفال میں بھی مگر
کمال کوزہ گری دست کوزہ گر میں رہا
کسی کی ہم نشینی سے کبھی فطرت بدلتی ہے
چمن میں خار بھی رہتا ہے اور پھولوں میں پلتا ہے
کہیں جا کر مرے کردار کی صورت نہیں بدلی
کہ آئینہ بدل جانے سے کب چہرہ بدلتا ہے

لذت گفتار میں اخلاقی قدریں نمایاں طور پر ظاہر ہیں- آج کل کے شاعر شعوری یا لاشعوری طور پر ناصح یا مصلح کا منصب اختیار کر رہے ہیں بعض شعرا تو اپنا منہ ہی آدرش سے کھولتے ہیں- اولاً آدرش شاعر کے لیے ضروری نہیں اور اگر بہ فرض محال ہو بھی تو بڑے شعرا کے منہ سے اچھا لگتا ہے- باقر زیدی کے انداز بیان میں یہ نقص نظر نہیں آتا وہ تو اخلاقی اقدار کو بھی اپنے لیے ہی بچا لیتے ہیں- ملاحظہ کیجیے:

صرف چہرے برے نہیں ہوتے
عیب کردار میں بھی ہوتا ہے
ہم تو سبزہ بچا کے چلتے ہیں
لوگ دل پائمال کرتے ہیں
ہماری بات نہ پوچھو عجیب لوگ ہیں ہم
کہ شاخ خشک پہ تازہ گلاب مانگتے ہیں
مذہبی بحث ہے عبث ہم سے

مسئلہ یہ ہمارا ذاتی ہے

''لذت گفتار'' میں بیشتر غزلیں چھوٹی بحر سلیس زبان کو کمترین اضافات سے ڈھلی ہیں۔ مولانا حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں لکھا ہے کہ بڑے شاعر کا ادنیٰ کرشمہ دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے اور چھوٹے اور معمولی الفاظوں کو ایسے مقام پر رکھنا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ صنائع معنوی یعنی تضاد، ایہام، رجوع، لف و نشر، توجیہ، تلمیح اور صنائع لفظی یعنی تجنیس، تروم، تکرار اور ترصیع کے نمونے ''لذت گفتار'' میں فراواں نظر آتے ہیں۔ صرف تکرار پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے

رہ نمائی کرے گا راہ زن
رہ نما رہ نما ہی رہتا ہے

بے وفا سے وفا نہیں ہوتی
بے وفا بے وفا ہی رہتا ہے
کوئی اس کو خدا کہے نہ کہے
وہ خدا ہے خدا ہی رہتا ہے
محبت ہے کس کس کی دل میں نہ پوچھو
فلاں کی فلاں کی فلاں کی فلاں کی
محبت محبت محبت محبت
یہی ایک سرخی ہے ہر داستاں کی

شاعر چونکہ معاشرے کا نقیب ہوتا ہے اس لیے اس کے اشعار سے ماحول کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ میری نظر میں اگر تحقیقی طور سے قدیم شعرا کے اشعار کا تجزیہ کیا جائے تو اس زمانے کے حالات کا مکمل پتا چل سکتا ہے۔ باقر زیدی کا سفر ہجرت پور سے حیدر آباد دکن اور پھر پاکستان سے امریکہ کا مہاجرتی مشکل اور دشوار راستہ ہے۔ یہ خانہ بدوشی کی گرد ان کے اشعار کے خیال ہی پر نہیں بلکہ ان الفاظوں کے پیکر پر بھی نظر آتی ہے ملاحظہ فرمایئے:

ہم وہی بدنصیب ہیں جن کا
اک ٹھکانہ نہیں ٹھکانہ کا

اس دشت رنگ و نور میں کھوئی نہیں ابھی
سادہ سی زندگی جو دیارِ وطن میں تھی
کہاں ارضِ پاک اور کہاں امریکہ
کہاں آ کے بکھری ہے مٹی کہاں کی

ساری کمزوریوں کو دیکھیے۔

پنچھیاں ہاریوں کی گھر نہ رہیں
جب وڈیرے اگان چھوڑ گئے

میں آخر میں ''لذت گفتار'' کے اس پہلو کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں جو اغلب دیگر شعرا کے کلام میں کم نظر آتا ہے جو اسلاف سخن کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ متعدد غزلیں اساتذہ کی بحروں پر لکھی گئیں اور نئے مضمون نئے انداز سے باندھے لیکن موصوف نے اردو کے نامور شعرا کو جس طریقے سے نوازا اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ''لذت گفتار'' میں تقریباً بیس سے زیادہ شعرا کا تذکرہ ہے جس میں حافظ، میر، مصحفی، غالب، انشا، مومن، اقبال، داغ، جگر، جوش، فراق، فیض، ناصر اور ساحر وغیرہ پر شعری تبصرے ہیں جو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مماثل ہیں۔

شوخی و ندرت افکار ہے غالب کا کمال
صورت آہنگ کو دیکھو تو غزل میر کی ہے
جو خال رخ پہ لٹاتے تھے حضرت حافظ
کبھی وہ اپنا سمرقند تھا بخارا تھا
یہ زمیں مصحفی کی اچھی ہے
کچھ کی تکرار میں مزہ ہے کچھ

ہر شخص میں کسی حد تک انا اور تعلّی ہوتی ہے۔ کسی میں بقدرِ بادام اور کسی میں بقدرِ گودام اور بعض شعرا میں یہ رنگ انا روگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن بہرحال صاحب ''لذت گفتار'' بڑی حد تک ان حاشیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ کچھ اشعار میں اپنے حسب و نسب پر افتخار کیا ہے اور کیوں نہ کریں؟ سادات ہیں، سید زادے ہیں اور اولادِ پیغمبر ہونا کم امتیاز نہیں بلکہ میری نظر میں اس سے بڑھ کر کوئی امتیاز نہیں کہ اس کی اولاد کا شرف ملے جس کے بارے میں جامی نے کہا ہے ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ

مختصر:- مجھے اپنی کم مائیگی کا اعتراف ہے۔ یہ مقالہ نامکمل ہے کیوں کہ میں نے موصوف کے اس پہلو کو جو مرثیہ نگاری سے مزین ہے اور دوسری اصناف رثائی ادب پر مشتمل ہے محل و وقت کا لحاظ کرتے ہوئے روشن نہیں کیا۔ اردو ادب میں اب بھی تقریباً ۴۰-۴۵ ایسے شاعر موجود ہیں جو تقریباً ہر سال ایک نیا مرثیہ تصنیف کر رہے ہیں۔ میری نظر میں ان شاعروں اور خصوصاً شمالی امریکہ میں جناب باقر زیدی کا ایک خاص مقام ہے۔ مختصر، یہ جملہ پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رثائی ادب میں جناب باقر زیدی نے اپنے موروثی حق کا سکہ منوالیا ہے۔

اپنی نامکمل تقریر کی موصوف کے اشعار سے تکمیل کر رہا ہوں:

ہم اہل قلم، اہل نظر، اہل بصیرت
ذہنوں میں رواں صورت افکار رہے ہیں
غم خواری مظلوم ہے طینت میں ہماری
ظالم سے ہمی برسر پیکار رہے ہیں

☆......☆......☆

علامہ اقبال کی مثنوی سورہ اخلاص کا پہلا مکمل ترجمہ

اگرچہ اردو اور فارسی کے بعض شعرا نے قرآنی آیات اور احادیث کا منظوم ترجمہ کیا ہے' لیکن میرے محدود مطالعے میں' سوائے علامہ اقبال کے' کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا' جس نے قرآن کے ایک مکمل سورہ کی جامع تفسیر منظوم ترجمہ کیا ہو۔ علامہ اقبال نے ''رموز بے خودی'' میں خلاصہ مطالب مثنوی کے زیر عنوان' سورہ اخلاص کی تفسیر' ۱۱۵ فارسی اشعار میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال' احادیث اور قرآن کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کا کلام' الہیات کا آئینہ محسوس ہوتا ہے۔ علامہ نے اپنی نگارشات میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر کا بھی ارادہ ظاہر کیا تھا' لیکن صحت کی خرابی اور بڑھتی ہوئی مصروفیات نے اس خواہش دیرینہ کو مکمل نہ ہونے دیا۔ سورہ اخلاص کو جسے سورہ توحید بھی کہتے ہیں' قرآن مجید کا ۱۱۲واں' وہ عظیم' معنی و معرفت خیز سورہ ہے' جس کی بابت ابن عباسؓ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سورہ کی عظمت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور تمام معارف اصولی' فروعی اور اخلاقی اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس چار آیات کے چھوٹے سے سورہ کی تفسیر کر کے دراصل ایک تہائی قرآن کی تفسیر کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا' بلکہ اس کے سمجھنے کے لیے اس کی ترجمانی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے دور کے مشہور مفسر قرآن' آیت اللہ طباطبائی جنھوں نے ''المیزان'' میں قرآن کی مکمل تفسیر' قرآن کی آیات ہی سے کی ہے' فرماتے ہیں' قرآن مجید کا ہر لفظ مستقل اور اصل ہے اور اس کا ترجمہ' نقل اور بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر ''حمد کا ترجمہ تعریف کیا جاتا ہے' جب کہ خود ''تعریف'' لفظ عربی ہے' چنانچہ خود خدا ''الحمد'' کی جگہ ''التعریف'' بیان کر سکتا تھا' یعنی حمد کا مکمل بدل تعریف نہیں ہو سکتا' بلکہ لفظ تعریف' حمد کی کسی حد تک کہ ترجمانی کر سکتا ہے' تا کہ اس کے معنی ہماری سمجھ میں آ سکیں۔

سورہ اخلاص کی چار آیات میں خداوند عالم نے اصول' فروع اور اخلاق کے

پھر اس دریا کو جن الفاظ کے کوزوں میں بند کیا ہے ان میں چار لفظ اللہ، احد، صمد اور کفو قابل ذکر و فکر ہیں اور اسی معرفت کے دریا میں غوطہ زن ہو کر علامہ اقبال نے ۱۱۵ اشعار پر مبنی جو مثنوی لکھی اس سے ظاہر ہے کہ علامہ نہ صرف مفکر اسلام بلکہ ایک مفسر قرآن تھے۔ دیگر مفسرین اور مبصرین ان کی فکر معرفت کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے

فکر ہر کس بقدر ہمت او ست

علامہ نے سورہ اخلاص کی پہلی آیت: قل ھو اللہ احد پر ۱۸، دوسری آیت: اللہ الصمد پر ۱۵، تیسری آیت: لم یلد ولم یولد پر ۱۹ اور چوتھی آیت: ولم یکن لہ کفوا احد پر ۲۱ اشعار نظم کیے۔ اگرچہ یہ مثنوی ۸۰ سال قبل فارسی میں لکھی گئی اور منظر عام پر آئی جس کے چیدہ چیدہ دو چار اشعار کے تراجم اردو میں ہوئے لیکن یہ پہلا مکمل اردو میں ترجمہ ہے۔

۱۔ میں نے ایک رات خواب میں صدیق کو دیکھا اور ان کے راستے کی خاک سے پھول چنے۔

۲۔ وہ ہمارے مولا کا ستون، وہ ہماری وادی سینا کا پہلا کلیم ہے۔

۳۔ اس کی ہمت ملت کی زراعت کے لیے ابر کے مانند ہے اور وہ خود ثانی اسلام، غار، بدر اور قبر ہے۔

۴۔ میں نے اس سے کہا: اے اعلیٰ صفات والے عشق خاص! تری محبت تو دیوان عشق کا مطلع ہے۔

۵۔ تیرے ہاتھوں سے ہمارے کام تکمیل ہوئے ہیں، چنانچہ ہماری مصیبتوں کو حل کرنے میں مدد کر۔

۶۔ فرمایا: آخر کب تک تو لالچ اور ہوس کا غلام رہے گا، اب سورہ اخلاص سے روشنی اور حکمت حاصل کر۔

۷۔ یہ ایک نفس، جو سو سینوں میں گردش کرتا رہتا ہے، توحید کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔

۸۔ اسی کے رنگ میں رنگ جا اور دنیا میں اس کے جمال کا نقش بن جا۔

۹۔ جب تو نے اپنا نام مسلمان رکھا ہے اور شرک سے توحید کی طرف رخ کیا ہے۔

۱۰۔ کیوں اپنے آپ کو ترکی اور افغانی کہہ رہا ہے۔ تجھ پر افسوس کہ تو وہی کا وہی باقی ہے

اور اپنے کو بدل نہ سکا۔

۱۱- مختلف ناموں سے اپنے آپ کو آزاد کر یعنی صراحی پر گزارا کر اور ساغروں کو چھوڑ دے۔

۱۲- تو انہی ناموں اور گروہ بندی کی وجہ سے رسوا ہوا ہے اور کچے میوہ کی طرح درخت سے گر گیا ہے۔

۱۳- وحدت کو برقرار رکھ اور گروہ بندی سے کنارہ کشی کر اپنی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے مت کر۔

۱۴- اگر تو توحید کا پرستار ہے تو کب تک سبق گروہ بندی پڑھتا رہے گا۔

۱۵- تو نے اپنے اوپر خود اپنا دروازہ بند کر لیا ہے۔ جو باتیں تیرے ہونٹوں پر ہیں انھیں دل میں بھی اتار لے۔

۱۶- تو نے ایک ملت سے سو ملتیں بنائیں اور اس طرح خود اپنی فصیلوں پر حملہ کر لیا ہے۔

۱۷- ایک ہو جا اور توحید کا پرچار کر اور جو چیز غائب ہے اس کو اپنے عمل سے موجود کر۔

۱۸- عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان مردہ ہے جس میں عمل نہ ہو۔

۱۹- اگر تو نے اللہ الصمد سے صحیح دل لگایا تو سمجھ لے تو نے دنیا کی دامن گیر حدوں سے آزادی حاصل کر لی ہے۔

۲۰ - اللہ کا بندہ دنیا کی چیزوں کا غلام نہیں ہے اور اس کی زندگی ڈول کے مانند نہیں جو صرف بھر کر خالی ہو جاتا ہے۔

۲۱- اگر تو مسلمان ہے تو غیروں کی منت نہ کر بلکہ تمام جہان کے لیے نیکی اور اچھائی کی مثال بن جا۔

۲۲- دولت مند کے آگے اپنے روزگار کی شکایت نہ کر اور اپنے ہاتھ کو دوسروں کے سامنے مت پھیلا۔

۲۳- حضرت علی کی طرح جو کی روٹی پر زندگی بسر کر اور مرحب کی گردن توڑ کر قلعہ خیبر کو حاصل کر۔

۲۴- اہل بخشش کی منت کیوں کی جائے اور ان کے ہاں اور نہیں کے خنجر کے زخم کیوں کھائے جائیں۔

۲۵-اپنے رزق کو پست افراد کے ہاتھوں سے مت لے کیوں کہ تو یوسف کنعان ہے اس لیے خود کو سستا فروخت نہ کر۔

۲۶-اگرچہ تو ایک بے بال و پر کی چیونٹی ہی سہی لیکن اپنی حاجت حضرت سلیمان سے بھی بیان نہ کر۔

۲۷-راستہ بہت کٹھن اور دشوار ہے اس لیے اپنے ساتھ سامان کم رکھ اور چونکہ اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اس لیے تجھ کو آزاد ہی مر جانا چاہیے۔

۲۸-**سحبه اقلل من الدنيا** کو شعار کر اور **تعش حرا** سے سرمایہ دار بن (قول فاروق ہے)۔

۲۹-کوشش کر کے کیمیا بن اور خاک مت رہ!-دنیا میں اہل بخشش بن اور فقیر مت رہ۔

۳۰-اے بوعلی کے مقام کو جانے والے- ایک گھونٹ بوعلی کے جام سے بھی نوش کر۔

۳۱-تخت کیکاوس کو ٹھوکر مار دے سر کو قربان کر دے مگر غیرت اور ناموس کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

۳۲-خود بخود میخانے کا دروازہ کھل جائے گا ان بے نیازوں پر جن کے پیمانے خالی ہیں۔

۳۳-اسلامی قائد ہارون رشید جس کی تلوار کا مزہ روم کے شہنشاہ نقفور نے چکھا تھا-

۳۴-مالک سے کہا: اے قوم کے مولا! آپ کے در کی خاک سے قوم کی قسمت روشن ہے۔

۳۵-اے گلزار حدیث کے نواسنج: تجھ سے حدیثوں کے رازوں کے درس چاہتا ہوں۔

۳۶-کب تک لعل پردوں میں چھپا رہے گا- اٹھو! اور دارالخلافت میں تشریف لاؤ۔

۳۷-خوش رنگ ہے عراق کے دنوں کی روشنی اور خوش بحال ہے حسن نظر اور سوز عراق۔

۳۸-آب خضر (آب حیات) اس کی ٹہنی سے ٹپکتا ہے اور مسیحا کے زخم کا مرہم اس کی خاک ہے۔

۳۹-مالک نے کہا: میں مصطفیٰ کا غلام ہوں اور میرے سر میں سوائے اس کے عشق جنوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

۴۰-میں شکار کے تھیلے کے مانند ہوں اور میں اس حریم پاک سے اٹھ نہیں سکتا۔

۴۱-میں خاک یثرب کے بوسے سے زندہ ہوں اور عراق کے دن سے یہاں کی رات

اچھی ہے۔

۴۲- عشق کہتا ہے کہ میرا کہنا مان اور بادشاہوں کو خدمت گذاروں کی طرح بھی ساتھ مت رکھ۔

۴۳- تو چاہتا ہے میرا آقا بن جائے اور مجھ جیسے آزاد بندے کا مولا بن جائے۔

۴۴- تعلیم کے لیے تیرے دروازے پر آئے ہیں ملت کا خادم تو تیرا نوکر نہیں بن سکتا۔

۴۵- اگر علم دین سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو میرے حلقہ آموزش درس میں بیٹھ۔

۴۶- بے نیازوں کے عجیب ناز ہوتے ہیں اور ان کے ناز کے انداز بھی عجیب ہوا کرتے ہیں۔

۴۷- بے نیاز رہنا حق کے رنگ میں رنگے جانا ہے اور تمام رنگ سوائے بے نیازی کے رنگ کے دھونے کے برابر ہیں۔

۴۸- تو نے غیروں کا علم سیکھا یعنی اپنی صورت پر اغیار کا غازہ ملا ہے۔

۴۹- یہ [illegible] ت وہ تجھ سے چھین لیتی ہے اور مجھے نہیں معلوم اب یہ تو ہی ہے یا کوئی دوسرا۔

۵۰- تیری خاک نے اس کی نسیم سے فائدہ نہیں اٹھایا چنانچہ گل اور ریحان سے کورخالی رہی۔

۵۱- اپنی کشت اپنے ہاتھوں سے برباد مت کر اور ابروں سے بارش کی بھیک مت مانگ۔

۵۲- تیری عقل غیروں کی فکر کی اسیر ہے اور تیرے حلق میں غیروں کے نفس کی آواز ہے۔

۵۳- تیری زبان پر دوسرے سے لی ہوئی ادھار گفتگو اور تیرے دل میں دوسروں کی ادھار آرزوئیں ہیں۔

۵۴- تیری قمریوں کو نواؤں نے چاہا اور تیرے قد سرو کو قباؤں نے چاہا۔

۵۵- دوسروں نے شراب اپنے ساغر میں لے رہا ہے اور وہ بھی ساغر جو دوسروں سے قرض میں لیا ہوا ہے۔

۵۶- وہ ان کی نگاہ مازاغ البصر کاش! اگر اپنی قوم کی جانب پلٹ آئے۔

۵۷- شمع اس پروانے کو جانتی ہے اور اپنے اور غیروں میں فرق محسوس کرتی ہے۔

۵۸- میری قوم میں سے نہیں ہے ہمارے حضور فرما رہے ہیں - افسوس! صد افسوس! اور

والے ہو ہم پر۔

۸۹- ستاروں کی طرح زندگی کب تک کرو گے اور اپنی ہستی کو کب تک سحر میں گم کرتے جاؤ گے۔

۹۰- دھوکا صبح کاذب سے کھا چکے ہو اور اپنا بچھونا افلاک کی وسعت سے اٹھا چکے ہو۔

۹۱- تو سورج ہے اگر اچھی طرح سے اپنے آپ کو دیکھے اس لیے تجھے دوسرے ستاروں سے روشنی خریدنے کی ضرورت نہیں۔

۹۲- اپنے دل پر دوسروں کا نقش اتارا ہے اور خاک کو کیمیا کے بدلے حاصل کیا ہے۔

۹۳- کب تک دوسروں کی روشنی سے چمکے گا اور کب تک دوسروں کی شراب سے مست رہے گا۔

۹۴- کب تک غیروں کی محفلوں کے چراغ کا طواف کرے گا۔ اگر تجھ میں ہمت ہے تو اپنی خودی کی آگ میں جل اور جہان کو روشن کر۔

۹۵- نظر کی طرح اپنے ہی پردوں میں رہ۔ اچھل کر اپنی ہی جگہ قائم رہ۔

۹۶- اے عقلمند! دنیا میں حجاب کے مانند اپنے خلوت خانے کو غیروں پر بند رکھ۔

۹۷- کبھی صرف ایک ایک فرد نے بھی خود و متوایا اور کبھی قوم اور قوم نے بھی اپنے ساتھ ساخت اور باہم کام انجام نہیں دیا۔

۹۸- مصطفیٰ کے پیام سے آگاہ ہو جاؤ اور ارباب دون اللہ سے نجات حاصل کرو۔

۹۹- تیری قوم رنگ اور خون یعنی حسب اور نسب سے بلند تر ہے۔ یہاں ایک کالے کی قیمت بھی سو گوروں سے بڑھ کر ہے۔

۷۰- جناب قنبر (حضرت علیؑ کے غلام) کے وضو کے پانی کے ایک قطرے کی قیمت روم کے شہنشاد کے خون سے بڑھ کر ہے۔

۷۱- تو قوم، قبیلہ اور خاندان کی بندشوں سے آزاد ہو کر حضرت سلمان فارسی کی طرح اسلام کا فرزند ہو جا۔

۷۲- اے ہوشیار ساتھی! اس نکتے پر غور کر شہد کو شہد کے چھتے کے خانوں میں دیکھ کر سبق آموز۔

۷۳- جس میں ایک قطرہ گل لالہ سے ہے تو ایک قطرہ نرگسی پھول شہلا سے ہے۔

۷۴- یہ قطرہ نہیں کہتا کہ میں نرگس کے پھول سے ہوں اور دوسرا یہ نہیں کہتا کہ میں نیلوفر

چھول سے ہوں۔

۷۵۔ ہماری ملت کی شان ابراہیمی ہے اور ایمان ابراہیمی ہی ہمارا شہد ہے۔

۷۶۔ اگر نسب قبیلہ اور خاندان کو ملت کا جزو بناؤ گے تو اسلامی برادری میں شگاف ڈالو گے۔

۷۷۔ ہماری سرزمین میں یہ منحوس جڑیں کبھی بھی مستحکم نہ ہوں کیوں کہ غیر مسلم ہماری تاک میں بیٹھے ہیں۔

۷۸۔ ابن مسعود جو عشق کا روشن چراغ ہے جس کا جسم اور جان سرتاپا عشق کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔

۷۹۔ اس کا سینہ بھائی کی موت سے جل اٹھا اور درد و حرارت سے احساس کا آئینہ پانی پانی ہو گیا۔

۸۰۔ اس نے اپنے رونے کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ غم میں ایک ماں کی طرح روتا رہا۔

۸۱۔ اے افسوس! وہ جو نیاز کا سبق پڑھتا ہے میرا دوست جو مدرسہ نیاز کے اندر تھا۔

۸۲۔ آہ وہ سرو وہ چمن جو عشق نبی کے راستے میں میرا ہم سفر اور ہم پلہ تھا۔

۸۳۔ افسوس کہ وہ نبی کے دربار سے محروم اور میری آنکھیں دیدار نبی سے روشن ہیں۔

۸۴۔ ہمارا رشتہ تعلق روم اور عرب سے نہیں ہے اور ہمارے رشتے کو نسب کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

۸۵۔ ہم نے اپنا دل حضورؐ سے باندھا ہے اور اسی رشتے سے ہم یک دیگر سے جڑے ہوئے ہیں۔

۸۶۔ ہمارا رشتہ صرف حضورؐ کی محبت ہے اور ہماری آنکھوں کے لیے ان کی صہبا کا خمار کافی ہے۔

۸۷۔ جب اس کے نشے کا اثر ہمارے خون میں دوڑتا ہے تو وہ فرسودہ عقائد کو جلا کر نئی روشنی پیدا کرتا ہے۔

۸۸۔ حضورؐ کا عشق ملت کا سرمایہ ہے اور ملت کی رگوں میں خون کی طرح بھرا ہوا ہے۔

۸۹۔ عشق ہی جسم کی جان اور نسب ہے اور عشق کا رشتہ نسب کے رشتے سے مستحکم تر ہے۔

۹۰۔ اگر عشق کرنا ہے تو نسب کی بندشوں کو چھوڑا جائے اور ایران و عرب کے تفرقوں سے

نظارہ کشی کی جائے۔

۹۱- حضورؐ کی امت بھی حضورؐ کی طرح حق کا نور ہے' اس لیے ہمارا وجود حضورؐ کے وجود سے ہی قابل شناخت ہے۔

۹۲- نورِ حق کی ابتدا اور وجود کے بارے میں جب کوئی تحقیق نہیں کر سکتا تو یہ ضرورت ہے کہ حق کی خلقت کے نسب اور نسل پر تحقیق کی جائے۔

۹۳- ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو قبیلے اور خاندان کی بندشوں میں بند رکھے' وہ لم یلد ولم یولد سے بالکل بے خبر ہے۔

۹۴- مسلمانوں نے دنیا سے کیوں آنکھیں بند کی ہیں اور کیوں دل کی فطرت حق کی پوشی ہے۔

۹۵- وہ لالہ جو پہاڑ کی چوٹی پر اگتا ہے' وہ بھی گلشن کے دامن کو نہیں دیکھ سکتا۔

۹۶- اس کی آگ شعلے بلند کرتی ہے' زمین پر سحر کی پہلی پہلی ساعتوں میں۔

۹۷- آسمان نے اپنے آغوش سے اسے نہیں نکالا' جو تارہ اس کے غرور و تکبر کو دیکھتا۔

۹۸- پہلے تو سورج کی کرن نے اسے پیار کیا اور شبنم نے اس کی آنکھوں سے خواب کی گرد دھویا۔

۹۹- لم یکن لحق خدا سے رشتہ ایسا مضبوط کیا جائے کہ تو ساری اقوام عالم میں یگانہ اور بے مثال رہے۔

۱۰۰- جب خدا کی ذات واحد اور لاشریک ہے' تو اس کے بندے کو بھی بے مثال اور یگانہ ہونا چاہیے۔

۱۰۱- مومن ہر بلندی سے بلند تر ہے اور اس کی غیرت کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔

۱۰۲- لاتحزنو کی پوشاک اس کے تن پر ہے اور انتم الاعلون کا تاج اس کے سر پر ہے۔

۱۰۳- وہ اپنے کاندھوں پر دو عالم کا بوجھ اٹھاتا ہے' اور بر اور بحرِ اعظم اس کی آغوش میں پلتے ہیں۔

۱۰۴- آوازِ تیز ہمیشہ گوش زد ہوتی ہے اور اگر بخل بھی کرے تو بھی اپنے بازوؤں پر لے گا۔

۱۰۵- اس کی چنگاری کی مٹھی میں سو شعلے ہیں' اور زندگی اس کے جوہر سے کمال پر پہنچی

ہے۔

۱۰۶- اس دنیا کے شور و شین میں' جہاں کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی' سوائے مومن کی تکبیر کی دل نشین آواز کے۔

۱۰۷- اس کا عدل' بخشش اور احسان بہت عظیم ہے اس کے مزاج کے اندر قہر بھی ہے اور وہ کریم بھی ہے۔

۱۰۸- اس کی نوا' بزم کی دلنشیں آواز ہے اور اس کی رزم گاہ کی گرمی' آہن پگھلا دیتی ہے۔

۱۰۹- وہ گلستانوں میں بلبلوں کے ہمراہ ہم آواز ہے اور بیابانوں میں باز کی طرح شکاری ہے۔

۱۱۰- اس کا دل آسمانوں کے نیچے آرام نہیں لیتا' بلکہ اس کا وجود افلاک پر قرار حاصل کرتا ہے۔

۱۱۱- اس کی فکر کا طائر پرواز سورج پر چونچ مارتا ہے اور اس کا خیال آسمانوں کے اس پار معرفت کے نور سے روشن ہے۔

۱۱۲- تو نے پرواز کے لیے اپنے پر نہیں کھولے اور تو ایک کیڑے کی طرح خاک میں آرام سے لیٹا ہوا ہے۔

۱۱۳- تو ذلیل اور خوار اس لیے ہوا کہ تو نے قرآن سے جدائی اختیار کر لی اور پھر اپنی تمام شکستوں کو زمانے کی گردشوں کا بہانہ قرار دیا۔

۱۱۴- تو شبنم کی طرح زمین پر پڑا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری بغل میں ایک زندہ کتاب' یعنی قرآن بھی ہے۔

۱۱۵- کب تک خاک کو اپنا وطن بنائے رہے گا۔ اپنا بستر اٹھا اور آسمانوں کی تلاش میں گم ہو جا۔

☆......☆......☆

خلاصه مطالب مثنوی

در سوره اخلاص

قل هو الله احد

من شی صدیق را اویم بخواب
گل ز خاک راه او چیدم بخواب
آن امن الناس بر مولای ما
آن کلیم اول سینای ما
همت او کشت ملت را چو ابر
ثانی اسلام و غار و بدر و قبر
گفتمش ای خاصه خاصان عشق
عشق تو سر مطلع دیوان عشق
پخته از دستت اساس کار ما
چاره فرما پی آزار ما
گفت تا کی در هوس گردی اسیر
آب و تاب از سوره اخلاص گیر
اینکه در صد سینه پیچید یک نفس
سری از اسرار توحید است و بس
رنگ او بر کن مثال او شوی
در جهان عکس جمال او شوی
آنکه نام تو مسلمان کرده است
از دوئی سوی یکی آورده است
خویشتن را ترک و افغان خوانده ئی
وای بر تو آنچه بودی مانده ئی
وا رهان نامیده را از نامها

90079.jpg

گردن مرحب شکن خیبر بگیر
منت از اهل کرم بردن چرا
نشتر لا و نعم خوردن چرا
رزق خود را از کف دونان مگیر
یوسف استی خویش را ارزان مگیر
گرچه شی مور و هم بی بال و پر
حاجتی پیش سلیمانی مبر
راه دشوار است سامان کم بگیر
در جهان آزاد زی آزاد میر
سبحه اقلل من الدنیا شمار
از تعش حرا شوی سرمایه دار
تا نوای کیمیا شوگل مشو
در جهان منعم شوو سائل مشو
ای شناسای مقام بو علی
جرعه ئی آرم ز جام بو علی
پشت پازن تخت کیکاوس را
سر بده از کف مده ناموس را
خود بخود گردد در میخانه باز
بر تهی پیمانگان بی نیاز
قاید اسلامیان هارون رشید
آنکه نقفور آب تیغ او چشید
گفت مالک را که ای مولای قوم
روشن از خاک درت سیمای قوم
ای نوا پرداز گلزار حدیث
از تو خواهم درس اسرار حدیث
لعل تا کی پرده بند اندر یمن

خیز و در دارالخلافت خیمه زن
ای خوشا تابانی روز عراق
ای خوشا حسن نظر سوز عراق
میچکد آب خضر از تاک او
مرهم زخم مسیحا خاک او
گفت مالک مصطفیٰ را چاکرم
نیست جز سودای او اندر سرم
من که باشم بسته فتراک او
برنخیزم از حریم پاک او
زنده از تقبیل خاک یثربم
خوشتر از روز عراق آمد شبم
عشق می گوید که فرمانم پذیر
پادشاهان را بخدمت هم مگیر
تو همی خواهی مرا آقا شوی
بنده آزاد را مولا شوی
بهر تعلیم تو آیم بر درت
خادم ملت نگردد چاکرت
بهره می خواهی اگر از علم دین
درمیان حلقه درس نشین
بی نیازی ناز ها دارد بسی
ناز او انداز ها دارد بسی
بی نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگ غیر از پیرهن شوئیدن است
علم غیر آموختی اندوختی
روی خویش از غازه اش افروختی
ارجمندی از شعارش میبری

من ندانم تو توئی یا دیگری
از نمیش خاک تو خاموش گشت
وز گل و ریحان تهی آغوش گشت
کشت خود از دست خود ویران مکن
از سحابش گدیهٔ باران مکن
عقل تو زنجیری افکار غیر
در گلوی تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگوها مستعار
در دل تو آرزوها مستعار
قمریانت را نواها خواسته
سروهایت را قباها خواسته
باده می گیری بجام از دیگران
جام هم گیری بوام از دیگران
آن نگاهش سر ما زاغ البصر
سوی قوم خویش باز آید اگر
می شناسد شمع او پروانه را
نیک داند خویش و هم بیگانه را
لست منی گویدت مولای ما
وای ما ای وای ما ای وای ما
زندگانی مثل انجم تا کجا
هستی خود در سحر گم تا کجا
ریوی از صبح دروغی خورده ئی
رخت از پهنای گردون برده ئی
آفتاب استی یکی در خود نگر
از نجوم دیگران تابی مخر
بر دل خود نقش غیر انداختی

خاک بردی کیمیا در باختی
تا کجا رنجی زتاب دیگران
سر سبک ساز از شراب دیگران
تا کجا طوف چراغ محفلی
ز آتش خود سوز اگر داری دلی
چون نظر در پرده های خویش باش
می پرد ما بجامی خویش باش
در جهان مثل حباب ای هوشمند
راه خلوت خانه بر اغیار بند
فرد فرد آمد که خود را او اشناخت
قوم قوم آمد که جز با خود نساخت
از پیام مصطفیٰ آگاه شو
فارغ از ارباب دون الله شو

لم یلد ولم یولد

قوم تو از رنگ وخون بالاتر است
قیمتِ یک اسودش صد احمر است
قطره آب و ضوی قنبری
در بهار بر تر زخون قیصری
فارغ از باب وام و اعمام باش
همچو سلمان زاده اسلام باش
نکته ئی ای همدم فرزانه بین
شهد را در خانه های لاله بین
قطره ئی از لاله حمراستی
قطره ئی از نرگس شهلاستی
این نمی گوید که من از عبهرم

آن نبی گوید من از نیلوفرم
ملت ما شان ابراہیمی است
شہد ما ایمان ابراہیمی است
گر نسب را جزو ملت کرده ئی
رخنه در کار اخوت کرده ئی
در زمین ما نگیرد ریشه ات
ہست نا مسلم ہنوز اندیشه ات
ابن مسعود آن چراغ افروز عشق
جسم و جان او سراپا سوز عشق
سوخت از مرگ برادر سینه اش
آب گردید از گداز آئینه اش
گریه ہای خویش را پایان ندید
در غمش چون مادران شیون کشید
ای دریغا آن سبق خوان نیاز
یار من اندر دبستان نیاز
آه! آن سرو سہی بالای من
در رہ عشق نبیؐ ہمپای من
حیف او محروم دربار نبی
چشم من روشن ز دیدار نبی
نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابند نسب پیوند ما
دل به محبوب حجازی بسته ایم
زین جہت با یکدگر پیوسته ایم
رشته ما یک تولائش بس است
چشم ما را کیف صہبائش بس است
مستی او تا بخون ما دوید

کہنہ را آتش زو و نو آفرید
عشق او سرمایہ جمعیت است
ہمچو خون اندر عروق ملت است
عشق در جان و نسب در پیکر است
رشتہ عشق از نسب محکم تر است
عشق ورزی از نسب باید گزشت
ہم ز ایران و عرب باید گذشت
امت او مثل او نور حق است
ہستی ما از وجودش مشتق است
نور حق را کس نجوید زاد و بود
خلعتِ حق را چہ حاجت تار و پود
ہر کہ پا در بند اقلیم وجد است
بی خبر از لم یلد لم یو لد است

ولم یکن له کفوا احد

مسلم چشم از جہان بر بستہ چیست
فطرت این دل بحق پیوستہ چیست
لالہ ئی کو بر سر کوہی دمید
گوشہ دامان گلچینی ندید
آتش و شعلہ ئی گیرد بہ بر
از نفس ہای نخستین سحر
آسمان ز آغوشِ خود مگذاردش
کوکب واماندہ ئی پنداردش
بوسدش اول شعاع آفتاب
شبنم از چشمش بشوید گرد خواب
رشتہ ئی بـــا لـم یـکـن باید قوی

تا تو در اقوام بی همتا شوی
آنکه ذاتش واحد است و لاشریک
بنده اش هم در نسازد با شریک
مومن بالای هر بالا تری
غیرت او بر نتابد همسری
خرقهٔ لا تحزنوا اندر برش
انتم الاعلون تاجی بر سرش
می کشد بار دو عالم دوش او
بحر و بر پرورده آغوش او
بر غو تندر مدام افکنده گوش
برق اگر ریزد همی گیرد بدوش
پیش باطل تیغ و پیش حق سپر
امر و نهی و عیار خیر و شر
در گره صد شعله دارد اخگرش
زندگی گیرد کمال از جوهرش
در فضای این جهان های و هو
نغمه پیدانیست جز تکبیر او
عفو و عدل و بذل احسانش عظیم
هم بقهر اندر مزاج او کریم
ساز او در بزم ها خاطر نواز
سوز او در رزم ها آهن گداز
در گلستان با عنادل هم صفیر
در بیابان جره باز صید گیر
زیر گردون می نیاساید دلش
بر فلک گیرد قرار آب و گلش
طایرش منقار بر اختر زند

آنسوی این کهنه چنبر بر زند
تو به پروازی پری نگشوده ئی
کرمک استی زیر خاک آسوده ئی
خوار از مهجوری قرآن شدی
شکوه سنج گردش دوران شدی
ای چو شبنم بر زمین افتده ئی
در بغل داری کتاب زنده ئی
تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سر گردون فگن

☆......☆......☆

ہیر وارث شاہ کا پہلا منظوم اردو ترجمہ

مرحوم علامہ مجاہد یکتاؔ کے شاہ کار کا جائزہ

اردو ادب کے کہنہ مشق شاعر مرحوم علامہ عبدالوحید مجاہد متخلص یکتا کا ادبی شاہکار ہیر وارث شاہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے، جو تقریباً تیس سال قبل سرزمین پاکستان پر کیا گیا ہے۔ حضرت وارث شاہ کی منظوم داستان ہیر رانجھا، جو پنجابی ادب کی انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتی ہے، تقریباً ۲۴۰ سال قبل مثنوی کی شکل میں لکھی گئی۔ اس وقت وارث شاہ نے دیش، یعنی ساہیوال میں مقیم تھے۔ ''نے دیش میں، میں نے اس کو لکھا۔ سن ہجری گیارہ سو اسی کا تھا''۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو شاعروں نے دوسری زبانوں اور بولیوں کی معمولی داستانوں کا تو منظوم ترجمہ کیا، لیکن شہنشاہ اکبر کے دور کی اس مشہور داستان عشق و محبت کو پنجابی سے اردو میں منظوم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی، چنانچہ اردو ادب کو اس ترجمے کے لیے دو سو سال انتظار کرنا پڑا۔ اگر اردوے معلّٰی کے شعرا پنجابی زبان سے ناآشنائی کا عذر پیش کریں تو کسی حد تک عذر قابل قبول ہے، لیکن سخت تعجب یہ ہے کہ سرزمین پنجاب، جس نے گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اردو کے بڑے شعرا پیدا کیے، انھوں نے بھی اس طرف توجہ نہ کی، چنانچہ یہ ایک ادبی معجزہ تھا کہ سرزمین دکن کا ایک کہنہ مشق شاعر یکتا، اپنی آخری عمر کے حصے میں سرزمین پاکستان ہجرت کر کے، پنجابی زبان کو سیکھ کر، ہیر وارث شاہ کا نفیس اور سلیس اردو میں ترجمہ کرے جو آٹھ ہزار آبدار اشعار پر مشتمل ہے اور اردو کی طویل مثنویوں میں شامل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کا کسی زبان سے دوسری زبان میں مکمل ترجمہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کی صرف ترجمانی ہو سکتی ہے۔ ترجمے کے لیے فدا کاری اور حوصلہ درکار ہوتا ہے، کیوں کہ ترجمہ میں مترجم آزاد نہیں رہتا بلکہ خیالات اور اشارات کے تابع رہتا ہے، چنانچہ اگر مترجم نے بہت صحیح اور بالکل اصل کے مطابق

ترجمہ بھی کیا ہو تو مترجم سے زیادہ صاحب کلام ہی کی تعریف ہوتی ہے جو درحقیقت اعلیٰ ظرف کے مترجموں کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہیر وارث شاہ سے زیادہ مقبول کتاب پنجابی میں آج تک تصنیف نہیں ہوئی۔ اسی لیے بقول ڈاکٹر بنارسی داس جین: حضرت وارث کا درجہ پنجابی میں وہی ہے جو انگریزی میں شیکسپیئر اور سنسکرت میں کالی داس کا ہے۔ بہرحال پنجابی اردو کی چھوٹی بہن تصور کی جاتی ہے اور یہ کس حد تک قابل قبول ہے کہ ہیر وارث شاہ کا ترجمہ تو فارسی ہندی اور انگریزی میں ہو جائے لیکن اردو ادب اس عظیم شاہکار سے محروم رہے چنانچہ شاید اسی لیے دکن کے سپوت جو اپنے فن اور ہمت میں یکتا تھے اور جو سید جلال الدین ید اللّٰہی حضرت اشرف شمسی اور علی حیدر طباطبائی جیسے نامور شاعر کے تلامذہ میں شامل تھے اس سنگ بزرگ کو اٹھا کر محراب عشق پر ایسا جما دیا کہ آج اردو داں حضرات وارث شاہ کے ان جواہر پاروں سے اسی کے ذریعے متعارف ہیں چنانچہ اردو کے محقق اور مورخ جناب بابو رام سکسینہ کی دل کی مراد بر آئی کیوں کہ انھوں نے نصف صدی قبل یہ گلہ کیا تھا کہ اردو زبان میں کوئی وارث شاہ پیدا نہیں ہوا جو وارث شاہ کے قصے کو اعلیٰ ترین شعری محاسن کے ساتھ منظوم کرتا۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس عشق کی داستان جو آٹھ ہزار اشعار پر پھیلی ہوئی ہے اس کے ہر رخ کو اس مختصر سے مضمون میں اجاگر کر سکیں لیکن بہرحال ہماری کوشش یہ ہو گی کہ اس تحریر کے ذریعے قارئین کو ہم وارث شاہ کے علمی اور فنی افکار سے کسی حد تک روشناس کرا سکیں کیوں کہ اس ترجمے میں حضرت وارث شاہ کی روح بول رہی ہے۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جس قدر صاحب تصنیف عظیم ہو گا اس کی تخلیق بھی اسی قدر عظیم تر ہو گی اور اس کا ترجمہ کرنا اتنا ہی مشکل اور دشوار ہو گا۔ ہر زبان اور ہر بولی کے روزمرہ محاورے کنائے استعارات اور تشبیہات جدا جدا ہوتے ہیں اور شاعری کا سارا کرشمہ ان ہی محاسن کی وجہ سے باقی رہتا ہے چنانچہ یہاں مرحوم یکتا نے ہیر کے محاوروں کو اس خوش اسلوبی سادگی سلاست اور روانی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے اردو کی زمین سخن پر پنجاب کے دریا رواں دواں ہیں اسی لیے تو پاکستان کے ناقد ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم نے اس ترجمے کو دیکھ کر کہا تھا کہ میں نے ہیر وارث شاہ کا اس سے بہتر رواں اور سلیس ترجمہ نہیں دیکھا۔ برصغیر کی شاعری خواہ وہ کسی بھی زبان اور بولی میں ہو حسن اور عشق کی داستانوں کو بڑے ہی رنگین طریقے سے پیش کرتی ہے حسن مجازی کا تصور اور

بیان' شاعر کی قدرتِ تخیلہ کا سنگھار سمجھا جاتا ہے رانجھے کے عشق کی بات کرنے سے پہلے ہم ہیر کا حسن پیش کرتے ہیں جہاں نور الفاظوں کے قمقموں سے چھن کر قاری کے ذہن کو روشن کر رہا ہے۔ ہیر کا سراپا ملاحظہ کیجیے:

کروں روپ کا اس کے کیا میں بیاں
کہ حور و پری کا تھا اس پر گماں
قمر چہرہ تھی ' ہیر زہرہ جبیں
ہوا ایسا کوئی نہ ہو گا کہیں
زنخ سیب اس کے تھے' یاقوت لب
تھی بینی الف حسینی نسب
تھے گیسو' ناگن سے' اڑتے ہوئے
دلوں پر صدا جن کا سایا رہے
نہ تھے دانت اس کے تھے موتی سچے
ہنسی' جیسے بجلی تڑپ کر گرے
اگر اس کی گردن کبھی دیکھ لے
تو پھر کونج 'جگ میں دکھائی نہ دے
نہ تھیں انگلیاں' پہ پھلی ماش کی
خرد گم ہو دیکھے سے آکاش کی
کہ تھے دست نازک' کہ برگِ چنار
غضب ٹھاٹھ چھاتی کا' اور وہ ابھار
نظر والے اس کو یہ سمجھا کیے
کہ ہیں گیند ریشم کے رکھے ہوئے
الاساق سیمیں کہ بس مرحبا
یہیں سے ہوئی حسن کی ابتدا
جہاں صدر میں ملتے ہیں دو ابھار
خفی ایک خط جیسے گنگا کی دھار
یہاں آ کے دیکھے کوئی ہیر کو

مجسم اگر نور دیکھا نہ ہو

شعر، شاعر کے خیال اور ماحول کا اظہار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس داستان کو گذرے ہوئے پانچ سو سال کا عرصہ بیت چکا ہے، لیکن داستان پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری داستان کی رزم و بزم میں شریک ہے۔ مکالمے، محاورے اور کھلی گفتگو، پڑھنے والے کو زندہ ماحول میں گم کر دیتی ہے۔ گاؤں کی صبح کا سچا منظر دیکھیے:

دھند لکے میں رانجھا روانہ ہوا
نہاں کچھ رہا، کچھ دکھائی دیا
روی دودھ میں تھی کہیں مل رہی
کسی سمت جینا چھلکتی ملی
کوئی لے کے بیل اپنے گھر سے چلا
پرانی کوئی اپنی تھا ڈھونڈتا
کوئی بیج بونے کو ہرنالی لے
کسان اپنے ہل ساتھ لے کر چلے
کہیں گھر گرتی تھی کچھ پیستی
کوئی بیٹھے آٹا تھی بس گوندھتی
کوئی گیت چکی پہ گانے لگی
کوئی چرخہ اپنا چلانے لگی
گدھوں کو کمہار اپنے کس کر چلے
کہ لے آویں مٹی جہاں سے ملے
کہیں تھا جولاہا کلف کر رہا
وضو کرتے مسجد میں کوئی ملا
سرا میں جو اترے تھے کچھ قافلے
سفر پر وہ اپنے روانہ ہوئے

شعر میں کہاوت یا مثل کو نظم کرنا بڑی صفت سمجھا جاتا ہے۔ ہم یہاں چند کہاوتیں مشتے از خروارے پیش کرتے ہیں:

رانجھا، ہیر سے کہتا ہے:

اٹل ہو بچن پر کہ جیسے اتیت
محبت میں ہوتی نہیں ہار جیت

ہیر رانجھا سے کہتی ہے:

مگر سر کو اوکھلی میں جب دے دیا
تو موسل کی ضربوں سے ڈرنا ہے کیا
لگائے بھی وہ اور بجھائے بھی وہ
ہتھیلی پہ سرسوں جمائے بھی وہ

ویلن کیدو ہیر سے کہتا ہے:

نہ سمجھو گے اب بھی تو اچھا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
جو کہتے ہیں منہ سے وہ کرتے نہیں
گرجتے ہیں جو وہ برستے نہیں

کچھ اور کہاوتیں دیکھیے:

کیے کی تو اپنے سزا پائے گا
نہ کچھ ساتھ لایا نہ لے جائے گا

بہادر ہو کوئی کہ ہو شہ سوار
محبت کے جوئے میں ہوتی ہے ہار
رنجیلے کو لا کر کھڑا کر دیا
محبت میں جنگ میں ہے سب کچھ روا
فقیروں کے دل کو دکھانا نہیں
اگر شیشہ ٹوٹا تو جڑتا نہیں
رہا گھر میں دریا رواں حسن کا
مگر میں تو پانی میں پیاسا رہا

فردوسی نے کہا تھا:

منم ساختم رستم داستاں

وگرنہ یلی بودے در سیتاں

یعنی میں نے داستان میں رستم کو رستم بنایا' ورنہ میرے ''حماسہ'' اور ''شاہنامہ'' سے پہلے ستیان میں رستم ایک غیر معروف وحشی تھا- اس کا مطلب یہ ہے کہ فردوسی کے شاعرانہ تخیل نے اس داستان میں خوشبو اور رنگ بھرا- اسی طرح اگرچہ ہیر رانجھا کی منظوم داستان حضرت وارث شاہ کی ہیر سے پہلے بھی موجود تھی' مگر اس میں وارث شاہ نے زندگی اور جان ڈالی' چنانچہ خود کہتے ہیں:

ترجمہ:

یہی قصہ منظوم پہلے بھی تھا
مگر شعر وارث در بے بہا
عیاری ہے سونا مرے شعر کا
پرکھ لیں کسوٹی پر کھوٹا کھرا
گل تر ہیں سینچے ہوئے خون سے
مہک ان کی تاحشر باقی رہے
مرے شعر کو دے خدایا قبول
بحق محمدؐ و آلِ رسول ﷺ

ہیر وارث شاہ کو پنجابی کی انسائیکلو پیڈیا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں پر پند و گفتار موجود ہیں- اس منظوم داستان کے آٹھ ہزار اشعار درحقیقت آٹھ ہزار اشارے ہیں' جو علوم' معارف' مسائل اور مذہب کی ترجمانی کرتے ہیں- دیہات کی ایک مسجد کے صحن میں مکتب کا ماحول بیان کرتے ہوئے' پچاس سے زیادہ معتبر اور معروف کتابوں کے ناموں کا ذکر اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ اس کی دوسری مثال اردو نظم میں مشکل ہی سے ملے گی:

کوئی ''صرف'' و ''میر'' و ''بہائی'' پڑھے
کوئی لینے ''قاضی'' کا دورہ کرے
سبق ''کنز'' و ''قطبی'' کے ہوتے رہے
کہیں درس تھے ''بارہ مصود'' کے
کہیں درس قانی کا ہوتا رہا

نہیں دیکھا پتھر پہ رنگ کو چڑھے
کوئی لاکھ سالو میں غوطہ بھی دے

جوگی کے الفاظ میں بعض امراض کا علاج اور ان کی دوا کا اشتہار توجہ طلب ہے:

کسی کو اگر ہووے نزلہ زکام
اسے ہم پلاتے ہیں شربت کے جام
اگر لقوہ ہو یا ہو فالج جسے
حلب کے ہیں شیشے سے ہم سینکتے
مرض موذی مرگی کا جس کو ہوا
اسے کہنہ جوتی سنگھانا روا
مولے کا روغن' بوا بیر میں
اسے کھائیں اور اس کی مالش کریں

اس گفتگو میں تقریباً ۳۰-۳۵ امراض کے علاج اور دوائیوں کے نام بتائے گئے ہیں۔

برصغیر کی تہذیب' مسائل زنا شوئی کو مغربی ادب کی طرح کھل کر بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی' لیکن چونکہ یہ مسائل' داستان کا اہم جزو قرار دیے جاتے ہیں' اس لیے شاعر ان چیزوں کو خاص تشبیہات' استعارات' رمز و کنایہ و اشارات کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ شاید ہی اردو ادب کی کوئی دوسری داستان ہو' جس میں ان خوبیوں سے ان رنگینیوں کو بیان کیا گیا ہو۔ نمونے کے طور پر صرف چند اشعار پر ہم اپنے ادھورے مضمون کو تمام کرتے ہیں:

ہیر سے مخاطب ہو کر:

کہا اس کی نندوں نے بھابھی ننا
شگفتہ ہے کیوں آج چہرا تیرا
نشاں تھے جو کاجل کے' کیا ہو گئے

زنخ اور عارض' صفا ہو گئے
نہ تھے لال کچھ ایسے' عارض تیرے
سمجھتی ہوں' یہ گال چومے گئے
نچوڑا کسی نے تجھے' آج کیا
تیرا رنگ کیوں ایسا پیلا پڑا
پسینہ ہوئی تجھ کو بھنچا گیا
ہوا ختم جب قصہ' بیچا چھنا
کلی آس کی آج' تیرے کھلی
اسے چونچ بلبل کی ایسی لگی
چھٹا آج فوارہ یوں باغ کا
نہر کو وہ سیراب کرتا رہا
جواں ٹیلے پر کودا کوئی
جبھی ساری مٹی ہوئی بربری
بھر آئی گئی عطر دانی یونہی
لیا اس کی قسمت بھی کچھ اس سے لی
تیری سیپ میں ابر نیساں پڑا
صدف میں نہاں ہے در بے بہا
صدف جو نہ سیدے سے چیری گئی
لیا مول اس کو ترا جوہری

ہیر نے جواب دیا۔

انگوٹھی کا چہرے کو رگڑا لگا
اسی کا نشاں ہے' جو کالا پڑا
پکڑنے کو پارا جو دوڑی گئی
مری چولی ڈھیلی' اسی سے ہوئی

نہ جانے زباں کیوں لبوں پر پھری
جمی سرخی ہونٹوں کی' اس سے اڑی
ہوا لال سینہ' سر اس کا لگا
پڑی ٹھوڑی سرخ' چہرہ ہوا
نہیں بات کوئی' گماں مت کرو
قسم اس کی جو چاہو تم' مجھ سے لو

☆……☆……☆

اقبالؔ عاشق امام حسین علیہ السلام

شاعر مشرق' امام امت: ڈاکٹر محمد اقبال' حضرت امام حسین علیہ اسلام سے والہانہ عشق و محبت رکھتے تھے اور آپ کی حیات طیبہ کو انسانی زندگی کی معراج اور آپ کی عظیم قربانی کو نوع انسانی کے لیے ایک درس آزادی اور مسلمانوں کے لیے ایک کامل اسوہ حسنہ اور مشکلات زندگی کا مکمل حل تسلیم کرتے تھے۔ علامہ اقبال' فقر شاہی اور فقر خانقاہی کو مسلمانوں کے لیے مضر اور اسلام کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے چنانچہ ''ارمغان حجاز'' میں مسلمانوں کو مسلکِ شبیری کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ایک اور مقام پر'' مثنوی فقر'' میں فرماتے ہیں:

فقر عریان گرمی بدر و حنین
فقر عریان بانگ تکبیر حسین

یعنی: حقیقی فقر اسلامی' معرکہ بدر و حنین اور تکبیر امام حسین علیہ السلام ہے۔ علامہ اس تصوف سے نفرت رکھتے تھے جو مسلمانوں کو شجاعت سے دور' عمل سے بیگانہ اور کوشش و جدوجہد سے علیحدہ کر کے ترک دنیا اور رہبانیت کی طرف مائل کرے۔ وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ عزلت نشینی کی زندگی چھوڑ کر نقش قدم امام حسین پر چلیں' جو صرف فداکاری' ایثاری اور قربانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خود علامہ اسی مسلک کے پیرو تھے' چنانچہ'' پیام مشرق'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزو ست
بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزو ست

یعنی: تیر و نیزہ و خنجر اور تلوار میری خواہشات ہیں۔ اے نام نہاد (مسلمان)

میرے ساتھ مت چل! کیوں کہ میری آرزو امام حسینؑ کی طرح حق پر قربانی کرنا ہے۔
علامہ فرماتے ہیں کہ نقش قدم امام حسینؑ پر چلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں' کیوں کہ یہ راہ قربانی' فداکاری' ایثار اور عشق حقیقی کا راستہ ہے اور اسی لیے علامہ نے فرمایا:

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است
بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

علامہ فرماتے ہیں' پیغام حق' امام حسینؑ کی شہادت سے زندہ ہے' جس نے باطل کو ہمیشہ کے لیے مایوس اور نابود کر دیا ہے' اور اسی حق کو بچانے کے لیے امام حسینؑ اور ان کے جانباز اپنے خون سے نہائے' اور اس طرح اسلام کی مجدد بنیاد ڈالی اور اسے ہمیشہ کے لیے باقی رکھا۔ اسی مضمون کو سات سو سال قبل حضرت معین الدین چشتی سنجری نے یوں ادا کیا:

شاہ است حسینؑ' پادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ' دین پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنا لا الہ است حسینؑ

علامہ اقبال ''رموز بیخودی'' میں حضرت سید الشہداءؑ کی شان میں ایک طویل (۳۹ اشعار پر مشتمل) نظم میں فرماتے ہیں:

آں امام عاشقاں پور بتولؑ
سرو آزادے ز بستانِ رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیِ ذبح عظیم آمد پسر

یعنی: امام حسینؑ حقیقی عاشقوں کے امام اور حضرت فاطمہؑ کے بیٹے ہیں۔ آپ رسول کریم ﷺ کے باغ کے سرو ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبال اشارہ کر رہے ہیں حضرت علیؑ کے اس جملے کا کہ ''بسم اللہ'' کی ''ب'' کا نقطہ جو خلاصہ قرآن ہے' میں ہی

ہوں' یعنی اللہ رے حسینؑ کی عظمت' جن کا باپ ''بائے بسم اللہ'' اور جو خود ذبح عظیم کی تفسیر ہیں۔ ''بال جبریل'' میں فرماتے ہیں:

غریب و سادہ ' رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ' ابتدا ہے اسماعیل

علامہ فرماتے ہیں کہ کعبہ کی داستان سادہ اور دلچسپ ہوتے ہوئے بھی عجیب اور غریب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بنا' جو حضرت ابراہیمؑ نے رکھی' اس کے قیام میں حضرت اسماعیل نے شدت تشنگی سے ایڑیاں رگڑیں' حضور اکرم ﷺ نے اسے بتوں سے پاک کیا اور حضرت امام حسینؑ نے اس کی حرمت کو اپنی جان و مال کی قربانی دے کر بام عروج پر پہنچایا اور قیامت تک کے لیے محکم بنا دیا۔ امام حسینؑ عشق الٰہی کے پیامبر تھے اور دوسرے پیامبران عشق کی طرح اپنے عشق کا اظہار کرتے رہے:

صدق خلیل بھی ہے عشق' صبر حسینؑ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

سر ابراہیمؑ و اسماعیل بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود

''رموز بے خودی'' میں واقعہ کربلا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چون خلافت رشتہ از قرآں گسیخت
حریت راز ہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوہ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

یعنی: جب خلافت نے قرآن مجید سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور خلافت' اسلامی اور قرآنی اصولوں کو چھوڑ کر ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور آزادی کو زہر دے دیا گیا' تب

محمد ﷺ کا نواسہ' علیؓ کا بیٹا' حسینؑ اس ظالمانہ رویے کو برداشت نہ کر سکا اور رحمت العالمینؐ کا نواسا ابرِ رحمت بن کر بڑھا اور کربلا کی زمین پر خون کی ایسی بارش کی کہ کربلا کے دشت کو شہیدوں کے گلستان میں تبدیل کر دیا' اور قیامت تک ظلم و ستم کا خاتمہ کر کے آزادی کے گلشن میں زندگی ڈالی۔ میدانِ کربلا میں امام حسینؑ اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ امت اسلام کی نجات کا عنوان بھی رقم کر رہے تھے:

نقشِ الااللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

پھر علامہ اقبال فرماتے ہیں:

دشمناں چوں ریگِ صحرا لا تعد ،
دوستان او بہ یزداں ہم عدد

یعنی: امام حسینؑ کے دشمن ریگستان کے ذروں کی طرح لاتعداد تھے' جب کہ آپ کے جانباز دوست صرف یزداں کے ہم عدد' یعنی بہتر (۷۲) تھے۔
(یزداں=ی=۱۰'=ز=۷'د=۴=۱۴' اں=۵۰ =۷۲)

علامہ اقبال فرماتے ہیں: امام حسینؑ اپنی امت میں ایسی اہمیت رکھتے تھے' جس طرح قرآن مجید میں حرف قل ھو اللہ احد:

درمیانِ امت' آں کیواں جناب
ہمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب

حق اور باطل کی جنگ ازل سے رہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی' اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید
ستیزہ کار رہا ہے' ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

ملتِ اسلام کی غفلت اور ناکامی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں: شہادت امام حسینؑ سے ہی ان تمام مشکلات کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے:

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام

خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوے دجلہ و فرات

قرآن مجید' جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی ہے' اس کا راز بھی حسین سے سیکھا جا سکتا ہے' چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:

رمز قرآن از حسین آموختم
ز آتش او شعلہ ھا اندوختم

یعنی: میں نے قرآن کا راز حسین سے سیکھا ہے اور اسی حسینی شمع کے شعلے سے اپنے چراغوں کو شعلہ ور کیا ہے۔ امام حسین کی شہادت کی منزلت اور عظمت کو بیان کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں:

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگ پور مرتضیٰ چیزی دیگر

یعنی: ہر قسم کی شہادت مومن کے لیے فضیلت ہے' لیکن ابن علی کی شہادت بے مثال ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

علامہ اپنے عشق کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالی کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے
رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں' میں
کیا در مقصد نہ دیں گے' ساقی کوثر مجھے

اے صبا! اے پیک دور افتادگان!
اشک ما بر خاک پاک اورساں

یعنی: اے باد صبا! اس عاشق دور افتادہ کے آنسوؤں کو حضرت کے مزار تک پہنچا دے۔

''ارمغان حجاز'' میں فرماتے ہیں۔

قلندر میل تقریری ندارد
بجز ایں نکتہ اکسیری ندارد
ازآں کشت خرابی حاصل نیست
کہ آب از خونِ شبیری ندارد

یعنی: یہ قلندر' جو صرف تقریر کرنا پسند نہیں کرتا' صرف ایک نکتہ' جو اکسیر حیات اور ثمر زندگی ہے' بتانا چاہتا ہے' کہ اسلامی زمین' جو بنجر اور ویران ہو چکی ہے' اس سے کوئی بھی چیز اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی' جب تک کہ اسے خون شبیر سے سیراب نہ کیا جائے۔

☆......☆......☆

''دیوانِ حافظؔ'' کے تراجم

''دیوانِ حافظؔ'' کے تراجم پر تبصرے سے پہلے ہم یہ بحث کریں گے کہ کیا ''دیوانِ حافظؔ'' کے ترجموں کی ضرورت ہے؟

ایک گفتگو کے مطابق حافظؔ کا شمار دنیاے ادب کے دس عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کی آبادی تقریباً ۴۵۰۰ ملیون ہے اور صرف دو سو ملین افراد فارسی زبان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں' یعنی صرف چار فیصد' دنیا کی آبادی' فارسی زبان سے واقف ہے' اور چھیانوے فیصد افراد فارسی سے بے بہرہ ہیں۔ چونکہ حافظؔ کے کلام کا تعلق ذات اور کائنات سے ہے' اس لیے اس کلام سے دنیا کا ہر شخص' جو مذاقِ سلیم رکھتا ہے' آشنا ہونے کا حق اور اس سے لطف اندوز ہونے کا استفاشہ کر سکتا ہے' اور اس استفاشہ کا تنہا جواب' اس گراں قدر کلام کا' دوسری زبانوں میں ترجمہ ہی ہو سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ترجمہ' تحقیق کا دروازہ ہوتا ہے' جس کے ذریعے ایک محقق' ایک گمشدہ فردوس میں داخل ہوتا ہے اور نت نئے مسائل سے خود بھی واقف ہوتا ہے اور دنیا کو بھی روشناس کراتا ہے' یعنی اگر کوئی غیر فارسی زبان شخص حافظؔ کے چند اشعار کا ترجمہ پڑھ لے تو اس کا اشتیاق اس کو مجبور کرے گا کہ وہ حافظؔ کے بارے میں بیشتر جانے' اور اس کے کلام سے بیشتر استفادہ کرے' اور آخر کار اس کے سفر کی آخری منزل خود دیوانِ حافظؔ ہی ہوگی۔ یعنی وہ آہستہ آہستہ ''دیوانِ حافظؔ'' کے مطالعے میں مصروف ہو جائے گا۔

پچھلے زمانوں میں ادبیات عروج پر تھے اور لوگوں کے پاس وقت زیادہ' اس لیے وہ علوم کے ساتھ ساتھ زبان شناسی اور زبان نویسی کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے' لیکن آج کل کی مصروف دنیا میں اس گلشن و بلبل سے لطف اندوز ہونے کے لیے اگر آسان اور عام فہم الفاظ میں ترجمے پیش کیے جائیں' تو یہ ادب کی عظیم خدمت ہوگی۔

زبان چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے' اور وقت کے دھارے مروج

الفاظ کو متروک بنا دیتے ہیں' اس لیے یہ بھی لازم ہے کہ ہر پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں ایسے زندہ جاوید کلام کے ترجموں پر نظر ثانی کی جائے اور مروجہ آسان فہم زبان میں مقاصد بیان کیے جائیں' جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

ترجموں ہی کی بدولت ایک تہذیب اپنے شاہکار کو دوسرے تمدن سے آشنا کرتی ہے' یعنی اگر چار سو سال قبل حافظ کے دیوان کا یورپ کی زبانوں میں ترجمہ نہ ہوتا' تو آج مغربی دنیا میں حافظ کا نام بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ کھلی حقیقت ہے اور ہم سب کا مشاہدہ بھی کہ امریکہ کے کسی محلے کی لائبریری ایسی نہیں' جس میں حافظ کا کلام یا اس کے کلام پر پیام موجود نہ ہو۔

''دیوان حافظ'' کے ترجموں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اجمالی طور پر منثور اور منظوم ترجموں پر نظر ڈالیں گے۔ فارسی ادب میں خود ''دیوان حافظ'' کی فارسی شرحیں موجود ہیں' تاکہ کسی حد تک لوگوں کو لسان الغیب' ترجمان الاسرار کے اسرار اور رموز سے واقفیت ہو سکے' اس کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں' جن میں لاطن' انگلش' جرمن' فرنچ' ترکی' عربی اور اردو قابل ذکر ہیں' حافظ کے منثور اور منظوم ترجمے ملتے ہیں۔ سب سے قدیم ترجمہ لاطن میں Meniski کا ہے جو ١٦٨٠ء' یعنی حافظ کے انتقال کے ۲۹۰ سال بعد کیا گیا۔ اس کے علاوہ لاطن زبان ہی میں ۱۷۶۷ء کا تھامس ہائڈ اور ۱۷۷۱ء کا ریوکی کا ترجمہ ہمارے درمیان موجود ہے۔ انگریزی زبان میں کئی ترجمے موجود ہیں۔ سب سے قدیم ترجمہ ۱۷۹۳ء کا سر ولیم جانسن کا ہے۔ مزید تین انگریزی ترجمے' جن میں ڈاکٹر Herman Bicknell کا ۱۸۷۵ء میں' مس بل کا ۱۸۹۷ء میں اور Mr.Walter کا ۱۸۹۸ء میں' قابل ذکر ہے۔ فرنچ میں ولیم جانوں کا Version اور جرمن میں Wahl کا ۱۷۹۱ء میں ترجمہ اور ۱۸۷۷ء میں بورڈن سٹڈٹ کا ترجمہ مشہور ہے۔

اردو زبان میں اگرچہ چیدہ چیدہ آٹھ دس غزلیات کا منظوم اور منثور ترجمہ نظر آتا ہے' لیکن تمام غزلیات حافظ کا پہلا منظوم ترجمہ آج سے ۶۰ سال قبل جناب احتشام الدین حقی دہلوی نے بعنوان ''ترجمان الغیب'' فارسی کی بحر و قافیہ اور ہم آہنگ ردیف میں کیا' جو زیادہ معروف نہ ہو سکا' جس کی کئی وجوہات ہیں' اور یہ بحث ہمارے مضمون سے خارج ہے۔ یہ ترجمہ آج کل تقریباً ناپید ہے اور بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں:

زبان اردو میں ہم قافیہ و ہم آواز

ہوا ہے ترجمہ ''دیوان حافظؔ شیراز''
معجزہ گر نیست کرامات است (حقی)

اردو کا پہلا منثور ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین کا ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے تقریباً ۳۵ سال قبل کیا اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن بازار میں بک چکے ہیں۔ اس کام پر مولانا کو صدر جمہوریہ ہند نے سرٹیفکیٹ آف آنر ان پرشین پیش کیا۔ ترجمے کے لیے شیر کا دل اور چیتے کا جگر چاہیے یعنی یہ کام ہر ایک کے بس کا نہیں۔ ترجمے کے لیے فداکاری اور حوصلہ درکار ہے۔ (۱) جس شخص کو فارسی اچھی طرح سے سمجھ میں آتی ہے اس کو بھی کسی زبان میں حافظؔ کا ترجمہ متاثر نہیں کر سکتا، کیوں کہ لسان الغیب حافظؔ کے ہر شعر میں الفاظ اس خوبصورتی سے جڑے ہوئے ہیں کہ ان کا تصور بھی کسی اور زبان میں ممکن نہیں، اس لیے فارسی داں سے ترجمے کی تعریف کی امید رکھنا عبث ہے اور یقیناً ترجمہ فارسی داں کے لیے نہیں کیا گیا ہے، البتہ کئی فارسی دانوں نے خود زبان فارسی میں حافظؔ کے دیوان کی نثری شرحیں لکھی ہیں، جو خود مورد تنقید اور تردید قرار دی گئی ہیں۔ (۲) اگر ترجمہ بہت صحیح اور بالکل مطابق شعر کیا گیا ہو تو بھی تعریف حافظؔ ہی کی ہوتی ہے اور مترجم کو حاشیہ میں رکھا جاتا ہے یعنی مترجم کو اس محنت اور مشقت کا معاوضہ پوری طرح سے نہیں دیا جاتا۔ (۳) چونکہ اردو زبان، الفاظ، محاورات، استعارات، تشبیہات اور دوسرے صنائع لفظی اور معنوی میں فارسی زبان کی نسبت کمزور ہے، اس لیے ان اشعار کا، جو فارسی ادب کے نگینے ہیں، اردو نظم میں پرونا مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہے۔

☆......☆......☆

’’دیوانِ حافظؔ‘‘ کا اردو منظوم ترجمہ

ڈاکٹر خالد حمید ام ڈی کی خوبصورت کاوش ’’غزلیاتِ حافظؔ شیراز‘‘ منظوم اردو ترجمہ جو سال گذشتہ مطبوعات اقدار کراچی لاہور سے شائع ہوئی اور جو ایک گراں قدر اردو ادب کا تحفہ تصور کیا جا رہا ہے۔ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جس میں حافظ کی تین سو غزلیات کا مکمل اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے: اس لحاظ سے بھی قاری کے لیے باعث لذت ہے کہ فارسی غزل کے مقابل اردو منظوم ترجمہ رکھا گیا ہے یعنی ہر پڑھنے والا بقدر ہمت خود دونوں زبانوں سے استفادہ کر سکتا ہے اور اردو ترجمہ پڑھ کر فارسی شعر پر رجوع کر سکتا ہے: اس طرح وہ اصلی شعر کے آہنگ سے بھی لذت حاصل کر سکتا ہے۔

اس ترجمے کا حسن یہ بھی ہے کہ بیشتر غزلیات میں فارسی عربی ہی کی بحر اور بعض اوقات اسی غزل کے اردو مروجہ قافیوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے تاکہ ترجمہ اصلی شعر سے قریب تر رہے اور اردو اشعار کی خوش بیانی اور غنائیت میں چنداں فرق نہ آ سکے۔

شاعر اپنے کلام میں خیال اور بیان میں آزاد ہوتا ہے چنانچہ اگر کسی خیال کو کسی وجہ سے منظوم کرنے میں دشواری پیش آئے تو اسے نظر انداز کر دیتا ہے جس کو کسی کی نظر بھی دیکھ نہیں سکتی: لیکن مترجم کے لیے یہ سہولت درکار نہیں ہوتی وہاں پر شعر ایک چیلنج کی طرح اس کے سامنے پورے آب و تاب کے ساتھ کھڑا رہتا ہے: اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ترجموں کو تنقیدی زاویوں سے دیکھنے کے بجائے ترجیحی پیمانوں میں تولا جائے خیال کی ادائی کو زبان کی سادگی پر ترجیح دی جائے۔

اگرچہ میرا مقصد یہاں حافظ کے اردو منظوم ترجموں کا مقائسہ یا مقابلہ نہیں لیکن چونکہ جناب احتشام حقی اور ڈاکٹر خالد حمید کی کاوشیں ایک ہی زمین کی فصلیں ہیں جن میں زمان کا فاصلہ اور زبان کا واسطہ صرف ان ترجموں کو علٰحدہ کیے ہوئے ہے اس لیے اس بات کو گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک خیال کی تصویر کشی کا تعلق ہے

ڈاکٹر خالد حمید کا منظوم ترجمہ جناب احتشام حقی کے ترجمے کے معیار سے بلند ہے' جس کی بڑی وجہ فارسی محاورات' جو اردو زبان میں رائج نہیں ہیں؛ حقی صاحب کے ترجمے میں شامل ہیں' اور ایسے محاورات ڈاکٹر خالد کے اشعار میں نظر نہیں آتے - ان فارسی محاورات نے اشعار کو اردو داں حضرات کے لیے ناقابل فہم بنا دیا ہے- دونوں ترجموں میں چیدہ چیدہ متروک الفاظ کا استعمال اور عروضی جوازوں کا استفادہ ہے؛ بعض ثقیل فارسی بندشوں اور ترکیبوں کا مصرعوں میں نظر آنا مترجم کی کوشش و کاوش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے تاکہ بڑی حد تک شعر؛ عکس اور معنی کا آئینہ بنا رہے- ڈاکٹر خالد حمید نے یہ سنگ بزرگ اٹھا کر محراب عشق پر ایسا جمایا ہے جیسے انگوٹھی پر نگینہ- ان کی اس بلند پروازی پر عرفی شیرازی کا شعر صادق آتا ہے:

به گرد مرقد حافظ که کعبۂ سخن است
در آمدیم بعزم طواف در پرواز

یعنی: ہم حافظ کی قبر' جو سخن کا کعبہ ہے اس کے طواف کے لیے پرواز کا عزم لے کر آئے ہیں-

حافظ کے کلام میں بحروں کی روانی' الفاظ کی موسیقی اور دلکشی' ردیف و قافیہ کی دلاویزی' استعارات کی فراوانی' تشبیہات کی رنگینی' مضامین کی جدت' خیالات کی نقشہ کشی' طریقت اور شریعت کی پابندی' فطری جذبات کی رہنمائی وغیرہ ایسے بے شمار پہلو ہیں' جن کو بیان کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے: اسی لیے تو مشہور شاعر صائب تبریزی نے کہا تھا: چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد-

اسی لیے صدیوں سے شاعروں نے اسی اندازِ سخن پر اپنے سخن کی بازی لگا دی- بقولِ داغ دہلوی:

قائل ہیں ہم' اے داغ اس اندازِ سخن کے
ہر شعر میں ہو حافظ شیراز کا انداز

آیئے دیکھیے! حافظ شیرازی کا انداز اور ڈاکٹر خالد حمید کے ترجمہ کا انتخاب:

هر چند پیر و خسته دل ناتوان شدم
هر گه که یاد روئے تو کردم' جوان شدم
ہر چند پیر و خستہ؛ دل ناتواں ہوا

جب بھی خیال آیا ترا نوجواں ہوا

شکر خدا کہ ہر چہ طلب کردم از خدا
بر ملتجاے مطلب خوڈ کامراں شدم
شکر خدا کہ جو بھی خدا سے طلب کیا
اس نے دیا وہ سب مجھے میں کامراں ہوا

من و انکار شراب' ایں چہ حکایت باشد
غالبا اس قدرم عقل کفایت باشد
مے سے انکار مجھے' کیسی حکایت یہ ہے
حیلہ ساقی کا ہے اک عذر کفایت یہ ہے

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب
مارا بہ جام بادہ گلگوں خراب کن
قبل اس کے سارا عالم فانی خراب ہو
مجھ کو بہ جام بادۂ گلگوں' خراب کر

اے نور چشم من! سخنی ہست گوش کن
تا ساغرت' پراست بنوشان و نوش کن

اے نور چشم! بات یہ میری بگوش کر
جب تک نہ پر ہو ساغر مے نوش' نوش کر
مے دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر
مے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ

عجیب چیز ہے، یہ صحبت صغیر و کبیر

مباش در پے آزار و، ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما، غیر ازیں گناہی نیست
جو چاہے کیجے، دل کو دکھایئے نہ مگر
کہ کوئی دنیا میں اس سے بڑا گناہ نہیں

زشعر حافظؔ شیرازی میگویند و می رقصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی
کلامِ حافظؔ شیراز سن کر رقص کرتے ہیں
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظؔ
بہ قرآنی کہ اندر سینہ داری
نہ کیوں ترے، ہوں پاک، اشعار حافظؔ!
ہے قرآن جب کہ ترا سینہ رکھے

حافظؔ کا ایک مشہور شعر ہے۔
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اردو میں حقی صاحب نے ترجمہ کیا:
سنبھال اے ترک شیرازی! پھرے یہ دل نہ یوں مارا
سمرقند و بخارا خالِ کافر پہ ترے وارا

اب ڈاکٹر خالد حمید کا ترجمہ دیکھئے:
اگر منظور دل میرا ہو، اس ترک دل آرا کو
فدائے خال و قد کر دوں، سمرقند و بخارا کو

ڈاکٹر ایڈورڈ براؤن نے اسی ایک شعر پر پانچ انگریزی ترجمے پیش کر کے بتلایا

کہ یہ ترجمے کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی حافظؔ کے شعر کی خوشبو بکھیرتے ہیں۔

اس معروف شعر کے ساتھ یہ بھی حکایت مشہور ہے کہ جب تیمور نے شیراز فتح کیا اور حافظؔ کو طلب کر کے پوچھا کہ جن شہروں، یعنی سمرقند و بخارا کو آباد کرنے کے لیے میں نے تمام دنیا کو نابود کیا ہے، اس کو تم اپنی معشوق ترک شیرازی کے رخسار کے کالے تل کے بدلے دے دینا چاہتے ہو؟ تو حافظ نے سر جھکا کر کہا: حضور! انھی فضول خرچیوں کی وجہ سے آج میری یہ حالت ہوگئی ہے۔ اس پر تیمور بہت ہنسا اور حافظؔ کے ساتھ نیک سلوک کیا۔ (علامہ اقبالؔ نے "پیامِ مشرق" کے دیباچے کے حاشیے میں لکھا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ حافظ کا انتقال تیموری فتح شیراز سے قبل ہو چکا تھا۔ صفحہ ۱۷۹)۔

اس ایک شعر میں تین شہر شیراز، سمرقند اور بخارا کے علاوہ تین چیزیں جو بدن سے وابستہ ہیں، یعنی دست، دل اور خال کو حافظؔ نے اس خوبصورتی سے جمایا ہے کہ دنیائے ادب اس کی مثال نہیں دے سکتی۔ اس شعر میں ترک کے معنی سلطان اور سفید خوبصورت اور ہندو کے معنی کالا اور غلام کے بھی ہیں۔

گفتگو کے آخر میں اس مطلب کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حافظؔ کی اغلب غزلیات سعدیؔ، سلمانؔ ساوجی اور خواجوؔ کے جواب میں لکھی گئی ہیں، لیکن ان کا طرز اور روش خواجو ہی کا رہا؛ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

استاد غزل سعدیؔ است پیش ہمہ کس اما
دارد غزل حافظؔ طرز و روش خواجوؔ

حافظؔ نے اپنا تخلص قرآن کے حافظؔ ہونے کی نسبت سے رکھا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں:

صبح خیزی و سلامتی طلبی چوں حافظؔ
آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

یعنی: صبح بیدار اور سلامتی کو تو نے اے حافظؔ! قرآن کی دولت سے حاصل کیا ہے۔

☆......☆......☆

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

تاریخ ادب و شعر بتلاتی ہے کہ تقریباً پچیس سال کی عمر تک غالبؔ پر بیدلؔ کی نازک خیالی اور مشکل پسندی سوار رہی' اور غالبؔ اس امتحان میں کوئی خاص امتیاز پیدا نہ کر سکے : چنانچہ خود فرماتے ہیں :

طرزِ بیدل میں ریختی کہنا
اسد اللہ خاں! قیامت ہے

بعض دوستوں نے' جن میں مفتی صدر الدین قابلِ ذکر ہیں: غالبؔ کو اس مشکل سے رہا کرنے کے لیے نصیحتیں کیں۔ غالبؔ نے اپنا رنگ بدلا اور پھر فصاحت و بلاغت' سلاست و روانی' بیان و مضمون آفرینی کی جولانیاں دکھانے لگے' اور تھوڑے ہی عرصے میں زمانے میں ابھر گئے' لیکن ابھی بھی ان کی زبان پر وہی نعرہ تھا :

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

یعنی : اگر نقشِ رنگیں دیکھنا ہے تو فارسی کلام دیکھو' کیونکہ میرا اردو مجموعہ بے رنگ ہے۔ ناظمؔ ہروی نے ایک نظم میں مشاہیر شعرائے فارسی کی نام بہ نام مدح کی ہے اور انھیں استادِ فن ٹھہراتے ہوئے جامیؔ پر فارسی غزل کے ارتقا کو ختم جانا ہے۔ کہتے ہیں :

زخسرو چوں نوبت بہ جامیؔ رسید
زجامیؔ سخن را تمامی رسید

غالبؔ کہاں اس چیز کو قبول کرتے' چنانچہ آپ نے اضافہ کر کے فرمایا :

زجامیؔ بہ عرفیؔ و طالبؔ رسید

زعرتی و طالب بہ غالب رسید

اس موقعے پر یہ نکتہ بھی جالب ہے کہ پروفیسر سید علی استاد فارسی نظام کالج نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے متاثر ہو کر فرمایا:

چو غالب ز ہندوستاں رخت بست
بجاے وے اقبال دانا نشست
یقین داں سخن دانی باستان
بماند بہ ہندوستاں جاوداں

دوسرے عالمی ادیبوں کی طرح اردو ادب میں بھی ہم عصرانہ چشمک آرائی اور گروہ بندی کے سلسلے شروع ہی سے نظر آتے ہیں۔ ایسے مشہور جوڑوں میں سودا اور ضاحک، مصحفی اور انشاء، ناسخ اور آتش، انیس اور دبیر، ذوق اور غالب اور داغ و امیر مینائی قابل ذکر ہیں۔ اگر اس تحریر میں اس معرکہ آرائی پر گفتگو نہ ہو تو تشنگی باقی رہ جائے گی۔ ''بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرا ہے اتراتا''۔ کس نے نہیں سنا، سب کو معلوم ہے کہ یہ چوٹ کس پر ہے۔ جب شاہ ظفر کے بیٹے جواں بخت کی شادی ہوئی تو غالب نے ایک ۱۲ اشعار کا سہرا لکھا، جس کا مطلع اور مقطع سنیے:

خوش ہو اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے بہتر کوئی کہہ دے سہرا

شاہ ظفر سمجھ گئے کہ ان کے استاد ملک الشعراء خاقانی ہند ذوق نشانہ بنائے گئے ہیں، چنانچہ استاد سے فرمایا: آپ بھی مقطعے پر نظر رکھتے ہوئے سہرا لکھیں۔ ذوق نے ۱۰ اشعار کا سہرا لکھا۔ اس کا مطلع اور مقطع دیکھیے:

اے جواں بخت! مبارک تجھے، سر پر سہرا

آج ہے یمن و سعادت کا' ترے سر سہرا
جس کو دعویٰ ہے سخن کا' یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

دہلی میں ہر خاص و عام کی زبان پر سہرے کے یہ اشعار تھے یا سہرے کی لڑیاں جس میں دو سخن وروں کی چشمک آرائیاں؛ چنانچہ غالبؔ نے فوراً ایک قطعہ لکھ کر مسئلہ کو صاف کیا۔ اس قطعے کے چند شعر سنیے:

استاد شہ سے ہو' مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپاہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں' جنوں نہیں' وحشت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ! خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غالبؔ کی اردو تصنیفات میں ۱۷۹۵ اشعار پر مبنی ایک دیوان انتخابی ہے' جو ۱۸۴۱ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں قصیدوں کے ۱۹۲ اشعار' مثنوی کے ۳۳ اشعار' غزلوں کے ۱۴۳۳ اشعار۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں سید الاخبار دہلی سے اور پانچواں مطبع خلاق آگرہ سے غالبؔ کی زندگی میں شائع ہوا جس کی ایک جلد نیویارک کی سینٹرل پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

غالبؔ کے مرنے کے بعد ان کے دیوان میں ان کے مکتوبات اور دیگر تحریروں سے اشعار جمع کر کے متفرقات کے ذیل میں جمع آوری کی گئی جن کی تعداد ۵۹۰ ہے۔

اس طرح آج کل کے دیوان میں تقریباً ۲۴۰۰ اشعار موجود ہیں جن میں بعض رباعیات اور منفرد اشعار کی صحت پر علماء اور محققین کو شک ہے۔ اردو کی دوسری نثری تصنیف ''عود ہندی'' ہے جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی' جس میں غالبؔ کی کچھ تقریظیں اور کچھ خطوط اور تحریریں شامل ہیں۔ تیسری تصنیف ''اردوے معلّیٰ'' ہے جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی؛ جس میں دوستوں اور شاگردوں کے خطوط ہیں۔ اس تصنیف کا نام بھی مرزا غالب نے ہی رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ''قادر نامہ'' جو طویل اردو مثنوی ہے' ۱۸۵۶ء میں منظر عام پر آئی۔ ''ہنگامہ دل آشوب'' ''لطائفِ غیبی'' ''قاطع برہان'' (۱۸۶۵ء) ''تیغ تیز'' (۱۸۶۷ء) بھی اردو تصانیف ہیں؛ اس طرح اردو میں ایک دیوان' ایک مثنوی اور چھ نثری مجموعات' غالبؔ کی یادگار ہیں۔

فارسی کی تصانیف میں غالب کا مکمل دیوان' جس میں غزلوں کے علاوہ حمد' نعت منقبتیں اور سلاطین اور حکمرانوں کی تعریف میں قصائد شامل ہیں؛ غالبؔ کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۳۸۰۰ اشعار موجود ہیں۔ یہ دیوان ۱۸۴۵ء میں پہلی بار دہلی اور ۱۸۶۳ء میں دوسری بار نولکشور لکھنو سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''پنج آہنگ'' (۱۸۴۹ء) جو فارسی کے انشاء پردازوں کے لیے عمدہ کتاب ہے' ''مہر نیمروز'' (۱۸۵۵ء) ''دستنبو'' (۱۸۵۷ء) ''مثنوی ابر گہر بار'' (۱۸۶۴ء) ''سبد چیں'' (۱۸۶۷ء) ''دعاے صباح'' کا منظوم ترجمہ (۱۸۶۷ء) اور ''نامہ غالبؔ'' جو غالبؔ کے فارسی خطوط پر مشتمل ہے' فارسی ذخیرے میں موجود ہیں۔

غالبؔ کی شاعری کی ابتدا تو دس سال کی عمر میں پتنگ بازی کے حوالے سے ہوئی۔ مرزا غالبؔ کی پہلی کاوش ملاحظہ کیجئے:

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل آ رشتہ آزادگی
ایک دن تجھ کو اڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
نظر کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

غالب کا سلسلہ مشق سخن ۶۰ سال تک اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا ۱۸۶۸ء کو تقریباً اپنے اختتام کو پہنچا' پھر سال شاید ہی غالب نے کوئی شعر کہا ہو۔ سماعت بالکل جا چکی تھی۔ دوست اور شاگرد کاغذ پر لکھ کر دیتے تو جواب دیتے' عموماً ہمیشہ لیٹے رہتے۔ آخری شعر' جو بالکل آخری دنوں کی یادگار ہے' وہ یہ ہے:

دم واپسیں برسر راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

☆......☆......☆

چراغِ سخن، شہر کا، بجھ گیا

اردو ادب اور شاعری کی منفرد و ممتاز شخصیت ڈاکٹر مظفر شکوہ، شہر نیو یارک میں ۱۳ اکتوبر ۹۵ء کی اولین ساعتوں میں طوالانی علالت کے بعد انتقال کر گئے- مرحوم ۱۹۱۹ء میں راجپوتانہ میں پیدا ہوئے۔ کمسنی میں والدین کے گذر جانے کی وجہ سے آپ کی کفالت و تربیت آپ کے چچا کے سپرد ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آگرہ اور جے پور میں ہوئی اور پھر سکول اور کالج کی تعلیمی تکمیل دلی میں ہوئی- ہندوستان سے ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے وہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے پہلے امریکہ تشریف لائے اور مزوری یونیورسٹی سے ارضیات اور سیاسیات میں ایم اے کیا اور پھر نیو یارک یونیورسٹی سے سیاسیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی- وہ ۱۹۵۱ء سے نیو یارک میں ہی مقیم ہو گئے- ڈاکٹر صاحب وائس آف امریکہ، محکمہ اطلاعات اور اقوام متحدہ میں کچھ سال کام کرنے کے بعد شہر نیو یارک کے گردونواح میں موجود یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مشغول تدریس ہوئے- ڈاکٹر صاحب وہ پہلی شخصیت تھے جنھوں نے وائس آف امریکہ کے ذریعہ اردو کی آواز اور اردو پروگرام لوگوں تک پہنچایا- اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود وہ ادبی، سماجی، صحافتی اور اخلاقی خدمات میں لگے رہے، چنانچہ ۱۹۷۷ء میں انگریزی زبان کا ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا، جس میں آگے چل کر اردو حصے کا اضافہ کر دیا گیا- اس کے علاوہ کئی ادبی اور سماجی انجمنوں کی تاسیس آپ کی کوششوں کا نتیجہ ثابت ہوئیں- مرحوم کے پسماندگان میں مرحوم کی پہلی شریک حیات سے تین فرزند: ذکور، مرحوم فیروز شکوہ، جناب فرہنگ شکوہ اور جناب کامران شکوہ کے علاوہ آپ کے بھتیجے مظہر رضوی اور بہو صباحت زیجاہ قابلِ ذکر ہیں، جن سے ڈاکٹر صاحب کو خاص محبت و پیار تھا- ڈاکٹر صاحب کی موجودہ رفیق حیات: مسز جین ایلن شکوہ نے ۳۸ سال ازدواجی زندگی بسر کی- ڈاکٹر جین شکوہ اعلیٰ اخلاق کی حامل خاتون ہیں، جنھوں نے مختلف خصوصی اداروں میں کام کیا ہے-

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب و شاعری کی مشعل کو اس دیارِ غیر میں ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ۵۰ سال تک روشن رکھا' اور ان کی خدمات کی بدولت ان کی روشنی ہمیشہ زیادہ ہی ہوتی رہی ؛ چنانچہ نجی شعری محافل ہوں یا بین الاقوامی مشاعرہ یا بزمِ ادب کے جلسے' بہرحال ہر صورت میں ادب کی خدمت جاری رہی جس کا نتیجہ آج ہم امریکہ میں' بخصوص شہر نیویارک میں مشاہدہ کر رہے ہیں' چنانچہ انھی ادبی' سماجی اور تعلیمی خدمات کو پیشِ نظر رکھ کر جون ۸۷ء میں' ہندوستان کی مرکزی حکومت نے اردو کی انٹرنیشنل کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب کو علامہ اقبال اردو ایوارڈ پیش کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کمسنی ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی ؛ چنانچہ گیارہ سال کی عمر میں داغ کی غزل کی بحر پر کہی گئی غزل : ''آج بیٹھے ہیں وہ بیزار' خدا خیر کرے'' کے چند شعر جب میں نے سنے تو ایسا لگا کہ قدرت نے بچپن ہی سے طبعِ موزوں کی قدرت دی تھی اور ابتدائی کلام میں بھی کمال کی جھلک نمایاں تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی نوجوانی اور جوانی کے دور کا کلام جو عام طور سے دلی کے مشاعروں' دلی کالج کی ادبی محافل اور دلدادگانِ اردو کی شعر و سخن کی بزموں کی تحریک کا نتیجہ تھا ؛ متاسفانہ ہمیں دستیاب نہیں ہے۔ چونکہ یہ کلام غریب الوطنی' تقسیمِ ہند اور دہلی کے فسادات کی وجہ سے ضائع ہو گیا اور چیدہ چیدہ چند شعر جو یاد تھے' وہ بھی مرحوم کے سینے میں دفن ہو گئے۔ یہ مرحوم کی شاعری کا پہلا دور تھا' جو مرحوم کے امریکہ آنے پر ۱۹۴۷ء میں اختتام کو پہنچا۔

مرحوم کی شاعری کا اصلی اور دوسرا دور ۱۹۸۰ء سے شروع ہوتا ہے' یعنی ۳۰ سال تک مختلف تعلیمی' معاشی' ماحولی اور معاشرتی مصروفیتوں' مصلحتوں اور مجبوریوں کی بناء پر شعریت کا لاوا سینے میں پکتا رہا اور موقع ملتے ہی یوں ابلا کہ تین سال کی قلیل مدت میں اس کی گرد سے ''غبارِ ناتواں'' جیسا دیوان مرتب ہو گیا' جس میں ہر شعر دردِ دل' رنگِ گل' نالۂ بلبل' وفائے جاناں اور جفائے زمانہ کی منفرد تفسیر ہونے کے ساتھ ساتھ پیکرِ انکساری' متانت اور خاکساری کی تصویر معلوم ہوتا ہے ؛ چنانچہ خود مرحوم فرماتے ہیں : اپنے لیے لفظ ہم کا استعمال مجھے ہمیشہ چھوٹا منہ اور بڑی بات معلوم ہوئی اس لیے لفظ ''میں'' پر تکیہ کرتا ہوں' جس سے مدعا اظہارِ تکبر نہیں بلکہ اقرارِ کم مائیگی ہے۔

اخلاق و کردار کا ایسا پیکر جس کی رفتار و گفتار نے انسانوں کو اپنا دلدادہ بنا ڈالا وہ جس کے لب پر ہمیشہ مسکراہٹ تھی' لیکن دل درد سے چور' مگر شکوے کو ہمیشہ اپنے

شکوے سے شکست دیتا رہا' اپنے رستے ہوئے ناسور کے قطرات کو شعر کی بحر میں بہا دیتا؛ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ مظفر شکوہ کا یہ پوشیدہ رخ خود انھی کے کلام سے ظاہر ہو' چنانچہ گلشن شکوہ سے گلچین کر کے چند درو گل پیش کر رہا ہوں' اگر چہ دوسرے افراد دیگر زاویوں سے ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہر راہ ایک منزل اور ہر گام ایک راستہ نظر آئے گا۔

اگر چہ ڈاکٹر صاحب نے باقاعدہ طور پر کسی سے شرف تلمیذی حاصل نہیں کیا' لیکن جب بھی ضرورت محسوس ہوئی' پروفیسر ناظر حسن زیدی' جو پنجاب یونیورسٹی کے اردو' فارسی کے پروفیسر تھے اور اب ریٹائر ہو کر نیو یارک میں مقیم ہیں؛ ادبی اور شعری مدد حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب کے ادبی دوستوں میں ن م راشد' جناب اختر الایمان' جناب سردار جعفری اور خواجہ محمود الحسن قابل ذکر ہیں۔ شاعری خدا کی دین ہوتی ہے' لیکن اخلاق و کردار کی شائستگی؛ انسان کی اپنی آپ کوشش' فداکاری اور قربانی کا نتیجہ ہوتی ہے؛ اور جب یہ دونوں سعادتیں ایک جا جمع ہو جاتی ہیں' تو وہ شخصیت مظفر شکوہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

گلہ کیا' تو کیا دل کی تنگ ظرفی کا
تمھارے جور و ستم کا نہیں کیا ہم نے
ہزار بار گرے اور خود سنبھل بھی گئے
مگر کسی کو سہارا نہیں کیا ہم نے
انگشتِ اعتراض نہ ہم پر اٹھایئے
شوریدہ سر ہیں' ہاتھ میں پتھر اٹھایئے
خاک میں ہم کو ملایا' تو بہت خوب کیا
اب پشیمان ہوا کرتے ہو' کیا کرتے ہو!
لب مدعا نہ کھلے کبھی' کہ یہ زیب حسن طلب نہیں
یہی رمز مہر سکوت ہے کہ نہ آئے حرف وقار پر
ہم اپنی داستان درد کچھ یوں بھی سنا لیں گے
جسے تم خامشی سمجھے ہو' گویائی بھی ہوتی ہے

دنیا کی بے ثباتی اور عقبیٰ کی ثباتی کا ثبوت اپنے اشعار میں مجسم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دل دے چکے ہیں' جان بھی' اب دے کے دیکھ لیں
اک امتحان یہ بھی' ہماری نظر میں ہے
آیا ہے عیادت کو مری' سارا زمانہ
اب وہ بھی چلے آئیں' یہ امکاں سا لگے ہے

چھوڑ کر خار و خس' رنج و محن' جاتا ہوں میں
مثل گل' باغ جہاں سے خندہ زن جاتا ہوں میں
چمن میں جب ہمارے بعد' ابر نو بہار آئے
ہماری خاک تربت پر بھی دو آنسو نثار آئے
لو وہ آ کے پھول چڑھا گئے' پس مرگ میرے مزار پر
یہ نوازشیں' یہ عنایتیں' مری ایک مشت غبار پر

اپنے دور کے ایک بڑے دانشور' عالم' ادیب' نقاد اور نامور شاعر ہونے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب ایک شفیق' مہربان' منکسر المزاج انسان تھے' جنھوں نے انا اور تکبر کو اپنی خاک میں جگہ نہ دی؛ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

رکھے جاتے رہے' ہر مصر کے بازار میں' ہم
پر کبھی آ نہ سکے' چشم خریدار میں' ہم
کسی ساحل کی تمنا' نہ تلاطم کا گلہ
بہ رہے ہیں غم ایام کی منجدھار میں ہم
قدم قدم پہ جو کانٹے بچھائے جاتے ہیں
یہ میرے پائے تمنا کا امتحاں تو نہیں
یہ بجلیاں' جو کڑکتی ہیں صحن گلشن میں
نظر میں ان کی' کہیں میرا آشیاں تو نہیں
جسے سن کر زمانہ ہنس رہا ہے
وہ میری ہی فغان بے اثر تھی

جب جبر و استبداد زمانہ اور ظلم ستمگاران سے دل خون کے آنسو اگلنا شروع کر دے تو ڈاکٹر صاحب اسے کیسے روک سکتے تھے: چنانچہ تغزل کے نشے میں بھی احساس فطرت بیدار رہتا اور شعر کے سانچوں میں ڈھل کر یوں نکلتا:

لہو کے آنسوؤں سے یوں' اگر گلنار ہے دامن
تو پھر زخم جگر کیوں کر چھپایا جائے ہے مجھ سے
چھڑکا ہے جب سے دشت کے کانٹوں پہ خون دل
سامان لالہ کاری مژگاں نہیں رہا

انسانیت کا علم بردار شاعر' مذہب و ملت کے تفرقوں سے بیزار نظر آتا ہے اور بھائی چارگی کا درس دیتا ہوا نظر آتا ہے: چنانچہ ہندو مسلم فساد سے متاثر ہو کر کہتا ہے:

ناقوس سومنات سے بھر کر مئے اذاں
رود جمن سے چشمہ کوثر بنائیں ہم
توفیق ایزدی ہو تو تجھ کو فقیہ شہر
دار وے عشق دے کے قلندر بنائیں ہم

ظفر زیدی مرحوم کی یاد میں لکھتے ہوئے مخمس میں مرحوم کے مشہور شعر پر تضمین کرتے ہوئے اسی نظریے کی تبلیغ میں کہتے ہیں:

کیوں نہ ہر گوشہ آفاق میں جایا جائے
گیت گایا تھا جو تو نے' وہی گایا جائے
''اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے''
''جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے''

ڈاکٹر صاحب ایک خوش عقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ محمد ﷺ و آل محمدؐ سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ مجالس و محافل میلاد میں شرکت کرتے' اور کئی بار آپ کے ہی مصرع طرح پر شعراء کرام نے طبع آزمائی فرمائی: چنانچہ ولادت حضرت امام حسینؑ پر فرماتے ہیں:

حسینؑ ابن علیؑ، سبط نبیؐ حق کے ولی آئے

وہی' جن کی گلو بوسی کو تیغ آبدار آئی
ے تابِ ولا میں ان کے' ہم سرمست تھے' کل شب
تو فرطِ بے خودی میں' دل کے پردے سے پکار آئی
تو اپنی جرات بے باک پر کیوں کر نہ نازاں ہو
یہی لغزش تو سب رندوں کی تقدیریں سنوار آئی

چنانچہ انھی الہامی طاقتوں نے تقدیر سنواری اور مظفر کو ظفریاب کر کے شگوہ بنا دیا' اسی لیے شاید کبھی اپنی عادت سے ہٹ کر بھی یوں کہا ہے:

دامن بچا کے گذرے ہیں' سارے جہاں سے ہم
کمتر نہیں کسی بھی جہت' آسماں سے ہم

موصوف کی رحلت کی افسوس ناک خبر امریکہ اور دوسرے ممالک کے ادبی اور سماجی اداروں میں پھیلتے ہی ایک مایوسی سی محسوس ہونے لگی- واشنگٹن میں ۱۴ اکتوبر ۹۵ء کو جو شعری نشست منعقد ہوئی' اس کو ڈاکٹر صاحب کے نام سے موسوم کر کے جناب باقر زیدی نے مصرع طرح پر کہا:

جو اہلِ دل ہیں آلِ پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ
محشر میں ہوں گے شافعِ محشر کے ساتھ ساتھ

شہر نیویارک کی مشہور شاعرہ ڈاکٹر صبیحہ صبا نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

غیر زمیں میں کشتِ ہنر پر کس نے لالہ کاری کی
دیباچوں سے قطع نظر' تفصیل میں کوئی جائے تو
اس کے ایک اشارے پر ہم بزم الٹ کر رکھ دیں گے
شاہِ سخن و پیرِ مغاں' اس باب میں کچھ فرمائے تو

ہم اپنے تمام احباب اور مرحوم کے معدوحین کو پرسا دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ہی کا شعر پیش کرتے ہیں:

وجہ رنگینی حیات گئی
تم گئے ساری کائنات گئی

مرحوم ڈاکٹر مظفر شکوہ کی نماز جنازہ ۱۵ اکتوبر تین بجے دن الخوئی اسلامک سنٹر نیو یارک میں برگزار ہوئی' اور تدفین ۱۶ اکتوبر بارہ بجے دن واشنگٹن پارک لانگ آئی لینڈ نیو یارک میں عمل میں آئی- یہ گذارش نیو یارک کے تمام مقامی اخبارات اور مجلہ جات میں اشاعت کے لیے دی گئی اور ہندوستان اور پاکستان کے ادبی مجلہ جات اور روزناموں میں بھی جہت اشاعت روانہ کی گئی-

☆......☆......☆

رثائی رباعیات

رباعی کا مختصر تاریخی، عروضی اور تحقیقی جائزہ

رباعی عربی لفظ ہے، جس کے لغوی معنی چار کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں رباعی اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں مقررہ اوزان پر کسی خیال کو چار مصرعوں میں بیان کیا جائے۔ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا لازم ہے؛ اگرچہ تیسرے مصرعے میں قافیہ قابل تحسین قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ رسم کم و بیش متروک ہو گئی ہے۔ رباعی کے مصرعوں میں وحدت خیال اور تسلسل بیان کا ارتقا بھی مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ رباعی؛ ردیف اور بغیر ردیف کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ رباعی، شاعری کی وہ صنف ہے، جو قلیل الالفاظ ہوتے ہوئے بھی کثیر المعانی ہوتی ہے۔ شاعر، رباعی کے پہلے تین مصرعوں میں خیال کو روشناس کرتے ہوئے اس کی عکاسی اور رنگینی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سامع نتیجہ سے بالکل بے خبر رہتا ہے، لیکن جب وہ چوتھے مصرعے میں برجستگی اور شدت کے ساتھ خیال کا اظہار کرتا ہے تو سننے والا مسحور اور متحیر ہو جاتا ہے؛ چنانچہ اسی لیے تو صائب تبریزی نے رباعی کے چوتھے مصرعے کی قدر و منزلت اور اس کے حسن شعری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

از رباعی بیت آخری زند ناخن بہ دل
خط پشت لب بہ چشم ما ز ابرو خوشتر است

یعنی: رباعی کا چوتھا مصرع دلکش اور دل موہ لینے والا ہوتا ہے اور ہماری نظر میں موچھیں، ابرو سے حسین ہوتی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو شاعری میں مرثیے کی طرح رباعی بھی ایک ایسی صنف ہے، جو ہر قسم کی رکیک، ابتذال، فحاشی، ہجو اور بیہودہ گوئی سے ہمیشہ پاک و صاف رہی اور آئندہ بھی اس کا دامن اس لیے آلودہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا موضوع

مذہبی، اخلاقی، فلسفی، معارفی مسائل کے کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ فارسی اور اردو کی کتابوں میں رباعی کو دو بیتی، جفتی، ترانہ، چار مصرعے بھی کہا گیا ہے؛ لیکن علمائے قواعد اور عروض نے ان کے فرق کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ رباعی سے جدا ہیں۔ بہرحال، یہاں یہ بحث ہمارے اس مضمون سے خارج ہے۔

رباعی کو ہیئتی یا ترکیبی شکل میں تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) رباعی غیر خصی : جس میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ (۲) رباعی خصی : جس میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو۔ (۳) رباعی مستزاد جس میں رباعی کے مصرعوں کے ساتھ ایک فقرہ رباعی کے وزن کا اضافہ کیا جائے۔ رباعی کو موضوعاتی لحاظ سے مذہبی، اخلاقی، اصلاحی، عشقی، تصوفی، رثائی وغیرہ خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، یعنی رباعی : صنفِ شاعری کی وہ مختصر ترین نظم ہے، جس میں فوق ذکر موضوعات کے تسلسل بیان اور وحدتِ خیال کو مخصوص وزن میں بیان کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں مثنوی کی طرح رباعی بھی فارسی ہی سے آئی ہے۔ علمائے ادب وشعر، جن میں فارسی کے مشہور عالم ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری قابل ذکر ہیں؛ اپنی کتاب تحقیقی، انتقادی وعروضی فارسی میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ رباعی جسے قدما ترانہ اور دو بیتی کہتے تھے ایرانیوں کی ایجاد ہے چنانچہ فارسی سے یہ عربی اور اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ جدید تحقیقات نے یہ بات بھی ثابت کر دیا ہے کہ رباعی عربی اور فارسی شاعر ابو دلف زینت الملعب اور رودکی سے قبل موجود تھی، اور رودکی رباعی کے اوزان کا موجد نہیں ہے۔ رباعی کو اس لیے بھی کڑ صنفِ شاعری کہا جاتا ہے کہ اس کو صرف بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف ازل کے ۲۴ اوزان میں کہا جا سکتا ہے، یعنی اس کے رکن مفاعیلن اور اس کے (۹) زحافات، جو کل دس ارکان ہیں؛ ان سے ۲۴ اوزان تشکیل دیے گئے ہیں؛ چنانچہ رباعی کے ہر مصرعے میں ان دس ارکان سے کوئی چار رکن ضرور ہوں گے۔ مشہور عروض داں خواجہ حسن قسطان حراسانی نے اس بحر کے دو شجرے : اخرب اور اخرم بنائے اور ہر شجرے میں بارہ اوزان ٹھہرائے۔

اگرچہ رباعیات، اردو شاعری کی ابتدا سے نظر آتی ہیں، لیکن ان کی تعداد دوسرے اصنافِ سخن جیسے : غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیے کی نسبت بہت کم ہیں۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۳۰ھ) کے دیوان میں، جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے؛ صرف ۳۹ رباعیات نظر آتی ہیں۔ یہ اردو کا پہلا رباعی نگار بھی

تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ رباعیات زیادہ تر مذہبی اور عشقیہ مضامین سے لبریز ہیں۔ سید وجہی' جو عبداللہ قطب شاہ کا ملک الشعرا تھا اور جس کی مشہور تصنیف ''سب رس'' ہے اس کی صرف دو رباعیات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ سراج دکنی کی نو رباعیات' ولی دکنی کی چھے رباعیات' خواجہ درد کی نو رباعیات' سودا کی ۸۰ رباعیات' میر حسن کی دو رباعیات' میر تقی میر کی ۱۲۵ رباعیات' جن میں چند مستزاد رباعیات بھی شامل ہیں' انشا کی ۴۰ رباعیات' فغاں کی گیارہ رباعیات' ذوق کی ۱۷ رباعیات' مومن کی ۱۲۸ رباعیات' مرزا دبیر کی ۲۲۰ رباعیات اور میر انیس کی ۵۷۰ رباعیات ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اگر اردو شاعری کی ابتدا سے ۱۹ ویں صدی کی انتہا تک تمام اردو رباعیات کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد مرثیہ گوئی کے آفتاب اور مہتاب یعنی میر انیس اور مرزا دبیر کی رباعیات سے بھی کم ہو گی۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اردو رباعی کو نئی زندگی عطا کی۔ جس طرح صنف مرثیہ ان مبارک ہاتھوں میں آ کر ابھری اور بگڑا شاعر مرثیہ گو' بڑھیا شاعر مرثیہ گو بن گیا' اسی طرح صنف رباعی بھی مقبول ہوئی۔ میر انیس اور مرزا دبیر مرثیہ پڑھنے سے پہلے ہمیشہ چند رباعیات پڑھتے اور مجلس کو سجا دیتے تھے۔ رباعیات کی مقبولیت کی وجہ سے گذشتہ صدی میں ہزاروں رباعیات ہر موضوع سخن پر لکھی گئیں۔ جن مشہور شعراء نے رباعی گوئی میں نام پیدا کیا' ان میں حالی' مہدی مجروح' امیر مینائی' شاد عظیم آبادی' چکبست' اکبر الہ آبادی' اسمٰعیل میرٹھی' پیارے صاحب رشید' کشن پرشاد شاد' امجد حیدر آبادی' سرور جہاں آبادی' نظم طباطبائی' فانی' فراق گھورکھپوری' جگت موہن رواں' حامد حسن قادری' جعفر علی اثر' خواجہ دل' یگانہ' جوش' تلوک چند محروم' رگھو نیدر راؤ جذب' اثر صہبائی' امداد حسین اختر' سکینہ الہام' نجم آفندی' باوا کرشن مغموم' صفیہ شمیم اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ شامل ہیں۔ میرے خیال میں بیسویں صدی کا شاید ہی کوئی نامور شاعر ایسا ہو' جس نے کم از کم دس رباعیات نہ کہی ہوں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے پاس بھی رثائی رباعیات کی تعداد کم ہے' بیشتر رباعیات اخلاقی' سماجی اور اصلاحی مضامین کی نقیب ہیں۔ انیس کی اخلاقی رباعیات کا مجموعہ ''انیس الاخلاق'' کے نام سے نظامی پریس لکھنو سے شائع ہوا۔ انیس کی کلیہ رباعیات ۱۹۴۸ء میں مطبع نولکشور سے شائع کی گئیں۔ میں نے اس خصوصی مضمون کے لیے معدن شعر سے رثائی رباعیات کے الماس چنے ہیں' جس کے

نمونے پیش کیے جا رہے ہیں- مضمون کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم صرف اردو رباعیات پیش کریں گے' لیکن کیونکہ حضرت خواجہ اجمیری کی فارسی رباعیات کے بغیر مضمون تشنہ معلوم ہوگا' تبرک کے طور پر دو فارسی رباعیات سے اس انتخاب کا آغاز کرتے ہیں :

خواجہ اجمیری :

شاہ است حسینؑ ، بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ ، دین پناہ است حسینؑ
سر داد' نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

کاری کہ حسینؑ اختیاری کردی
در گلشن مصطفیٰ بہاری کردی
از ہیچ پیغمبری نیاید ایں کار
واللہ کہ اے حسینؑ! کاری کر دی

میر تقی میر:

اترا تھا غریبانہ کنارے آ کر
لب خشک موا سو نورِ چشمِ حیدرؑ
تر حلق' دمِ آب سے اس کا نہ ہوا
اے آبِ فرات! خاک ترے سر پر

میر انیس :

بالیدہ ہوں' وہ اوج مجھے آج ملا
ظلِ علم' صاحب معراج ملا
منبر پہ نشست' سر پہ حضرت کا علم
اب چاہیے کیا' تخت ملا تاج ملا

میر انیس :

حاصل جو شہِ دیں کی حضوری ہو جائے

لاکھوں منزل سفر سے دوری ہو جائے
قدسی کہتے ہیں، کربلا ہے وہ بہشت
ناری بھی اگر جائے تو نوری ہو جائے

میر انیسؔ:

مجلس میں عجیب بہار چشمِ تر ہے
ہر لختِ جگر رشکِ گلِ احمر ہے
اشکوں سے ہو کیوں نہ ابرو آنکھوں کی
بے قدر ہے وہ صدف، جو بے گوہر ہے

شیخ ناسخؔ:

تھم جائیں غمِ شاہ میں کیوں کر آنسو
جاری ہی رہیں گے زندگی بھر آنسو
پیتا ہوں جو یادِ عطشِ شاہ میں آب
بہتا ہے چشمِ تر سے بن کر آنسو

میر انیسؔ:

رومال ہے اشکوں سے بھگونے کے لیے
یہ راتیں، یہ دن، نہیں ہیں سونے کے لیے
ہنسنے کے لیے تو سال بھر ہے یارو
دس دن محرم کے ہیں رونے کے لیے

دبیرؔ:

دنیا سے اٹھا، لے کے جو نام حیدرؑ
جنت کو چلا، بہر سلامِ حیدرؑ
عصیاں ہوئے سد راہ تو رضواں نے کہا
آنے دو اسے، یہ ہے غلامِ حیدرؑ

میر انیسؔ:

کیا مرتبہ سلطانِ حجازیؐ کا ہے
کیا عزو شرف امامِ غازی کا ہے

سجدے کا نشاں دیکھ کر سب کہتے ہیں
نیزے پہ سر کس نمازی کا ہے

مرزا دبیرؔ:

اشکِ غمِ شبیرؑ درِ یکتا ہے
ہر دیدہ حق بیں سے یہ در پیدا ہے
بے اشک عزا آبروئے چشم ہے خاک
پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے

جوشؔ ملیح آبادی:

سینے پہ مرے نقش قدم کس کا ہے
رندی میں یہ اجلال و حشم کس کا ہے
زاہد! مرے اس ہات کے ساغر کو نہ دیکھ
یہ دیکھ کہ اس سر پہ علم کس کا ہے

حالیؔ:

کیا پاس تھا قولِ حق کا؟ اللہ اللہ!
تنہا تھے، پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

نجمؔ آفندی:

مفہومِ عزا جاننے والے کم ہیں
احسان کو گرداننے والے کم ہیں
شبیرؑ ترے ماننے والے ہیں بہت
لیکن ترے پہچاننے والے کم ہیں

ذوقؔ:

سبطینِ نبیؐ، یعنی حسنؑ اور حسینؑ

زہراؑ و علیؑ: دونوں کے وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لیے
اے ذوق! لگا آنکھوں سے ان کی نعلین

جوشؔ ملیح آبادی:

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ
چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی: ہمارے ہیں حسینؑ

جوشؔ ملیح آبادی:

اوہام کو ہر اک قدم پہ ٹھکراتے ہیں
ادیان سے ہر گام پہ ٹکراتے ہیں
لیکن جس وقت کوئی کہتا ہے حسینؑ
ہم اہلِ خرابات بھی جھک جاتے ہیں

مومنؔ:

روتا ہوں، حسینؑ ابن علیؑ کے غم میں
ہے عیش جہاں کی آرزو اس ماتم میں
حیف آلِ نبیؐ میں کوئی باقی نہ رہا
لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

نجمؔ آفندی:

مولاؑ کا استغاثہ ہے، ترے حافظہ میں
مجلس کی حاضری سے، منبر کی آگہی سے
یہ قول بھی سنا ہے، سلطانِ کربلا کا
عزت کی موت اچھی، ذلت کی زندگی سے

مونسؔ:

مردک نے شہنشاہ سے بیعت چاہی
گمراہ نے کس راہ سے بیعت چاہی
مصداق ہوا آیہ تبت کا یزید
فرزند ید اللہ سے بیعت چاہی

☆......☆......☆

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

حمیرا رحمٰن کے ایک شعر کا تنقیدی' تحلیلی اور تفصیلی تجزیہ

وہ لمحہ جب مرے بچے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کتنا گھنا درخت ہوئی

نیو یارک لانگ آئی لینڈ میں تیرہ ستمبر ۹۷ء کی شام کو دوئی عالمی علامہ اقبال مشاعرے میں راولپنڈی پاکستان سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''چہار سو'' مجھے ملا' جس کی مجلس ادارت میں بحیثیت مدیر اعلیٰ سید ضمیر جعفری' اور جناب گلزار جاوید بحیثیت مدیر مسول شامل ہیں- ماہنامہ ''چہار سو'' کے سرورق پر محترمہ حمیرا رحمٰن کی تصویر اور ان کا فوق ذکر شعر لکھا تھا- اگر چہ میری ذہنی یادداشت میں یہ شعر محفوظ تھا' لیکن مجھے قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ شعر ہمارے نیویارک کی شاعرہ حمیرا کا ہے- چند مہینے قبل جناب ضمیر جعفری نے مجھے حمیرا رحمٰن کے شعری اسلوب پر مضمون لکھنے کے لیے یادداشت روانہ کی' لیکن میری گوناگوں مصروفیات اور حمیرا رحمٰن کے مجموعہ کلام کی عدم دسترس کی وجہ سے موصوف کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا- اگر چہ اغلب آرا دہندوں کی طرح سے تشریفائی الفاظ کا گلدستہ پیش کر سکتا تھا- جس میں عموماً صاحب کلام کے کمال کا کوئی خاص جوہر پیش نہیں کیا جاتا؛ لیکن بہرحال یہ فعل میری عادت کے خلاف تھا اس لیے سکوت اختیار کیا-

سترہ الفاظ میں ڈھلا ہوا یہ شعر' جو ایک لفظ عربی' دو الفاظ فارسی اور چودہ عام رائج اردو کے لفظوں سے بنا ہے؛ سراپا آمد ہی آمد ہے- یہ اس قدرتی چشمے کی مانند ہے جو پتھر کا سینہ چاک کر کے بہتا ہے- یہ سادہ شعر اگر چہ صنائع معنوی اور صنائع لفظی ہی نہیں' بلکہ اضافت اور شوکت الفاظ سے مبرا ہے' لیکن فصاحت کے عیوب سے بھی پاک ہے-

مصرعے کے لغوی معنی کواڑ یا پٹ کے ہوتے ہیں- شعر کا اصلی حسن دونوں مصرعوں کے آپس میں اس طرح کھپ جانے میں ہے جس طرح ایک دروازے میں دو پٹ- اچھے شعر کا حسن یہ بھی ہے کہ مصرع اولی سے مصرع ثانی بلند و بالا ہو- اگر مصرع اول سوالیہ ہو تو مصرع ثانی جواب' پہلا اضطراب تو دوسرا تشفی' اول تشنگی تو دوم تسکین-

اعلیٰ ترین شعر کی شناخت یہ ہے کہ قاری مصرع ثانی کو پڑھنے کے بعد خود بخود' دوبارہ مصرع اول کو پڑھے اور بے خود ہو جائے- اس کا قلب شاعر کے خیال کی عظمت کے آگے جھک جائے اور زبان سے داد اور رگوں میں مسرت اور سرور کی لہر دوڑنے لگے- عموماً ایسے اشعار الہامی ہوتے ہیں' جس کو شاعر ایک خاص کیفیت میں کہتا ہے ؛ البتہ یہ کیفیت بجلی کی چمک کی طرح مختصر اور بے ارادہ ہوتی ہے-

حمیرا کے شعر کے پہلے مصرعے میں بلا کا تحیر' تصور' تیقن اور طمطراق موجود ہے- پہلا مصرع لفظ ماں کی وجہ سے اتنا بلند و برتر ہو گیا کہ مصرع ثانی کا اس سے بلند ہونا محال نظر آنے لگا- سامع اس سوچ میں پڑ گیا کہ شاعر کس طرح اس آسمان صفت مصرعے پر دوسرا مصرع لگا سکے گا' جو شعری کیفیت کو نبھا سکے-

جس طرح معمار کسی ساختمان میں ایک Key Stone یا سنگ کلیدی کو نصب کرتا ہے جس پر تمام ساختمان کے وزن کا انحصار ہوتا ہے ؛ اس طرح ہر شعر میں ایک کلیدی لفظ ہوتا ہے جو شعری توازن کو برقرار رکھتا ہے- یہ شعری توازن ؛ بحر' قافیہ' ردیف یا شعری وزن سے بالکل مختلف ہوتا ہے- یہ توازن درحقیقت کسی لفظ میں پوشیدہ ہوتا ہے- اس لفظ کے لیے ضروری نہیں کہ یہ شعر کے اوسط میں واقع ہو' بلکہ یہ لفظ موج کے مرکز کی طرح کسی بھی مصرعے میں' کسی بھی مقام پر' مستقل طور پر جما رہتا ہے- اگر یہ کلیدی لفظ کسی شعر میں اس کے ہم وزن اور ہم معنی لفظ سے بدل جائے تو شعر عروضی طور پر تو صحیح رہے گا' لیکن اس کی شعریت تقریباً تمام ہو جائے گی-

جس طرح عوام کسی بھی عمارت کے ظاہری منظر پر زیادہ توجہ دیتے ہیں' اسی طرح قارئین بھی سجاوٹی الفاظ سے متاثر ہو کر شعر کی تعریف اور داد دیتے ہیں اور سنگ کلیدی کی طرح لفظ کلیدی بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہی رہتا ہے- یہ ایک حقیقت ہے کہ سجاوٹی یا توصیفی الفاظ کا رنگ جتنا گہرا اور انوکھا ہو گا' اس کی کشش اتنی ہی زیادہ ہو گی-

شاخ اور درخت کے فرق کو واضح کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ صنفِ نسواں کے چار اہم روپ' یعنی : بیٹی' بہن' بیوی اور ماں کو شعری میزان پر تولا جائے- بیٹی کا رشتہ عورت ذات کا پہلا روپ ہے' جو محبت' خلوص اور ایثار کے رنگوں سے بنا نظر آتا ہے- اس کا دوسرا رشتہ بہن ہے' جو درد' الفت اور رحم کے تاروں سے سجایا گیا ہے- تیسرا رخ بیوی ہے' جو عشوہ' ناز اور جذبات کا سرچشمہ ہے- یہ رشتہ نزدیک ترین اور رنگین ترین رشتہ ہوتے ہوئے بھی جس طرح صرف ایک قرار داد سے بنتا ہے' اسی طرح آسانی سے ٹوٹ بھی سکتا ہے-

عورت کا چوتھا اور سب سے اہم روپ' جو اس کی جنسیت کا تکمیلہ بھی ہے: رشتہ مادری ہے- یہ رشتہ بچے اور ماں کے درمیان اس وقت قائم ہوتا ہے جب بچہ ماں کے بطن میں نہاں رہتا ہے اور پھر زندگی کے آخرین لمحات تک باقی رہتا ہے- یہ رشتہ بنانے سے نہیں بنتا اور توڑنے سے نہیں ٹوٹتا' یہ رشتہ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہوتا ہے-

اردو شاعری میں لفظ شاخ؛ آزاد شکل میں یا اضافت اور صفت کے اضافہ کے ساتھ' فراواں نظر آتا ہے۔ شاخِ گل' ہری شاخ' شاخِ غزال وغیرہ بہت ہی گھسے پٹے الفاظ ہیں' جن میں نیا رنگ بھرنا مشکل کام ہے- شاخ کا معنوی مفہوم ٹکڑا حصہ یا جز ہے جو اپنی نشو ونما کے لیے کسی کل یا دوسرے کا محتاج ہے لیکن اس کا شعری مفہوم ایثار محبت' خوبصورتی' لچک' زیبائی' ناز اور عشوہ گری ہے' شاخ عورت کے تین روپ بیٹی' بہن اور بیوی کی اجمالی اور جمالی تصویر ہے-

درخت' اس کے برخلاف ؛ بردباری' خدمت' فداکاری اور ثمر آوری کا نام ہے- گھنا درخت دھوپ کی شدت میں سایا' گرمی کی حدت میں ٹھنڈی ہوا' بارش کی زحمت میں سایہ رحمت' پھول اور پھل سے لذت عطا کرتا ہے- یہ مسافروں کے لیے آرام گاہ' پرندوں کے لیے نشیمن فراہم کرتا ہے- درخت' بذاتِ خود ؛ ایک مستقل ادارہ کی طرح ہر موسم و ہر زمانے میں اپنے قدموں پر ایسا جما رہتا ہے کہ آندھی اور طوفان اس کے مقابلے میں ہار جاتے ہیں-

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام اوصاف ماں کی ممتا میں نظر آتے ہیں؟ اور کیا گھنے درخت سے بھی سندر اور دلکش کوئی نام ممتا کو دیا جا سکتا ہے؟ یہ ہے حمیرا کے شعر کا جمالی اوج اور ارتقا' جس میں شاعر نے ممتا کے کردار کو درخت کے سبز رنگ میں ایسا رنگ

دیا کہ تمام شعر سبزہ زار نظر آنے لگا۔

البتہ تخم کو درخت بننے میں یا شاخ کو درخت ہونے میں ایک عرصہ درکار ہے اور یہی اس شعر کا ہیجان یا Suspence ہے۔ یہاں یہ مدت یا یہ طویل فاصلہ ایک ہی لمحے میں طے ہوا اور وہ لمحہ جب بچے نے پہلی بار ماں کہا۔ وہ لمحہ کوئی بھی ماں کبھی بھی بھول نہیں سکتی اور اس لمحے کی خوش حالی اور سکون کی کوئی لفظ بھی ترجمانی نہیں کر سکتا' یہاں صرف رمز اور کنایہ میں یہ بات چیت ہو سکتی ہے اور اسی وجہ سے ایسا شعر زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

اردو شاعری میں نسوانی جذبات اور صنف نازک کی بات چیت کو صدیوں قبل لازم جانا گیا' اسی لیے ریختی کا شہرہ اس طرح عام ہوا کہ میر تقی میر کے حوالے سے مرزا غالب کو بھی کہنا پڑا:

ریختی کے تمھی استاد نہیں ہو غالبؔ!
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اگرچہ ریختی جس مقصد کے لیے ڈھالی گئی تھی' آگے چل کر اس کے قالب میں تبدیلی کی گئی اور اس کے مصرف میں غیر معرفی اضافہ کیا گیا۔ بہرحال' یہ بحث اس گفتگو سے خارج ہے اور ہم اس مقام پر اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔

چونکہ برصغیر کا مردانہ ماحول عورت کو گوشہ گیر کر چکا تھا اور محافل و مجالس و مشاعروں میں عورت کا منہ کھولنا عیب سمجھا جاتا تھا' اس لیے کئی صدیوں تک اس ظلم نے نسوانی جذبات کو پروان ہونے نہ دیا؛ البتہ یہ ان خواتین کی مجاہدانہ روش تھی کہ طلب اور سماعت اور تحسین نہ ہونے کے باوجود پردے میں رہ کر اپنی قابلیت اور استعداد شعری کی نقاب کشی کرتی رہیں۔ کئی قدیم تذکروں میں خواتین شاعرات کے نام' اور بعضے مقامات پہ ایک دو اشعار' بھی ملتے ہیں' جو ان کی اعلیٰ فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے میں خیالات اور میلانات نسوانی کے طوفان کو زنجیروں میں جکڑا نہ جا سکا' چنانچہ اردو شعر و ادب کی اب کوئی بھی محفل شاعرات کے بغیر سجائی ہی نہیں جا سکتی' جس میں اگرچہ مردوں کی نامردانہ سیاسی کاروائیاں ہر وقت ان کو ایک پلیٹ فارم پہ جمع ہونے سے روکنے کی ناکام کوششیں کرتی نظر آتی ہیں۔ ہمارے شہر نیویارک

اور اس کے گرد و نواح میں ممتاز شاعرات مشغولِ شاعری' یا بقول معروف: مشغول جہاد ہیں۔ جس طرح گلستان میں ایک پھول سے دوسرے پھول کا یا ایک پھل سے دوسرے پھل کا مقابلہ صحیح نظر نہیں آتا' اسی طرح میری نظر میں ان شاعرات کا تقابل بے معنی اور عبث ہے۔ اس مقام پر یہ ذکر بے محل نہیں کہ ڈاکٹر صبیحہ صبا سائنس کی طالب علم ہوتے ہوئے بھی شعر و ادب کی زینت ہیں۔ کلاسیکل غزل میں انفرادی رنگ' غم انساں اور غم دوراں کی آمیزش کے راز سے واقفیت ان کا مہکتا انداز ہے۔ محترمہ زریں یاسین کی شاعری میں نرم لہجہ' پھولوں کی بات چیت اور الفت کا ساز ہے۔ محترمہ فرحت زاہد کی شاعری میں ناز کے ساتھ ساتھ احتجاج ہے' جو حق کی صدائے بازگشت ہے۔ اگرچہ ان تمام شاعرات کے خیالات اس قدر مختلف ہیں' جیسے مشرق' مغرب' شمال اور جنوب کی سرحدیں' لیکن اس کے باوجود ان کے خیالات' فکری امکانات اور رجحانات کیوس نسوانیت کے دائرے سے باہر نہیں' جو شاعری کا جوہر اصلی ہے۔

مشہور روایت ہے کہ میر انیس اپنے خانوادے کے ساتھ دسترخوان پر خاموش بیٹھے سوچ رہے تھے۔ آپ کی بڑی صاحبزادی' جو آگے چل کر مشہور مرثیہ گو شاعر پیارے میاں رشید کی والدہ ہوئیں ؛ نے خاموشی کا سبب پوچھا تو میر صاحب نے فرمایا کہ بیٹی میں ایک بند مرثیہ کو قلم بند کرنا چاہتا ہوں' مگر ٹیپ کے مصرع کا جوابی مصرع تیار نہیں ہو رہا۔ یہ بند شہزادی زینب کے نسوانی جذبات میں لبریز آرزو اور دعا سے متعلق کچھ یوں ہے۔

یا رب! رسولؐ پاک کی کھیتی ہری رہے

کچھ دیر نہ گزری تھی کہ میر انیس کی صاحبزادی نے کہا: بابا! لیجیے اسے ہماری زبان سے یوں پورا کر لیجیے:

میر انیس جیسے عظیم شاعر نے اپنے زانو پہ ہاتھ مار کر کہا: بیٹی ! بخدا میں ایسا مصرع نہیں باندھ سکتا تھا۔ یہ ایک نسوانی جذبے کی ترجمانی ہے' جس کی ایک عورت ہی پوری طرح عکاسی کر سکتی ہے۔ یقیناً سہاگ اور اولاد کی سلامتی کی دعا میں مانگ اور گود سے بڑھ کر رنگین جذباتی الفاظ اور کیا ہو سکتے ہیں۔

اس گفتگو کے اختتام پر یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ حمیرا رحمٰن کے اس شعر نے

دامن شاعری میں وہ نگینہ لگایا' جس کو عظیم سے عظیم مرد شاعر بھی نہ لگا سکا۔ یقیناً' اگر دور حاضر کی شاعری سے شاعرات کے فکر و خیال کو علیحدہ کر دیا جائے تو ایسے خلا ہو گا' جس کا پر کرنا ناممکن ہو گا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ حقیقت بیانی سے کام لوں اور بقول علامہ اقبالؔ۔

میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

☆......☆......☆

علامہ اقبال اور مہاراجا کرکشن پرشاد

مہاراجا کشن پرشاد' مہاراجا نریندر بہادر کے فرزند اور مہاراجا چندولعل بہادر کے پوتے تھے' جن کے جد راجا ٹوڈرمل' شہنشاہ اکبر کے وزیر مالگزاری تھے' جن کا اصلی وطن لاہور تھا۔ مہاراجا خوش اخلاق' ادب نواز اور گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار تھے۔ آپ کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر تھے اور شاد تخلص کرتے تھے۔ اردو اور فارسی میں نعتیہ اشعار بھی کہتے تھے۔ آپ کی نعتوں کا مجموعہ آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ آپ کے کچھ نعتیہ اشعار آج بھی مسجد نبوی سے منسلک شیخ الاسلام کتب خانہ کی دیوار پر نقش ہیں۔ مہاراجا کو اردو کے علاوہ انگریزی اور مقامی زبانوں پر کافی عبور حاصل تھا۔ مہاراجا سپاہ گری' علم رمل' علم نجوم' خطاطی' نقاشی کے علاوہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی سالانہ جاگیر سولہ لاکھ روپیوں سے متجاوز تھی۔ ڈیوڑھی شرافانہ تھی لیکن عادت فقرانہ اور درویشانہ۔ مہاراجا کی چار مسلمان بیویاں اور تین ہندو بیویاں تھیں۔ مسلمان بیوی کی اولاد کو مسلمان طریقے سے پرورش کرتے اور ان کے لیے مسلمان گھروں میں رشتے کرتے تھے۔ ہندو بیوی کی اولاد کو ہندو طریقے سے پرورش کر کے ان کے لیے ہندو گھروں سے رشتے قائم کرتے۔ خود مسجد بھی جاتے اور سورہائے قرآنی کی تلاوت کرتے' اور مندر بھی جا کر عقیدت کا اظہار کرتے۔ آپ کی زندگی کے آخری دور میں افواہ پھیلی تھی کہ مہاراجا مسلمان ہو چکے ہیں' لیکن یہ بات غلط تھی؛ چنانچہ کسی مقام پر حضور نظام کو مخاطب ہو کر کہا تھا: تو خدا پرشاد ہے' میں کشن پرشاد ہوں۔

موصوف کی وصیت کے مطابق' ۱۹۴۰ء میں انتقال کے بعد ان کی آخری رسومات ہندو دھرم کے طریقے پر انجام دی گئیں اور ان کے بیٹے' جو ہندو بیوی کے بطن سے تھے؛ ان کے جانشین قرار دیے گئے' جن کو کچھ عرصے بعد ایک انگریز سپاہی نے' اس کی معشوقہ سے روابط رکھنے کی وجہ سے' بمبئی میں تاج محل ہوٹل کے اوپری طبقہ سے پھینک

کر قتل کر ڈالا۔

کچھ عرصے قبل میری ملاقات نواب معین جنگ بہادر کے پوتے نواب تقی علی خان صاحب سے شمالی امریکہ میں ہوئی' جنھوں نے مختلف حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے مہاراجا کے بڑے فرزند نواب اسد اللہ خان کی شادی' جو نواب داؤد جنگ کی چھوٹی لڑکی قیصر النساء بیگم سے ہوئی' اس کی تفصیلی روداد بیان فرمائی' جو مکمل طور پر ایک مسلمان اشرافی خاندان کے گھر کی شادی کی تصویر تھی۔

علامہ اقبالؔ اور مہاراجا کے تعلقات کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مہاراجا کے جد کا تعلق پنجاب کی سرزمین سے ہونے کے علاوہ' مہاراجا اقبالؔ کی طرح فقرانہ عادت اور درویش صفت اوصاف اور صوفیانہ خیالات سے ہمکنار تھے۔ اقبالؔ کی طرح مہاراجا بھی داغؔ دہلوی کے ان شاگردوں میں شامل تھے جن پر داغؔ کو فخر حاصل تھا۔ اقبالؔ کی طرح مہاراجا بھی اردو اور فارسی میں اشعار کہتے اور مہاراجا کو بھی حضورؐ اکرم سے نہایت محبت اور عقیدت حاصل تھی' جو ان کے مجموعہ نعت سے ظاہر ہے۔ مہاراجا' علامہ اقبالؔ کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور قدر دانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ علامہ اقبالؔ پر نادان مولویوں اور دانا متعصب ہندوؤں کے اعتراضات کا طوفان تمام برصغیر میں پھیلا ہوا تھا۔ نادان مولویوں' جن کی ایک معمولی مثال مولوی دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان کا فتوی ہے' جس میں انھوں نے علامہ اقبالؔ کو کافر اور مسلمانوں کو علامہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا ان کے معاشرت برقرار رکھنے کو عظیم گناہ قلم بند کیا تھا۔ دوسری طرف اردوے معلی کے حامیوں کی آڑ لے کر چند دانا ہندو ادیب' جن میں برقؔ ملسیانی کے والد جوشؔ ملسیانی سرفہرست ہیں' جنھوں نے مستعار نام حضرت جراح کے ساتھ اقبالؔ کی زبان دانی اور ان کے کلام کی فنی غلطیوں پر لاہور کے اخبار ''پارس'' میں مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ مجلّہ ''اردوے معلی'' میں حسرت موہانی اور برج نرائن چکبستؔ لکھنوی کے علاوہ ''اودھ پنچ'' اخبار میں دیگر قابل افراد نے بھی علامہ اقبالؔ کی بڑھتی ہوئی شہرت سے حسد کر کے علامہ کے کلام کو غلط اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ ایک اور محاذ پر شادی لعل جیسے افراد' علامہ کے قلم سے رواں طوفان کو روکنے میں شبانہ روز مصروف تھے۔ بہرحال' ان حالات میں مہاراجا کی مکمل ہمدردی علامہ اقبالؔ کے ساتھ تھی اور اسی لیے یہ دوستانہ تعلقات اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ مراسلاتی تحریروں سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ مہاراجا

اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں میں بھی علامہ اقبال سے مشاورت کیا کرتے تھے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو مہاراجا لاہور تشریف لائے اقبال تمام مدت مہاراجا کے ساتھ رہے۔ لاہور میں قیام کے دوران مہاراجا نے محسوس کیا کہ اقبال تنگ دستی کا شکار ہیں کیونکہ تین بیویاں اور دو بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ زمانے کی نیرنگیاں اقبال کو نشانہ بنائے ہوئیں ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد پہنچ کر فوراً اقبال کی معاشی حالت کو بہتر کرنے کا بندوبست کیا۔ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ مہاراجا نے کیا مبلغ یا پیشہاد اقبال کے لیے کی' لیکن اقبال کے خط سے یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے اسے قبول نہیں کیا اور واپس کر دیا۔ ان کے اس خط کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ ''مجھے معلوم نہیں' کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ دوست نوازی اور غریب پروری آپ کا خاندانی وطیرہ ہے۔ آپ کا یہ فیض مجھے ایک لمحے میں ثروت مند کر دے گا لیکن میری طبیعت اور میری دیانت داری کا یہ تقاضا نہیں کہ اجرت تو آپ سے حاصل کروں اور اس کے مقابل آپ کا کوئی کام نہ کر سکوں۔ ہمیشہ کی طرح اقبال آپ کا معنوی دوست ہے اور رہے گا۔ آپ نے جو اپنے صمیم قلب سے محبت کی ہے' وہ ہمیشہ دوستی کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔''

فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے غم اور دکھ صرف اسی شخص سے بیان کرتا ہے' جسے اس سے محبت اور ہمدردی ہو۔ ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ امام بی نے انتقال کیا۔ اس وقت اقبال کی عمر ۳۷ سال تھی۔ ''ذکر اقبال'' کے مصنف عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ جب میں پرسہ دینے کے لیے اقبال کے گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ اقبال اپنی ماں کو یاد کر کے اس طرح رو رہے تھے جس طرح ایک نابالغ فرزند اپنی ماں کو روتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ جناب اکبر الہ آبادی نے علامہ کی والدہ کی وفات پر فارسی میں قطعہ تاریخ وفات لکھا' جو مرحومہ کی قبر پر کندہ ہے:

مادر مرحومہ اقبال رفت
سوی جنت زین جہان بی ثبات
گفت اکبر با دل پر درد و غم
رحلت مخدومہ تاریخ وفات

بہرحال پرسے کے خط کا جواب علامہ کی طرف سے' مہاراجا سے ان کے گہرے قلبی تعلقات کی دستاویز ہے۔ حکومت انگلستان نے ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال کو سر کا

خطاب دیا- علامہ نے مہاراجا کو خط کے جواب میں لکھا کہ یہ خطاب مجھے حکومت انگلستان نے "اسرار خودی" کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا ہے' جس پر انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے باعث' یورپ اور امریکہ میں کئی تفاسیر اور تبصرے شائع ہوئے ہیں-

جب ہندو مسلم فسادات کے شعلے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے اور پنجاب بھی اس کی زد میں شعلہ ور تھا' اس وقت ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبال نے مہاراجا کو خط میں لکھا کہ افسوس کی بات یہ ہے کہ پنجاب میں بھی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور عداوت اپنی اوج پر پہنچ چکی ہے' اور اگر یہی حال جاری رہے تو آیندہ تیس سالوں میں ان ملتوں کا مل کر زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گا- حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی یہ پیشین گوئی بھی بالکل صحیح نکلی' چنانچہ اس یادداشت کے کوئی ۲۵ سال بعد برصغر میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا- علامہ اقبال کے انتقال کے کوئی تین مہینے قبل' جنوری ۱۹۳۸ء میں وزیر اعظم حیدر آباد دکن سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپیا کا چیک بھیجا' جو یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے دیا گیا- ایک ماتحت افسر کی غلطی کے سبب سے چیک کے ہمراہ یہ لکھا گیا کہ یہ رقم زکواۃ کی مد سے دی گئی- چنانچہ علامہ نے اس چیک کو واپس کرتے ہوئے چودہ اشعار بھیجے' جس کے آخری دو اشعار یہ ہیں:

میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے' یہ ہے میری خدائی کی زکات

☆......☆......☆

کسی جا تھا ''مجموعہ'' سلطان کا
فقہ اور تھی شرح اس کی کہیں
فتاویٰ کہیں ''شرح زیدی'' کہیں
صفا کا کوئی ''روضہ'' پڑھتا رہا
کوئی دور اخلاق کرتا رہا
کوئی نحوی ''زرّادی'' پڑھتا رہا
کوئی ''شرح ملا'' کو دیکھا کیا
کہیں ''گلستاں'' کوئی پڑھتا ملا
کوئی ''بوستان '' میں تھا کھویا ہوا
کوئی ''طوطے نامہ'' لیا آ گیا
کوئی ''باری واحد'' سمجھنے لگا
ابو الفضل شر نامہ درج نصاب
''قرآن'' اور ''دیوان حافظ'' جناب
''بہار خرد'' نامہ محمود کا
لغت ''کشف'' کا ایک رکھا ہوا
وہاں درس ''در مجالس'' بھی تھا
مگر ساتھ ہی اس کے ''جنگ نامہ'' بھی تھا
زلیخا و یوسف کا افسانہ تھا
دمن نل کا قصہ بھی شامل رہا

یقیناً وارث شاہ اور مجاہد یکتا کا یہ فنی کمال تھا کہ ان سلیس، آبدار اشعار میں ادق اور سنگین کتابوں کے اسم و تذکرے اس خوبصورتی سے جمائے کہ جیسے ایک ماہر جوہری رنگ برنگ کے قیمتی پتھروں کو کنگن میں جڑ دے۔ وارث شاہ کو پنجابی ادب کا شیکسپیئر یا کالی داس یا فردوسی کہنا اس لیے بجا ہے کہ آپ کو تمام تر علوم متداولہ پر عبور حاصل تھا۔ یہی نہیں، بلکہ آپ کا تاریخ اسلام، احادیث اور تفسیر قرآن کا گہرا مطالعہ تھا۔ چند اشعار، جن کی تضمین آیات اور احادیث پر کی گئی ہے، پیش کیے جا رہے ہیں:

سبھی کچھ ہے وارث کی گفتار میں

حقیقت میں قرآں ہے اشعار میں
انھی نے تو الفقر فخری کہا
انھی نے تو الفقر منی کہا
نہ کر اس میں افراط' تفریط تو
کلو لو شر بو اولا تسرفو
کبھی ہونا' مجھ سے' نہ بے آس تو
کہا حق نے قرآں میں لا تقنطو
بہ تاکید' آدم سے' حق نے کہا
ولا تقربا هذه لشجرة
کسی کو وہاں ہم نے کہتے سنا
فاین هلمه هناد ذیبا
فان مع العسر یسرا کہا
مدد کرنے میری وہی آئے گی

یہاں جتنی بھی ستائش وتعریف جناب وارث شاہ کی کی جائے' اس درجہ کی قدر وتہنیت کے حق دار یکتا مرحوم بھی ہیں جنھوں نے ادبی مطالب کو سلیس اردو میں منتقل کیا۔

وارث شاہ نے ہیر کی شادی کی تقریب کو بڑے ہی شکوہ اور دلکش انداز میں نظم کیا۔ چند اشعار میں دس بارہ اقسام کی مٹھائیوں کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

شکر پارے تھالوں میں بھر کر رکھے
نکمں اور بوندی بھرے خوانچے
جلیبی' لڈو' بالو شاہی بھی تھی
دھری گل بہشتی تھی میوے بھری
قطائی تھی' بیدانی اور گلگلے
نکوی سے پر تھے کئی خوانچے

مختلف چاول کے نام اور پھر زیورات کے اقسام دیکھیے:

کہیں زرد مشکی' کہیں بیگمی

ہم دہلی آئے تھے' لاہور قریب تھا' تم کیوں ہماری ملاقات کو نہ آئے؟ اقبالؔ نے جواب دیا کہ اس روز بیمار تھا' چنانچہ اب اس ایک روز کی تلافی کے لیے ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ حضور نظام اس جواب کو سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں تمھیں وزیر قانون بناؤں گا۔ اقبالؔ نے فوراً جواب دیا: سرکار میری خواہش یہ ہے کہ مجھے آزاد ہی رکھیے۔ پھر اقبالؔ نے حضور نظام سے آیندہ سال کے لیے انجمن حمایت اسلام کے جلسے کی صدارت کی درخواست کی۔ نظام نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے پنجاب نہ جا سکے۔ علامہ اقبالؔ ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدر آباد سے جنوبی ہندوستان کا دورہ ختم کر کے لاہور کے مقصد کے لیے روانہ ہوئے۔ علامہ نے مدراس' میسور' بنگلور اور حیدر آباد دکن میں اجتہاد اور فلسفہ اسلامی پر تقاریر کیں۔ موصوف نے بعد میں حبیب حال لاہور میں جو مقالہ پڑھا وہ وہی مقالہ : اسلام میں اجتہاد تھا' جسے وہ حیدر آباد میں پڑھ چکے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے کی صدارت کے لیے علامہ اقبالؔ کو حیدر آباد جانا تھا' لیکن علامہ اپنی مصروفیات اور بیماری کی وجہ سے حیدر آباد نہ جا سکے اور اسی لیے نواب صادق علی خان والی بہاولپور نے جلسے کی صدارت کی۔

☆......☆......☆

رزمیہ شاعری کے خدائے سخن : میر انیسؔ

رزمیہ اور المیہ عناصر سے مرثیہ کو انیس نے آفاقی سخن بنا دیا

جناب شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں بہت سچ کہا ہے کہ فارسی ادب میں کوئی نامور شاعر ایسا نہیں ملے گا جس نے شاہوں' امراؤں اور اپنے زمانے کے حکمرانوں کی مدح و ستائش میں قصیدے نہ لکھے ہوں۔ رودکی ہو کہ عنصری' فردوسی ہو کہ سعدی' ناصر خسرو ہو کہ حافظ' امیر خسرو ہو کہ فیضی وغیرہ : سب نے قصیدوں سے اپنے دفتر سیاہ کیے اور اسی کے عوض اغلب ان کے منہ جواہرات سے بھر دیے گئے کیونکہ حکمران جانتے تھے اگر یہ منہ خالی رہیں گے تو چپ نہیں رہیں گے اور ہجویات کہ کر دل کو ٹھنڈا کر لیں گے۔ یہی حال کم و بیش اردو شعرا کے ساتھ بھی رہا' لیکن میر انیس صرف وہ عظیم واحد شاعر ہیں جنھوں نے زندگی بھر کسی بادشاہ یا کسی حکمران کی شان میں قصیدہ یا ہجو نہیں رقم کیا۔ اپنے کلکِ جوہر نگار کو صرف مداحیِ محمدؐ و آلِ محمدؐ میں وقف کر دیا۔

خود فرماتے ہیں :

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیرِ اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب' ہم واں قدم رکھتے ہیں
کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے
کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

چنانچہ خدا نے میر انیس کو اپنے ہم عصروں میں ہر لحاظ سے ممتاز کیا اسی لیے میر انیس نے مالی فراغت کے ساتھ قناعت اور سخاوت کا پیشہ اختیار کیا۔ اپنے ہی پیسوں سے فیض آباد

میں امام باڑہ بنوایا' جو غدر میں گولہ بارود کی نذر ہو گیا- مرتے وقت جائیداد' باغات کے علاوہ ۲۵ ہزار روپے نقد اور ۱۲ ہزار کا اثاثہ چھوڑا جو کل ورثا میں تقسیم کر دیا گیا- میر انیس جن برگزیدہ شخصیتوں کے کردار اور اخلاق کی عکاسی کرنا چاہتے تھے ان کی آفاقی کیفیت کا تصور بہت مشکل تھا اس لیے بہت احتیاط' انکساری اور عجز سے اپنی ہیچ دانی کا اعتراف کرتے تھے- ایک مقام پر فرماتے ہیں-

میں کیا ہوں مری طبع ہے کیا اے شہ شاہان
حسان و فرزدق ہیں یہاں عاجز و حیران
شرمندہ زمانے سے گئے' وائل و سحبان
قاصر ہیں' سخن فہم و سخن سنج و سخن دان
کیا مدح' کف خاک سے ہو نور خدا کی
لکنت یہاں کرتی ہیں' زبانیں فصحا کی

پھر فرماتے ہیں:

انیس! عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ غلام ابوتراب نہ تھا

انیسویں صدی میں مرثیے کے سنہری دور سے پہلے' اردو شعر و ادب میں رزمیہ شاعری (EPIC) نہ ہونے کے برابر تھی' جبکہ عالمی ادب رزمیہ عناصر سے درخشاں تھا- یونان کے عظیم شاعر ہومر کی ''الیڈ'' مشہور اطالوی شاعر واجل کی انیڈ (AENEID)' طالو کی ''یروشلم آزاد' اسپنسر کی ''فیری کوئن'' Faerie Queen' ڈانٹے کی ''طربیہ ربانی'' (Devine Comedy) والمیک کی سنسکرت میں ''مہابھارت'' تلسی داس کی بھاشا میں ''رامائن'' فردوسی کا ''شاہنامہ'' نظامی کا ''سکندر نامہ'' وغیرہ نے عالمی ادب کو رزمیہ شاہکاروں سے بھر دیا تھا لیکن اردو کا دامن بالکل خالی تھا- چنانچہ اس کمی کو بڑی حد تک میر انیس اور کسی حد تک مرزا دبیر نے اس طرح پورا کیا کہ عظیم ناقدین اردو کو یہ کہنا پڑا کہ اردو میں مرثیہ دوسری زبانوں کی رزمیہ کا بدل ہے' اور بقول پروفیسر مسعود حسن ادیب میر انیس نے رزمیہ شاعری کی تقریباً تمام شرطیں پوری کر دی ہیں-

مرثیوں میں رزمیہ مضامین' یعنی لڑائی کی تیاری' معرکے کا زور و شور' تلاطم' نقاروں کی گونج' گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز' ہتھیاروں کی جھنکار' تلواروں کی چمک دمک'

نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، نقیبوں کا گرجنا، بہادروں کا مبارزہ طلب ہونا وغیرہ صاف دکھائی اور سنائی دیتا ہے۔ چنانچہ انھی رزمیہ مضامین میں المیہ مضامین اور کردار کے عناصر کو جمع کر کے میر انیس نے مرثیے کو ہمہ گیر اور آفاقی سخن بنا دیا۔

امام حسینؑ کے گھوڑے کی تعریف سنیئے :

آہو کی جست شیر کی چتون پری کی چال
کبک دری خجل دل طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال
اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آ گیا قدم کے تلے گرد برو تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

کہتا تھا میں براق سے توقیر پائے ہوں
ناز اس پہ تھا کہ بار امامت اٹھائے ہوں

آمد فرس کی تھی دلھن آتی ہے جس طرح
تھم تھم کے نکہتِ چمن آتی ہے جس طرح
تصور آہوئے ختن آتی ہے جس طرح
یا شمع، سوئے انجمن، آتی ہے جس طرح
باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بے شک پری ہے یہ

امام حسینؑ کی تلوار ذوالفقار کی تعریف دیکھئے :

اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان
خاموش اور تیز بیانی خدا کی شان
استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
لہرائی جب اتر گیا دریا چڑھا ہوا

نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی چڑھا ہوا
جس پر چلی وہ تیغ دوپارا کیا اسے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دوبارہ کیا اسے
واں تھی جدھر اجل نے اشارہ کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے
نے زین تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر

یہ بھی ایک المیہ ہے کہ مراثی انیس کی مکمل تعداد آج تک متعین نہ ہو سکی- آب حیات میں مولانا آزاد ۱۸۸۰ء میں لکھتے ہیں- میر انیس نے کم از کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہو گا- حیات انیس میں امجد علی اشہری ۱۹۰۷ء نے لکھا میر انیس نے کئی ہزار مرثیے کہے ہوں گے- واقعات انیس میں سید مہدی حسن احسن نے ۱۹۰۸ء بتلایا میر انیس کے مراثی کی کل تعداد ۱۴۰۰ کے لگ بھگ ہے- شاد عظیم آبادی نے انیس کے مرثیوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتلائی- ماہر انیسیات مرحوم ڈاکٹر صفدر حسین کی تحقیقات کے مطابق ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۰ء تک ہندوستان اور پاکستان میں جو مجموعہ مراثی انیس کے شائع ہوئے ان کی تعداد ۱۶۳ ہے اس کے علاوہ پروفیسر مسعود حسن ادیب کے جمع کردہ غیر مطبوعہ مراثی اور بعض جدید مطبوعہ مراثی کی تعداد کو ملا کر ایک اندازہ کے مطابق تقریبا ۲۵۰ مراثی ہمارے درمیان موجود نہیں-

تاسف کی بات یہ ہے کہ میر انیسؔ کا کلام ان کی زندگی میں کسی خاص توجہ سے جمع نہ ہو سکا اور کلام کا بڑا حصہ میر انیس کے انتقال کے بیس پچیس سال بعد تلف ہو گیا: پھر بھی ایک لاکھ سے زیادہ میر انیس کے اشعار اردو ادب کی زینت ہیں- اسی لیے میر انیس نے فرمایا تھا:

سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر
مگر پلہ ہم نے گراں کر دیا

میر انیس کے مراثی میں جو وسعت، روانی اور کھلی ہوئی فضا کا احساس ہوتا ہے اس میں بحور کے انتخاب کو بھی کافی دخل ہے- مرثیے یا مسدس کے لیے متوسط یا درمیانی

بحور زیادہ مناسب ہوتی ہیں۔ میر انیس نے تقریباً تمام مراثی تین چار بحروں میں کہے ہیں۔ اس وقت جو مطبوعہ مراثی میر صاحب کے ہمارے پاس موجود ہیں ان کے تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بحر مجتث مثمن مجنون میں انیس نے سات مرثیے، بحر رمل مقصود میں ۳۰ مرثیے، بحر مضارع مثمن مکفوف میں ۶۰ مرثیے اور بحر ہزج مثمن مکفوف میں ۸۵ مرثیے کہے۔ بحر رمل اور بحر ہزج رواں ہیں اور بحر مجتث اور مضارع میں زور اور شوکت کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ علم عروض کا ذکر ہے تو میر انیس کا بند ملاحظہ کیجئے جس میں آپ نے عروض کی اصطلاحیں: تقطیع، فاصلہ، رکن، سکتہ، مصرع، بحر ثقیل، ناقص، فرد، نظم، چار مصرع کے علاوہ بحروں کے نام: کامل، رجز، سالم، خفیف وغیرہ کے ساتھ ساتھ علم عروض کی ''کتاب سیفی'' کا بھی ذکر کیا ہے:

کامل تھی زبس بحر شجاعت میں وہ تلوار
مثل الف وصل گرے جاتے تھے کفار
جو کوئی قریب آیا رجز خواں دم پیکار
سالم تھا تو بے فاصلہ رکن اس کے ہوئے چار
کیا لڑتے کہ سکتہ تھا ہر اک اہل حسد کو
تقطیع کیا تیغ نے ہر مصرع قد کو

آج سے ۸۰ سال قبل نواب امداد اثر امام نے میر انیسؔ کی شاعری پر ریویو کرتے ہوئے فرمایا تھا: حقیقت حال یہ ہے کہ ابھی تک یورپ اور امریکہ: میر انیس کے نام سے بھی واقف نہیں ہے کس قدر جائے تعجب ہے کہ یورپ میں عمر خیام کے نام سے کلب قائم ہونے لگے ہیں، لیکن ابھی تک کوئی انیسؔ کلب قائم نہیں ہوا اور نہ ایسے کلب کے قائم ہونے کی کوئی امید کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ شاعری کے اعتبار سے میر انیسؔ عمر خیاؔم سے کہیں ارفع درجے کے شاعر ہیں۔ دنیا کے لیے یہ ایک ستم کی بات ہے کہ میر صاحب جیسا شاعر دنیا میں آیا اور دنیا اس سے بے خبر رہ گئی۔

اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر انیسؔ اپنی زندگی میں تمام تر برصغیر میں مشہور و معروف ہو چکے تھے، آپ نے نہ صرف فیض آباد، لکھنو بلکہ عظیم آباد، بنارس اور حیدر آباد دکن میں بھی مجالس پڑھیں۔ میر انیسؔ کے انتقال کے دوسرے سال

ہی ۱۸۷۵ء میں مشہور اردو شناس فرانسیسی دانشور گارساں دتاسی نے اپنے مقالے اردو ادب میں میر انیس کا تعارف اور تذکرہ بڑے خوبصورت طریقے سے کیا- آج میر انیس کے کچھ کلام کا ترجمہ دنیا کی مختلف مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے' جن میں انگریزی' عربی' فارسی تراجم قابل ذکر ہیں- آج شاید یورپ اور امریکہ کا کوئی ایسا شہر نہ ہو' جس میں میر انیس کے اشعار عقیدت سے نہ پڑھے جاتے ہوں' اور کم از کم محرم کے مہینے میں تمام دنیا میں میر انیس کا آفتاب سخن غروب ہی نہیں ہونے پاتا-

☆......☆......☆

شاعروں کی قسمیں

حضرت امیر خسروؔ کی نظر میں استاد شاعر کون ہے؟

دنیا کے ہر شعبے کی طرح دنیائے شعر و ادب بھی تحقیق' تنقید اور تکامل کی راہ پر گامزن ہے- یہ صحیح ہے کہ شعر و ادب تہذیب و فرہنگ کا ایک اہم جزو ہے اور آج کل تذکروں' تاریخوں کے ساتھ شعری اور نثری تحریوں سے کسی خاص دور کے حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں اور اس جائزہ کے لیے ہر چیز کا تجزیہ تصفیہ اور تقسیم ضروری ہوتا ہے تاکہ اس چیز کو اپنے اصلی مقام پر رکھا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم بندی سے دنیائے شعر و شاعری بھی مصئون نہیں ہے- اس گفتگو میں پہلے ہم شاعروں کی قسموں پر روشنی ڈالیں گے اور پھر نتیجے کے طور پر : حضرت امیر خسرو دہلوی کی نظر میں استاد شاعر کون ہے' پیش کریں گے- قبل اس کے کہ ہم شاعروں کی قسموں پر بحث کریں' ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کے کیا معنی ہیں اور شاعر کسے کہتے ہیں-

مولانا سیفی اپنی تالیف ''عروض سیفی'' مورخہ ۸۹۶ ہجری میں صفحہ ۲۳ پر شعر کی تعریف کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ شعر کے لغوی معنی دانائی اور طبع رسا سے معنی دریافت کرنا ہے' اور اصطلاح میں شعر ایسے سخن کو کہتے ہیں جو اول موزوں ہو' یعنی خاص اوزان کا حامل ہو' بے وزن نہ ہو' دوم معنی رکھتا ہو' یعنی بے معنی اور مہمل نہ ہو؛ سوم قافیہ رکھتا ہو (جیسا کہ ہم جانتے ہیں ردیف فارسی دانوں کی ایجاد ہے اور عربی اشعار میں ردیف کا رواج نہیں ہے جدید شعر نظم معری یا نثر موزوں جس میں ردیف قافیہ نہیں ہوتا' جدید شاعری تو کہ سکتے ہیں لیکن قاعدۂ عروض کے تحت اسے شعر نہیں کہ سکتے) ؛ چہارم' شعر ایسا موزوں کلام ہے جسے کہنے والا شعر کے قصد و ارادہ سے کہا ہو- چنانچہ آیت قرآن ثم اقر تم و انتم تشھدون ثم انتم ھنولا تقتلون اور حدیث رسول اکرم ﷺ الکریم ابن

کریم ابن کریم ابن کریم جو اوزان عروضی میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلات اور فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات پر ہیں لیکن کیونکہ خدا اور رسول ﷺ نے قرآن و حدیث کو شعر کے قصد و ارادہ سے نہیں کہا ہے اس لیے سخن موزوں ہوتے ہوئے بھی شعر کی تعریف سے خارج ہیں اس لیے آیات قرآن اور احادیث پیغمبر ﷺ اشعار نہیں ہے شاعر کے لغوی اور اصطلاحی معنی صاحب شعر' خداوند شعر یا خالق شعر کے ہیں۔ اصحاب تواریخ نے تاریخ شعر و شاعری کی بابت لکھا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے فرزند ہابیل کے قتل پر شعر کہا' جو زبان سریانی میں تھا اور جو شعر آج عربی میں حضرت آدم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے' وہ اس کا عربی میں ترجمہ ہے۔

ان لغوی اور اصطلاحی مسائل سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ شاعر مخلوق ہوتے ہوئے بھی خالق شعر ہے اور شاعری اس کی تخلیق ہے' چنانچہ اپنی تخلیق پر تکبر' غرور اور فخر جسے کہتے ہیں شاعر کی عادت اور شناخت ہے۔

اگرچہ تعلی بعض شعرا میں عجز و انکساری و فروتنی کے باعث بقدر بادام ہوتی ہے' تو بعض شعراء میں بقدر گودام رہتی ہے لیکن بہرحال کوئی بھی شاعر اس حالت سے خارج نہیں ہوتا۔ فردوسی نے کہا تھا:

عجم زندہ کردم بہ ایں داستان
منم رستم داستاں ساختم
وگرنہ یلی بودہ در سیستان

میر تقی میرؔ نے فرمایا:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

مرزا غالبؔ نے فرمایا تھا:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ!
جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو' رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

مشہور ہے کہ معروف شاعر دربار اکبری عرفیؔ شیرازی نے تو اپنی تعلی کی وجہ سے ہم عصر شعرا کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں عرفی کہتے ہیں سعدی کو

شیراز پر ناز اس لیے تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اس خاک میں عرفی جیسا شاعر پیدا ہوگا:

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود
گرنہ ی دانست باشد مولد و ماوای من

بہر حال خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے اگر عظیم شعراء میں یہ تعلّی پائی جائے تو اسے برداشت بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ حسن و ناز مصورانہ طبیعت کا جزو بن جاتا ہے- لیکن یہ تاج ہر کسی کے سر کے لیے موزوں نہیں ہوتا ورنہ وہ لوگ میر انیس کے مصرع کے صداق بن جاتے ہیں:

کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی

حقیقت یہ ہے کہ اس پرآشوب دور میں شعراء تعلّی سے لبریز ہیں- بعض خود کو حافظؔ میر تقی میرؔ عرفیؔ غالبؔ انیسؔ اور اقبالؔ کے ہم پایا سمجھتے ہیں تو بعض ان سے بھی اعلیٰ یہ اور بات ہے کہ تیرنا سب جانتے ہیں لیکن سب کے پاس پانی موجود نہیں ہے- بہرحال چونکہ یہ مسئلہ تعلّی ہمارے موضوع سے الگ ہے اس لیے اسے نامکمل رکھتے ہوئے اصل موضوع یعنی اقسام شعراؔ کی طرف رخ کرتے ہیں-

شاعروں کی تقسیم بندی پر آج تک کوئی کتاب یا مقالہ کم از کم اردو ادب میں مفصل طور پر لکھا گیا ہو میرے محدود مطالعہ میں نہیں ہے- یہ ایک حقیقت ہے کہ فلسفہ واجب الوجود اور ممکن الوجود کی روشنی میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے جو صرف ایک ایسا واحد ہے جو ناقابل تقسیم ہے تمام اکائیاں قابل تقسیم ہیں یعنی ہر واحدؔ سوائے احد کے؛ قابل تقسیم ہے- چونکہ ہر علم و فن اپنے لیے عدالت کا طلب گار ہے جو تقاضائے فطرت ہے؛ اور عدل کی تعریف میں حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا عدل ہے؛ یعنی ٹوپی سر پر اور جوتا پاؤں میں رکھا جائے تو عدل ہوگا اور اس کے برعکس عمل عدالت کے خلاف سمجھا جائے گا؛ اس لیے شعراؔ جو فطری طور پر حساس اور آزاد فکر ہوتے ہیں یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ گھوڑے اور گدھے ایک ہی اصطبل میں باندھے جائیں یا تمام گھوڑوں کو ایک ہی کوڑے سے ہانکا جائے- اگرچہ دنیا کے دوسرے شعبوں کے برخلاف شاعر کو بظاہر شاعری کے لیے کوئی سند یا ڈگری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر دنیا کی کوئی قوت بھی اس سے شاعری کا عنوان نہیں چھین سکتی؛ لیکن کوئی بھی شاعر اپنے وجدان میں اس وقت تک اپنے آپ کو شاعر تسلیم نہیں کرتا جب تک کہ اسے دوسرے شعرا

مستند قرار نہ دیں اور یہ سند حاصل کرنے کے لیے اسے محنت' ریاضت کر کے میدان شاعری میں مہارت دکھانی پڑتی ہے؛ اور چونکہ ہر شاعر اس سنگلاخ میدان سے گزرتا ہے اس لیے وہ دوسرے شاعر کو آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتا:

رنگ لاتی ہے حنا' پتھر پہ پس جانے کے بعد

آیئے! پہلے دنیائے ادب میں شاعروں کی قسمیں بیان کریں' پھر ادب مشرقیہ اور خصوصی طور پر اردو ادب کے حوالے سے ان کی مزید تقسیم پر غور کریں اور آخر میں اس کا نتیجہ حضرت امیر خسرو دہلوی کے ارشادات سے اخذ کریں۔

زبان کے اعتبار سے شعرا کو انگریزی' عربی' فارسی اور اردو کے شاعروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ منطقہ کے اعتبار سے شعرا کو انگلیسی' حجازی' ایرانی' پاکستانی اور ہندوستانی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ جنسیت کے اعتبار سے مرد شاعر کو شاعر اور عورت شاعر کو شاعرہ؛ عجب لطف یہ ہے کہ آج کل دنیائے ادب میں تیسری جنسیت کے شعرا بھی اپنی تعارف جنسی کروانے پر تلے ہوئے ہیں۔

عمر کے اعتبار سے کم عمر' نوجوان' جوان' بزرگ اور بڈھے شاعر سے شناخت کروائی جا سکتی ہے۔ ادب مشرقیہ' جن میں عربی' فارسی' ترکی اور اردو زبانیں وغیرہ شامل ہیں؛ شعرا کو ان کے رجحان' حسب و کسب کی نسبت سے درباری شعرا اور غیر درباری (آزاد) شعرا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ فارسی ادب میں' متاسفانہ' تقریباً تمام بڑے شعرا دربار سے منسلک رہے اور تمام زندگی رجال مملکت اور حکمرانوں کی مدح و ستایش میں صرف کر دی۔ رودکیؔ' عنصریؔ' فرخیؔ' انوریؔ' نظامیؔ' خاقانیؔ' حافظؔ' امیر خسروؔ' فیضیؔ' عرفیؔ' ظہوریؔ' نظیریؔ اور آملیؔ وغیرہ درباری شعرا تھے اور ان میں کئی ملک الشعرا کے گراں قدر عنوان سے بھی مزین تھے۔

یہ اردو ادب کی خوش بختی ہے کہ اس کے عظیم شعرا: میر تقی میرؔ' غالبؔ' انیسؔ وغیرہ کی رسائی اگرچہ دربار تک ضرور تھی لیکن ان شاعروں نے دربار کی مدح و ستائش کے لیے اپنے آپ کو وقف نہیں کیا۔ میر صاحب کا مسجد تحسین والا واقعہ کون نہیں جانتا۔ غالب کا طنزیہ شعر:

بنا ہے شہ کا مصاحب' پھرے ہے اتراتا

کس نے نہیں سنا۔ میر انیس کا شعر: کس منہ سے میں بندہ کو خداوند کہوں کس کو یاد نہیں

ہے۔ علامہ اقبال نے تو صاف کہہ دیا ''نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو شعرا نے سلاطین وقت کی مدح و ستائش نہیں کی بلکہ ان خود فروش شعراء کے حالات اور واقعات جمع کیے جائیں تو ساعدن بن لندھور کی داستان بن سکتی ہے۔ اگرچہ آج کل تخت و تاج کے بدلے کرسی راج اور شاہ عالی کی بجائے عالی جناب کا اقتدار ہے بہت سے شعرائے عصر ان کے ہوا خواں اور مدح خواں ہیں اس طرح سے ان خود فروش شعرا کو آج بھی درباری شعرا کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔

شاعری کے موضوعات اور اصناف کے حوالوں سے ان شعرا کو جنہوں نے اپنی ساری عمر کسی خاص موضوع یا صنف شاعری پر صرف کر دی اسی نسبت سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسے رزمیہ شاعری کا شاعر فردوسیؔ نظامیؔ قصیدہ کے شعراء انوریؔ عنصریؔ خاقانیؔ سوداؔ ذوقؔ وغیرہ غزل کے شعراء سعدیؔ حافظؔ میرؔ اور غالبؔ رباعی کے شعراء ابوالخیرؔ خیامؔ امجدؔ حیدر آبادی مرثیہ کے شاعر خلیقؔ انیسؔ اور دبیرؔ وغیرہ۔

اردو شاعری میں زمان کی نسبت سے شعرا کو متقدمین، متوسطین، متاخرین اور جدید شعرا میں تقسیم کیا جاتا ہے اگرچہ بہت سے جدید شعرا بھی فوت ہو چکے ہیں اور اب جدید قدیم ہو چکے ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پرانے خانوں کو توڑ کر جدید خانے تشکیل دیے جائیں۔

محل اور مکان کی نسبت سے اردو شعرا کو اردوے معلیٰ اور اردوے محلہ میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ دبستان دہلی آگرہ (اکبر آباد) لکھنو اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کے شعرا کو اردوے معلیٰ کے شعرا نامزد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زرخیز خطہ سخن نے میر تقی میرؔ غالبؔ انیسؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی جیسے عظیم شعرا پیدا کیے لیکن ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں'' کہنے والا بیسویں صدی کا اردو اور فارسی کا عظیم شاعر اقبالؔ کا تعلق اردوے محلہ سے رہا؛ اور اس صدی میں پھر اردوے محلہ کے شعرا اردوے معلیٰ کے ہم پایہ اور بعض مقامات پر ان سے بھی بلند قامت؛ نظر آنے لگے چنانچہ آج کل شعر و ادب کا پرچم انہی محلوں میں لہراتا نظر آ رہا ہے جہاں کبھی اردوے معلیٰ کے افراد گذرتے ہوئے بھی اس لیے اپنی زبان نہیں کھولتے تھے کہ کہیں زبان کی خراش و تراش میں فرق نہ آ جائے۔ حق تو یہ ہے کہ اردو ادب کی شاعری اور تصنیفات کا آغاز دکن سے ہوا اور شمالی ہندوستان کی پہلی نثری کتاب ''کربل کتھا'' جو فضل علی فضلی کی ۱۱۴۵ہجری کی تالیف ہے

دکنی تصنیفات کے دو سو سال بعد لکھی گئی : پھر بھی آج کل کے بعض علمائے ادب' حیدر آباد دکن کی اردو خدمات کو خاطر خیال لانے سے بھی اجتناب کرتے ہیں- اس موقع پر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں ''پر وہ ہمارے نام سے اٹھا' آنکھ ملائی لوگوں نے'' علم اور خیال کے اعتبار سے شعراء کو عالم' عالم نما اور جاہل شاعروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے- یہ جاہل شعراء زمانہ جاہلیت کے شعرا سے مختلف ہیں کیونکہ زمانہ جاہلیت کے شعراء عربی ادب کے بڑے جید عالم اور ادب شناس شعرا تھے-

فنی مہارت' ریاضت اور مشق کے اعتبار سے شعرا کو مبتدی اور کہنہ مشق شاعروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اعتبار اور اشتہار کی رو سے شعرا کو گمنام' خانہ نشین' مشہور اور معروف شعرا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے-

علاقہ سرحد بندی کے اعتبار سے شاعروں کو مقامی یا میزبان اور مہمان شاعروں میں تقسیم کرتے ہیں- آج کل علاقہ سرحد بندی سیاسی ہوتی جا رہی ہے' اسی زمرے میں ایک خصوصی پوسٹ مہمان خصوصی شاعری کا ہوتا ہے جس کے لیے ضروری نہیں کہ حقیقت میں باہر سے آیا ہوا مہمان ہو' اگر خصوصی ہو تو اس منصب کا حقدار ہو سکتا ہے-

کسی نے کہا کہ یہ تمام تقسیمیں غلط ہیں اور بتلایا کہ شاعر صرف تین قسم کے ہوتے ہیں : وہ شعرا جو بکا کرتے ہیں' یعنی صرف مدح و ستائش اور طرف داری میں شعر کہتے ہیں- دوسرے وہ شعرا جو بکاہ کرتے ہیں' یعنی ان کے اشعار میں درد جاناں یا درد زمانہ ہوتا ہے ; اور تیسرے وہ شعرا جو بکا کرتے ہیں' یعنی ان شعرا کے اشعار کسی کی سمجھ میں نہیں آتے-

کسی نے کہا کہ شاعر صرف دو قسم کے ہوتے ہیں : استاد شاعر اور شاگرد شاعر; یعنی اگر کسی شاعر نے کسی دوسرے شاعر کے ایک شعر پر بھی اصلاح دی ہو تو وہ استاد شاعر ہے' اور اگر اس نے اپنے ایک شعر پر بھی کسی سے اصلاح لی ہو تو وہ شاگرد شاعر ہے ; یعنی اس فارمولے کی رو سے ہر شاعر استاد ہوتے ہوئے بھی شاگرد شاعر ہے' لیکن کیوں پھر اردو ادب میں صرف استاد شاعر نظر آتے ہیں اور شاگرد شاعر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے-

شعرا کو ان کے کلام کے لحاظ سے مزاحیہ شاعر اور سنجیدہ شاعر میں تقسیم کیا جاتا ہے- اسی بنا پر مزاحیہ مشاعروں کی جداگانہ طرز پر تشہیر کی جاتی ہے- ہمیں معلوم ہے کہ

میر تقی میر کا کلام ظرافت سے بھرا پڑا ہے- حالی نے ''یادگار غالب'' میں غالب کو حیوان ظریف کہا ہے- علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں ظریفانہ اشعار کا مستقل باب قائم کیا ہے- سوال یہ ہے کہ کیا میر تقی میرؔ غالب اور اقبال مزاحیہ شعرا تھے۔ شاعری ندرت خیال و بیان کا نام ہے اور ظرافت اس کا جزو ہے-

شاعروں کو ان کے کلام پیش کرنے کی نوعیت سے تحت اللفظ شاعر اور مترنم شاعر کہہ سکتے ہیں- چونکہ شعر اور راگ کے ملاپ سے کلام دو آتشہ بن جاتا ہے اس لیے بعض مترنم شعرا کلام سے زیادہ اپنی آواز سے سامعین کو متوجہ کرتے ہیں-

شاعروں کو ان کے مذہبی اعتقادات کی نسبت سے مسلمان شاعر' ہندو شاعر' مسیحی شاعر' یہودی شاعر اور ملحد شاعر کہتے ہیں-

شعرا کو علم عروض کے استعمال اور اجتناب کی نسبت سے عروضی شعرا اور خروجی شعرا کہہ سکتے ہیں عروضی شعرا عموماً علم عروض و نحو کے تمام نکات کا لحاظ رکھتے ہیں اور عموماً ان بندشوں کی وجہ سے ان کے اشعار پھیکے ہوتے ہیں اور خروجی شعراء اپنے آپ کو مکمل ان بندشوں سے خارج رکھتے ہیں اور جو دل چاہے کہتے ہیں اور اسے شاعری میں جائز سمجھتے ہیں-

ان دونوں کناروں کے درمیان درمیانی شعرا ہوتے ہیں' جو عام طور سے عروض کا لحاظ کرتے ہوئے بھی قید نہیں ہوتے اور عموماً یہ گروہ کامیاب اور اکثریت کا حامل ہوتا ہے- شاعروں کو ان کے کلام کی نسبت صاحب دیوان' صاحب بیاض اور صاحب کتاب کے علاوہ مجموعہ کلام کے ناموں کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے- وہ زمانہ گیا کہ شعرا اپنی آخر عمر میں بڑے غور و خوض کے بعد کلام کی تدوین و ترتیب و تشہیر کرتے تھے- علامہ اقبال جن کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا ''بانگ درا'' کو ۱۹۲۵ء؛ ''بال جبرائیل'' کو ۱۹۳۶ء؛ ''ضرب کلیم'' ''مسافر'' ''پس چہ باید کرد'' کو ۱۹۳۷ء میں شائع کروایا' البتہ ''ارمغان حجاز'' آپ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی- آج کل ترقی کا دور ہے۔ ادھر منہ سے کچھ موزوں ناموزوں الفاظ نکلے' ادھر کتاب کی شکل میں منظر عام پر آ گئے-

۱- استاد تمام: وہ شاعر جو کسی خاص طرز شاعری کا موجد ہوا' جیسے: رودکی رباعی کے لیے: سنائی' انوری قصیدہ کے لیے' فردوسی نظامی رزمیہ مثنویوں کے لیے وغیرہ-

۲- استاد نیم: وہ شاعر جو کسی خاص طرز کا موجد نہیں بلکہ کسی خاص طرز کا پیرو ہو (جیسے

سعدی اور حافظؔ غزل کے موجد نہیں لیکن انہوں نے غزل کو کمال پر پہنچایا اور غزل میں آج تک کوئی ان کا ہم پایہ شاعر نہ ہو سکا- میرانیس مرثیہ کے موجد نہیں لیکن مرثیہ کو انہوں نے کمال پر پہنچایا اور آج تک کوئی مرثیہ نگار ان کا ہم قدر نہ ہو سکا-

۳- سارق: جو اوروں کے مضامین چراتا ہے- (غور طلب بات یہ ہے کہ امیر خسرو یہاں مضامین کے سرقہ کی بات کر رہے ہیں- اشعار چرانے کی بات نہیں ہے- میر انیس نے کہا تھا:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خدا رحم کرے' اگر مضامین نقل کرنے والوں کو سارق شاعر کہا جائے تو اردو ادب میں چور شاعروں کی تعداد کیا ہو گی- اس پرآشوب دور میں مضامین تو چھوڑیے' اشعار اور غزل سے بڑھ کر بات پورے مجموعہ کلام تک پہنچ گئی ہے)-

امیر خسروؔ مزید اس گفتگو کے ذیل میں فرماتے ہیں: استاد شاعر کے لیے چار شرطیں ہیں:

☆ طرز خاص کا موجد ہو-
☆ اس کا کلام شعرا کے انداز اور طرز پر ہو-
☆ اس کا کلام صوفیوں اور واعظوں کے کلام کے طریقے پر نہ ہو-
☆ کلام میں غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو-

ان شرائط کو لکھ کر امیر خسرو کہتے ہیں کہ میں استاد شاعر نہیں ہوں' کیونکہ ان چار شرطوں میں صرف دو شرطیں میرے پاس موجود ہیں' یعنی میں اساتذہ شعرا کے انداز اور طریقے پر شعر کہتا ہوں اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے کلام کے انداز پر نہیں ہے- دو شرطیں میرے پاس نہیں ہیں' یعنی میرے کلام میں غلطیاں اور لغزشیں ہیں' اور میں کسی خاص صنف کا موجد نہیں ہوں- علامہ شبلی نے سچ کہا کہ کیا اس سے بڑھ کر بے نفسی' انکساری اور انصاف پرستی کی دلیل ہو سکتی ہے-

اس گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امیر خسرو جیسا عظیم شاعر' جس نے موسیقی میں بارہ راگیں ایجاد کیں؛ جامی نے ''نفحات الانس'' میں لکھا کہ امیر خسرو نے ۹۲ کتابیں تالیف وتصنیف کیں- خود امیر خسرو فرماتے ہیں کہ میرے اشعار کی تعداد چار

لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم ہے اور میں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔ جس قدر میرا کلام فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے۔ ''خمسہ نظامی'' کے جواب میں ''مطلع انوار'' ''شرین خسرو'' ''لیلیٰ مجنوں'' ''آئینہ سکندری'' اور ''ہشت بہشت'' جیسی نادر پانچ مثنویاں لکھیں وغیرہ۔ جب ایسا عظیم شاعر اپنے آپ کو استاد شاعر کہنے سے معذور رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری میں استاد شاعر کا کیا مقام ہے۔ استاد شاعر کا کیا مقام ہے اسے ہم اساتذہ شعرا کرام پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم اپنی گفتگو کو امیر خسرو کے مصرعے پر ختم کرتے ہیں: ''بس شاگردم نہ اوستادم'' (میں استاد نہیں ہوں بلکہ شاگرد ہوں)۔

☆......☆......☆

سلام بر حسینؑ

سلام پر ایک تاریخی، ادبی اور تحقیقی گفتگو

اردو ادب میں سلام گوئی کی روایت تقریباً چار سو سال سے جاری ہے۔ سلام کی صنف ان اصناف شعر میں ہے، جو اردو ادب میں پھولی پھلی اور مشہور ہوئی۔ عربی زبان میں ایک جداگانہ صنف کے اعتبار سے سلام کا وجود نہیں ملتا، لیکن فارسی ادب میں کچھ اشعار بشکل سلام نظر آتے ہیں، جو ترکیب بند اور ترجیع بند میں کہے گئے ہیں۔ ہماری رثائی شاعری، جو سوز، سلام، مرثیہ اور نوحے جیسی اصناف پر مشتمل ہے؛ اس میں سلام کا تصور قرآن مجید میں سورہ الاحزاب کی آیت سے ماخوذ کیا گیا ہے، جس میں ارشاد خداوندی ہے کہ اے ایمان والو! جس طرح خدا اور اس کے فرشتے؛ پیغمبرؐ اور ان کی آل پر درود بھیجتے ہیں، تم بھی ان پر درود و سلام بھیجتے رہو۔ اردو ادب نے سلام بر خواں کی روایت کو ایسا اپنایا کہ اردو شاعری میں سلاموں کا ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہو گیا، لیکن دوسرے رثائی اور مذہبی ادب کے ساتھ ساتھ کئی صدیوں تک یہ ذخیرہ بھی طاق نسیاں کی زینت بنا رہا اور اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ عربی اور فارسی کی طرح اردو ادب میں بھی عروضی ہیتی تقسیم سے ہی مختلف اصناف بنائی گئی ہیں۔ جیسے: غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ۔ رثائی اور مذہبی ادب جس میں مرثیہ، سلام، نعت، منقبت، ہجو وغیرہ شامل ہیں اس کو موضوعات تقسیم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی بحیثیت صنف سلام اردو میں ایک موضوعی صنف سخن قرار پاتا ہے۔ امداد امام اثر نے ''کاشف الحقائق'' میں لکھا ہے کہ عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شے واحد ہے، مگر ان کے مضامین اور تقاضے ایک دوسرے سے علحدہ و انداز رکھتے ہیں۔ ان کے مختلف اشعار میں مختلف خیالات و مضامین نظم ہوتے ہیں اور ایک شعر کا دوسرے شعر سے

معنوی اعتبار سے مربوط ہونا ضروری نہیں۔ جناب امداد آثر نے یہ بھی بتلایا کہ سلام عروضی ترکیب رکھتے ہوئے بھی غزل سے علحدہ ہوتا ہے چونکہ اس میں واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ پر رثائی رنگ غالب رہتا ہے اور سلام میں واقعہ کربلا' رحلت رسول اکرم ﷺ اور ذکر مصائب فاطمہؑ و ائمہؑ کا بیان ہوتا ہے۔ اگرچہ سلام کی تاریخ اور اس کے ارتقائی سفر پر کوئی خاص تحقیقی کام ابھی تک انجام نہ ہو سکا لیکن سلام کے ابتدائی نمونے جو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ اردو سلام گوئی کا آغاز سرزمین دکن سے سولھویں صدی میں ہوا۔ قلی قطب شاہ معانیؔ' علی عادل شاہ' ملا وجہیؔ' ملا غواصیؔ' عبدلؔ بیجا پوری' رحمیؔ بیجا پوری' ملک الشعرا ملا نصرتیؔ بیجا پوری' سید باقیؔ' اماؔمی دکنی' دردیؔ' درگاہ قلی اور سید ولی محمد دکنی کا چیدہ چیدہ کلام' جو ہماری دسترس میں ہے' اس میں سلاموں کی کثیر تعداد شامل ہے۔

ان شعرا میں درگاہ قلی کو خاص شہرت حاصل ہے' جو سلام بشکل مربع لکھتے ہیں؛ اگرچہ اس دور میں سلام کی ہیئت کا تعین نہیں تھا' چنانچہ بیشتر سلام مثلث' مخمس' مسدس' ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ ہیئتوں میں لکھے ملے ہیں' لیکن ان سلاموں کی پہچان یہ ہے کہ اس کے مطلع اور ردیف میں لفظ سلام' سلام علیک' علیک اسلام مجرئی' فاتحہ وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے' جو صنف سلام کو دیگر رسائی اصناف سے جدا کرتا ہے۔

معروف شاعر ولیؔ دکنی' جس کو محمد حسین آزاد نے شاعری کے باوا آدم کا لقب دیا ہے اور شمالی ہند کی شاعری جن کی مرہون منت ہے اور انھی کی دلی کی آمد ورفت نے دلی والوں کو صنف سلام کی طرف متوجہ کیا تھا جس کے نتیجے میں شمالی ہند کے مشہور رثائی شعرا مسکینؔ' ہدایتؔ' افسردہؔ' میاں سکندرؔ' شاکر ناجی کے علاوہ ان کے بعد آنے والے مشہور شعرا ضاحکؔ' سوداؔ' میر تقی میرؔ' مصحفیؔ وغیرہ نے بھی سلام کی صنف کے دامن کو عشق آل محمد ﷺ سے سرشار کر دیا۔ میرؔ' سوداؔ اور ضاحکؔ کے دور تک سلام کی ہیئت بشکل منفرد یا غزل تقریباً منظم ہو چکی تھی اور قدما کی تقلید کو برقرار رکھتے ہوئے صرف مطلع میں ایک بار لفظ سلام یا مجرئی وغیرہ کا استعمال لازم سمجھا جاتا۔ سلام کے ارتقاء کا دوسرا دور دلی میں شاہ ظفرؔ' ظہیرؔ' غالبؔ' مومنؔ' ذوقؔ' سالکؔ' عارفؔ' باقرؔ شہید اور لکھنو میں ضمیرؔ' خلیقؔ' فصیحؔ' دلگیر اور ناسخؔ کا تھا۔ اس دور میں تقریباً ہر بڑے شاعر نے سلام کہے اور ان سلاموں میں تغزل کا رنگ اور منقبت کی چھاپ بھی نظر آنے لگی جو عقیدت' محبت اور تصوف کی

بلندیوں سے حاصل ہوئی- سلام گوئی کا تیسرا اور سنہرا دور مرثیے کے سنہرے دور سے ملا ہوا ہے- یہ دور میر انیس اور مرزا دبیر کا عہد شاعری تھا' جس میں سلام صرف واقعات کربلا پر محور کرتا ہے اس دور میں سلام صرف غزل کی ہیئت پر لکھے گئے اور کچھ عرصے بعد مطلع میں لفظ سلام' سلامی' مجرئی' مجرا' سلام علیک جیسے الفاظ کی ضرورت ہی باقی نہ رہی- میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد ان کے شاگردوں' جن میں عارف' نفیس' اوج' وحید' میسر' نظیر' عروج اور بیسویں صدی کے ابھرتے شاعروں نے سلام کے دامن کو تغزل اور منقبت کے رنگ سے گہرا تو کیا اور سلام میں عقیدتی اشعار کے ساتھ سماجی' اخلاقی اور انقلابی اشعار بھی داخل کیے لیکن انیس اور دبیر کی بنائی ہوئی حصار سے باہر نکل نہ سکے- امیر مینائی' امیر اور نواب داغ نے سلام کو مسدس شکل میں کہنے کی کامیاب کوششیں کیں' لیکن اس کی تقلید نہ ہو سکی- دور جدید کے شعرا جن میں جوش ملیح آبادی' آل رضا' نجم آفندی' ماہر القادری' احسان دانش' جمیل مظہری وغیرہ نے ادب برائے زندگی کو اپناتے ہوئے سلام کو اپنی عقیدت اور انقلابی پیام کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی اور یہ کوشش آج بھی جاری ہے- بقول محمد علی جوہر:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی : ہمارے ہیں حسین

ابتدائی سلاموں کے چند اشعار جو قدیم اردو ہندی میں ہیں؛ ملاحظہ کیجیے:

منڈپ کو لگے تھام نیزے تمام
ہوئی تیغ جھک کر سلام علیک
رلایا ہے عالم کو دردی تمام
کلام غم کا دفتر سلام علیک
(دردی ۱۰۸۰ھ)

محمد علی قطب شاہ:

چاند سورج روشنی پایا تمہارے نور سے
آب کوثر کو شرف پہنچا تمہارے پور سے
اے معانی رات دن نام محمد ورد کر
تجھ دعا با مدعا ہے رتبہ منصور سے

درگاہ قلی (۱۱۲۸ھ):

کہیں فریاد کر خاتون جنت
خداوند ہوئی ہے کیا مصیبت
تڑپتی خاک میں احمد کی عزت
قیامت ہے قیامت ہے قیامت

میر ضاحک:

علی عالی ولی کے اوپر درود واجب سلام سنت
نبی کے عاشق وصی کے اوپر درود واجب سلام سنت
غریب بے کس شہید بے بس ستم رسیدہ چہ غم کشیدہ
ذبیح کی بے بسی کے اوپر درود واجب سلام سنت

میر تقی میر (۱۲۰۰ھ):

اے سبط مصطفیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے
اے جان مرتضیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے
تو تشنہ کام و تنہا یہ رنج یہ مصیبت
اے مبتلا بلا کے تجھ کو سلام پہنچے

مصحفی:

سلامی دیکھ امام زماں کے تن کی طرف
پھر اس کے بعد لہو ڈوبے پیرہن کی طرف
گلے میں طوق ہے عابدؑ کے پاؤں میں زنجیر
فلک نظر تو کر اس رنج اور محن کی طرف
ہزار حیف کہ صغرا اس آرزو میں رہی
صبا بھی بن کے نہ قاصد گئی وطن کی طرف

فصیح:

جو کرے سلام بصد ادب شہ تشنہ لب کی جناب میں
تو روز حشر عجب نہیں کہ رواں ہو شہ کی رکاب میں
وہ خیام شہ کے جلا دیئے وہ قناتیں پھونک دیں آگ سے

سر حور خلد کی چوٹیاں ہوئی صرف جنگی طناب میں
جو سنو کلام فصیح کا تو درود بھیجو رسول پر
یہ صلا جو دو گے سلام کا تو شریک ہو گے ثواب میں

دلگیر:

مجرئی لاش پسر شہ سے چھپائی نہ گئی
بانو کے روبرو کچھ بات بنائی نہ گئی
کوئی شبیرؑ سا مظلوم نہ ہو گا نہ ہوا
قبر بھی جس کی کئی روز بنائی نہ گئی

میر انیس:

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو
خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مرزا دبیر:

اربعیں کے سوگوارو الوداع
آخری مجلس ہے یارو الوداع
خاتمہ بالخیر چہلم کا ہوا
الوداع اے اشک بارو الوداع
کربلا کی خاک کو سونپا تمہیں
عرش اعظم کے ستارو الوداع
قبر سے آواز دیتے ہیں حسینؑ
لو بہن زینبؑ سدھارو الوداع

مرزا غالب:

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو

تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

کفیل بخشش امت ہے بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا تھا مانیئے گر ہم برا کہیں اس کو

میر مونس لکھنوی:

سامنے آئے رخ حیدرؑ کے کیونکر آئینہ
ہو نہیں سکتا کف پائے بھی ہمسر آئینہ
ٹوٹ جاتا ہے دل نازک کلام سخت سے
چور ہو جاتا ہے جب کھاتا ہے پتھر آئینہ

اوج لکھنوی:

شام کے زنداں میں اے اہل حرم یہ تھا ستم
رات بھر سب اوس میں رہتے تھے دن بھر دھوپ میں
اللہ اللہ کس قدر محو شہادت تھے حسینؑ
گرم سجدہ تھے تہ محراب منبر دھوپ میں

داغ دہلوی:

ان کو مجرا جو تھے زیر آسماں بیٹھے ہوئے
بھوکے پیاسے بےوطن بے خانماں بیٹھے ہوئے
حج زیارت کر چکے اب کربلا کو بھی چلو
داغ مدت ہو گئی تم کو یہاں بیٹھے ہوئے

شمیم امروہوی:

مجرئی جس دل میں حب ساقی کوثر نہیں
باغ ہے سبزہ نہیں، آئینہ ہے جوہر نہیں

بیکس و تنہا کھڑے ہیں دشت میں سبط نبی
چاند ہے تارے نہیں' سردار ہے لشکر نہیں

عشق لکھنوی:

تھی رن میں دم صبح شہ دیں پہ کڑی دھوپ
پھر گلشن ایجاد میں ایسی نہ پڑی دھوپ
آجاتی ہیں زلفیں جو رخ سرور دیں پر
دو چار گھڑی چھاؤں ہے دو چار گھڑی دھوپ

نواب محبوب علی آصف:

فدا ہوں اس پہ سلامی ہے جس کا نام حسین
مرا معیں مرا آقا مرا امام حسین
صبا کو بھیج کر روضہ پہ کر رہا ہوں دعا
کریں قبول الٰہی میرا سلام حسین
سنا نہ ہائے کسی سنگدل نے لاکھ کہا
رسول کا ہوں نواسا ہے مرا نام حسین

مہاراجا کشن پرشاد:

فنا کہتے ہیں کس کو موت سے پہلے ہی مر جانا
بقا ہے نام کس کا اپنی ہستی سے گذر جانا
فنا میں تھا بقا کا مرتبہ حاصل شہیدوں کو
وہاں اس پر عمل تھا موت سے پہلے ہی مر جانا
یہاں کا زندہ رہنا موت سے بدتر سمجھتا ہوں
حیات جاوداں ہے کربلا میں جا کے مر جانا

انجم آفندی:

پست ہو دنیا میں ایسا' اس کا آئین حیات
ہائے جس ملت کے سر میں ہو غرور کربلا

مہدی علی شہید:

کبھی کبھی جو میں شب میں سلام لکھتا ہوں

تو لفظ لفظ بہ حکمِ امامؑ لکھتا ہوں

علامہ اقبالؔ:

روئے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثر مجھے

جوشؔ ملیح آبادی:

کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ
دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ
ان کے آگے صولتِ دنیا کا ذکر اے ابنِ سعد!
کھیلتی جن کی ٹھوکر تاجِ سلطانی کے ساتھ
اہلِ بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی!
ہاں! ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ
محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
کانوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق نہ بستر کی آرزو
اس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشتِ بلا میں تھی جو بہتر کی آرزو
جوشؔ! اس سبوئے قلب پہ کون و مکاں نثار
غلطاں ہو جس میں ساقیٔ کوثر کی آرزو

☆……☆……☆

غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی

نور احمد میرٹھی کی کتاب ''بہرِ زماں، بہرِ زباں'' کی روشنی میں

نعت عربی لفظ ہے، جس کے لغوی معنی توصیف، تعریف اور تجلیل کے بتائے گئے ہیں۔ کیونکہ عربی ادب میں یہ لفظ پہلی بار حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم ﷺ کی مدح وثنا کے لیے استعمال کیا، اس لیے تقریباً ۱۴ سو سال سے نعت کا لفظ مدحت حضرت ختمی مرتبت ﷺ کے لیے ہی مختص ہو گیا ہے۔ نعت ایک موضوعی صنف سخن ہے اور اسی لیے عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں میں اس کی ہیئت کسی خاص شکل میں نہ ہو سکی ہر صنف سخن یعنی دوہے ہوں کہ چومصرع، نظم ہو کہ مثنوی، غزل ہو کہ رباعی، مخمس ہو کہ مسدس ہر ہیئت میں توصیف و تعریف و تجلیل حضور اکرم ﷺ کی گئی اور اسے نعت ہی کہا گیا۔

جس طرح سے نعت کی ہیئت یا شکل محدود نہ ہو سکی، اسی طرح نعت کہنے والوں کی فہرست بھی صرف مسلمانوں تک محدود نہ رہی۔ صدر اسلام سے آج تک، ہر زمان اور ہر زبان و مکان میں، ہر مذہب و ملت کے بیدار ضمیر انسان نے حضورؐ کی تقدیس اور تجلیل میں اپنی قلبی واردات کو زبان کے قلم سے یا قلم کی زبان سے بیان کرنا شروع کیا، کیونکہ اس سیل جذبات کو ملک، قوم، ملت، مذہب اور زبان کی زنجیروں سے جکڑا نہیں جا سکتا تھا، اسی لیے اس آبِ خوشگوار نے خشک و بنجر خالی زمین کو نمود جاں بخشا اور گلہائی عقیدت ہر شاخِ گلستانِ رنگ و بو پہ ہر رنگ و بو میں ظاہر ہوئے، جسے گلچین کر کے جناب نور احمد میرٹھی نے گلدستہ ''بہرِ زماں و بہرِ زباں'' سجایا ہے۔

جیسا کہ مشہور ہے اعتراف ہنر، ارباب ہنر کرتے ہیں: قبل اس کے کہ ہم اس قلزمِ فیض و برکت میں غوطہ زن ہوں، جو علامہ نور احمد میرٹھی کی نو سالہ محنت و کاوش سے

حاصل ہوا تذکرہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے' جس میں ۳۳۶ غیر مسلم شعرا کا نعتیہ کلام شامل ہے۔ اس تذکرے میں ۱۷۰ کتب سے استفادہ کیا گیا ہے' جس میں اردو کے علاوہ عربی' فارسی' سندھی' پنجابی' انگریزی' ہندی اور فرانسیسی زبان کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس تذکرے میں اغلب اور بیشتر نعتیں اردو میں ہی ہیں' لیکن ایک بڑی تعداد فارسی نعتوں کی موجود ہے۔ اس کے علاوہ عربی' جرمنی اور ہندی رسم الخط دیوناگری میں بھی نعتیں اس مجموعے میں نظر آتی ہیں۔ مشہور ناقدین اور شعرا نے' جن میں ڈاکٹر جالبی' ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد اور جناب راغب مراد آبادی شامل ہیں: اپنے گراں قدر مقالات' نظریات اور اشعار سے اس تذکرہ کو تزئین کیا ہے۔

جناب نور احمد میرٹھی نے یہ سنگ بزرگ اپنی ہمت اور تائید الٰہی کے بھروسے پر اٹھا کر محراب عشق کی دیوار پر ایسا جما دیا جیسے انگوٹھی میں نگینہ' اس جوان فنکار ادیب نے جو ادارہ فکر نو کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ ینگ کلچرل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے سپریم کونسل کے رکن اعلیٰ بھی ہیں۔ جنھیں قائد اعظم ادبی ایوارڈ کے علاوہ پاکستان نعت اکیڈمی کا سلور جوبلی ایوارڈ بھی مل چکا ہے جو مختلف شاہکار تحریروں کے خالق بھی ہیں' جن میں ''اذکار و افکار'' ''چشم شوق'' ''تاریخ رفتگاں'' ''مہر و ماہ'' ''فراز خودی'' ''اشک فروزاں'' اور ''نورِ سخن'' قابل ذکر ہیں۔

غیر مسلم شعرا کے نعتیہ مجموعے

اس گفتگو میں غیر مسلم شعرا کے نعتیہ کلام کے دیگر مجموعات کا ذکر خارج از محل نہ ہوگا' کیونکہ یہی قطراتِ بارانِ رحمت تھے جن کے جمع ہونے سے قلزمِ عشق ''بہر زماں' بہر زباں'' تیار ہو سکا۔

اردو ادب میں اگر چہ کئی غیر مسلموں کی نعتیں روزناموں' نعتیہ رسالوں' کتابوں اور تذکروں میں شائع ہوتی رہی ہیں' لیکن خاص نعتیہ مجموعہ کلام کی صورت میں جن مجموعہ کلام کو شہرت حاصل ہوئی ان میں جناب دلورام کوثری کا ''گلبن نعت'' جناب مہاراجا کشن پرشاد کا ''ہدیہ شاد'' جناب بال مکند عرش ملسیانی کا ''آہنگِ حجاز'' جناب کالی داس گپتا رضا کا ''اجالے'' جناب الن جون کا ''گلدستہ نعت'' جناب آرزو سہارن پوری کا ''ظہور قدسی'' جناب ادیب لکھنوی کا ''نذرانہ عقیدت'' جناب چرن سری ناز کا ''رہبر اعظم'' اور جناب نذیر قیصر کا ''اے ہوا موزن ہو'' قابل ذکر ہیں۔

نعت گوئی کے محرکات

نعت گوئی کے محرکات مسلمانوں کی بابت بیان کرنا مشکل نہیں' کیونکہ جن افراد کو فنِ شاعری عطا ہوا اور حبیب خدا سے محبت رہی' انھوں نے قلبی واردات کو صفحۂ قرطاس عشق پر رنگین کرنا شروع کیا' جو عام طور پر سے انھی تین عوامل کے تحت رقم ہوتے رہے' یعنی ثواب دارین' نجات و شفاعت اور دل کی مضطرب آواز کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر سکون و تسکین حاصل کرنا تھا۔

نعتیہ کلام کے مطالعے اور نقادین ادب کی تحریروں سے مسلم شعرا کی نعت گوئی کے بھی تین اہم اور محکم اسباب نظر آتے ہیں۔ غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کی سب سے بڑی وجہ خود ذات حضرت حضور اکرم ﷺ ہے جنھیں غیر مسلم شعرا نے پیغمبر برحق' پیغمبر آخر الزماں' شافع محشر' ساقی کوثر' رحمت العالمین' حبیب خدا اور پیشوا دین برحق جان کر قلم اٹھایا' میں اپنے اس مدعا کے ذیل میں چند غیر مسلم شعرا کے اشعار پیش کرتا ہوں جن کے مطالعہ سے قاری کو یہ علم ہی نہیں ہوسکتا کہ شاعر غیر مسلم ہے۔

میں حشر میں دے دوں گا ثبوت' اپنے کہے کا
مجھ سا نہ گنہ گار' نبی سا نہ سخی اور
(رمیش نرائن گلشن دہلوی)

مجھے اے برق کیا غم ہے بھلا روز قیامت کا
شفاعت کے لیے حامی مرے خیر الوریٰ ٹھہرے
(کنج بھاری لال برق)

ہے حامی و ممدوح مرا' شافع عالم
کیفی مجھے اب خوف ہے کیا روز جزا کا
(پنڈت برج دتا تریہ کیفی دہلوی)

اے نبیؐ تیری شفاعت تری رحمت کے سوا
تیرا شاعر کسی نعمت کا طلب گار نہیں
(کالی داس گپتا رضا)

کیا میری شفاعت کو بھلا' دیر لگے گی

کیا مجھ کو نہیں جانتے سلطانِ مدینہ
(مہاراجا کشن پرشاد)

یہ سچ ہے، جوشؔ شرمندہ ہے، عصیاں کار ہے لیکن
اسے کیا خوف ہو، جب شافعِ روزِ جزا ہو تم
(رادھا رمن جوشؔ)

امیدِ شفاعت پہ جیتا ہوں
مری عمر بھر کی، یہی ہے کمائی
(عرشؔ ملسیانی)

عبث ہے فکر تجھ کو، اے فدا! اپنے گناہوں کی
شفیعِ عاصیاں جب نام ہے تیرے پیمبر کا
(پنڈت جگن موہن فداؔ)

بہرحال، یہ صرف چند قطرات تھے جنہیں میں نے قلزمِ عشق سے جمع کر کے پیش کیا۔

دوسرا بڑا محرک، جس نے غیر مسلم شعرا کو نعت گوئی پر مائل کیا: وہ حضور اکرم ﷺ کی انسانی تصویر تھی، یعنی وہ انسان کامل، یعنی وہ خلق عظیم کا حامل، یعنی وہ امین و صادق، وہ شخصیت جس میں محاسن انسانیت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ یہ حضورؐ کی اعلیٰ منزلت اور انسانی اقدار کی مکمل تصویر تھی، جس کی کشش نے ان غیر مسلم شعرا کو اس بات پر وادار کیا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں اپنی قلبی کیفیت کو اشعار کے قالب میں ظاہر کریں۔ ہمارے دور کے مشہور نقاد، ادیب اور شاعر جناب شان الحق حقی نے صحیح کہا ہے کہ غیر مسلم شعرا نے کسی مجبوری یا تفننِ طبع کے لیے حضور ﷺ کی مدح سرائی نہیں کی۔

ہم جانتے ہیں کہ پنڈت ہری چند کی نعت: ایک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا۔ مسلمانوں کی نعتوں سے زیادہ مشہور ہوئی۔ منشی پریم چند کے افسانوں میں ناول ''کربلا'' معروف ترین ناول میں گنی جانے گی، اسی طرح بشیور پرشاد منور لکھنوی کا قرآنی ترجمہ بہت پسندیدہ نظر سے دیکھا گیا۔ دیکھیے فراقؔ گورکھپوری نے حضورؐ کو محسنِ انسانیت اور انسانِ کامل سمجھ کر کیا کہا ہے:

انوار بے شمار معدود نہیں

رحمت کی شاہراہ مسدود نہیں
معلوم ہے کچھ تم کو محمدؐ کا مقام
وہ امت اسلام میں محدود نہیں
(فراقؔ)

منم اے شوق! بیگانہ ز اسلام
مگر کفر است انکار محمدؐ
(شوقؔ)

ہندو ہوں، بہت دور ہوں اسلام سے لیکن
مجھ کو بھی محمدؐ کی شفاعت پہ یقیں ہے
(مخمورؔ لکھنوی)

دولت کی غرض ہے، نہ ستایش کی تمنا
فرمان مرا آج یہ عنوان نبیؐ ہے
امداد کو آنا مری، اے شاہؐ مدینہ!
اک بت کا پرستار، ثنا خوان نبیؐ ہے
(طالبؔ کشن چند)

ہر ایک کا حصہ نہیں نعت نبیؐ جوہرؔ!
اللہ جسے بخش دے عرفان محمدؐ
(چندر پرکاش جوہرؔ)

عاشق ہوں اس جناب رسالت مآبؐ کا
کونین ایک ذرہ ہے جس کی جناب کا
دم میں براق پر، سر عرش بریں گئے
تھا معجزا یہ آپ کے پائے رکاب کا
(پیارے لال رونقؔ دہلوی)

ہادیٔ دین متین ہو تم محمد مصطفیٰؐ
باعث صد فخر و ملت رہنما و پیشوا

لکھ دیا تمھارے حق میں لولاک لما
تم نہ ہوتے تو نہ بنتے یہ کبھی ارض و سما
توڑ کر سنسار کے رشتے زمانہ چھوڑ کر
آ گیا ہوں آپ کے سایہ میں' دنیا چھوڑ کر
آ گیا ہوں آپ کی چوکھٹ پہ سجدے کے لیے
سوے جنت بھی نہ جاؤں گا یہ سجدہ چھوڑ کر
(روی پرکاش بہار)

پڑھتا ہوں نعت جب میں' تو کہتے ہیں اہل دل
اے قیس تو ہے بلبلِ بوستان مصطفیؐ
(قیس جالندھری)

ہزاروں ولیؑ پیر و مرشد ہزاروں
ہزار اولیا اور ہزاروں ہیں رہبر
مگر اک محمدؐ کو میں جانتا ہوں
ہزاروں کی مجھ کو ضرورت نہیں ہے
محمدؐ نے مجھ کو کیا اک اشارہ
اشارے پہ اس کے میں اس کا ہوا ہوں
ہیں جھوٹے جہاں کے' یہ سارے اشارے
اشاروں کی مجھ کو ضرورت نہیں ہے
(شمشیر سنگھ شیر)

غیر مسلم شعرا کی نعت   گوئی کا تیسرا اہم محرک برصغیر میں صوفیا اسلام کا تبلیغی اور اصلاحی ماحول و معاشرہ تھا؛ چنانچہ ان مشائخ اور صوفیہ کی محفلوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی شرکت کرتے تھے اور ان اوتاروں کے حضات کے عاشق اور گرویدہ ہو جاتے تھے' چنانچہ یہ انقلابی جذبہ کبھی تو شعرا کو اپنے آباو اجداد کے دین کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیتا اور بعض اوقات اپنے مذہب اور عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے ان کا قلم بے اختیار مدح و ثنا نے حضور اکرم ﷺ کے جواہر لٹانے لگا- اس ضمن میں کئی مثالیں اور نعتیہ کلام کا بڑا ذخیرہ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن مقالے کی

گنجایش کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کیوں وجد آفریں نہ ہو احساسِ زندگی
گونجا ہے سازِ روح پہ نغمہ رسولؐ کا
(گوپال کرشن شفق)

مثالِ محمدؐ چہ جوئی چہ جوئی
نہ یابی نہ یابی مثالِ محمدؐ
(قیسؔ جالندھری)

چشمِ فیضانِ احمدؐ در جہاں
سو بہ سو گوشہ بہ گوشہ کو بہ کو
(راجا مکھن لال)

قیامت سے مجھ کو ڈراتا ہے ناصح
پتا ہے کہ میں ہوں غلامِ محمدؐ
(سرجیت سنگھ ناشاد)

اس گفتگو کے اختتام پر دلو رام کوثری جنھوں نے اپنے مرنے سے دو سال قبل اسلام قبول کیا؛ ان کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں:

محشر میں دی فرشتوں نے داور کو یہ خبر
بندہ ہے ایک احمدِؐ مرسل کا مدح گر
ہے بت پرست اگرچہ وہ لیکن ہے نعت گو
احمدؐ کی نعت لکھتا ہے دنیا میں بیشتر
ہے نام دلو رام تخلص کوثری
لے جائے اس کو خلد میں یا جانبِ سقر
سنتے ہی پھر ملائکہ سے اک انوکھی بات
فرمایا ذوالجلال نے: جنت ہے اس کا گھر
اللہ اکبر! احمدؐ مرسل کا یہ لحاظ
کی حق نے لطف کی سگِ دنیا پہ بھی نظر

''اقبالؔ کا تصور زمان و مکان''

معروف سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین کی تصنیف پر تبصرہ

برصغیر کی ناموز نابغہ روزگار شخصیت مرحوم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے انتقال کی افسوس ناک خبر پڑھ کر اقبالیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ مرحوم کے اس اعلیٰ اور نایاب کتابچے کا تعارف کیا جائے جو عدیم المثال ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین کی کتاب ''اقبالؔ کا تصور زماں و مکاں'' جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور جسے عبدالرزاق تاجر کتب حیدر آباد دکن نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے والد مرحوم کی لائبریری سے مجھے ملا' جو ادبی اور سائنسی اعتبار سے ایک شاہکار تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رضی الدین نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کے سائنس دان تھے' بلکہ عربی' فارسی اور اردو کے ادیب ہوتے ہوئے مسائل فلسفہ اور منطق سے بھی عمیق واقفیت رکھتے تھے۔ اگرچہ اس تعارفی مضمون میں میرے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ اس کتاب کے تمام گوشوں اور نتائج کو پیش کر سکوں' کیونکہ خود ڈاکٹر رضی الدین نے سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے لیکن بہرحال میری کوشش یہ ہوگی کہ اس گلشن فکر و خیال سے اس طرح گزر جاؤں کہ مشام زمان و مکان قاری کو اس گلشن یعنی اس کتاب کے مطالعے کے لیے آمادہ کر دے۔

زمان و مکان(Time & Space) ایک ایسا موضوع ہے' جس کا تعلق دنیا کے مختلف علوم سے مستقیم اور غیر مستقیم ہے۔ علامہ اقبالؔ نے جن بنیادی مسئلوں کو اپنا موضوع بنایا ہے' ان میں زمان و مکان کا سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ بھی شامل ہے۔ اس موضوع پر علامہ اقبالؔ کے منظوم کلام اور ان کی نثری خطبات' جو آپ نے ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد دکن اور مدراس میں انگریزی زبان میں دیئے تھے اور جو ۱۹۳۰ء میں ''تشکیل

جدید الہیات اسلامیہ" کے نام سے شائع ہوئے : بحث کی گئی ہے۔ علامہ اقبالؔ خطبہ ۱۸۲ میں فرماتے ہیں کہ اسلامی مسائل کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے' چنانچہ زمان اور مکان کا سوال مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ علامہ اقبالؔ کو یقین تھا کہ اگرچہ سائنس اور حکمت محدود ہیں اور ہماری قلبی واردات اور روحانی زندگی کے لیے مشعلِ راہ نہیں بن سکتے لیکن آپ جدید سائنس کے اصولوں کے مطالعے اور ان کی روشنی میں فلسفے اور مذہب کے بنیادی مسئلوں کو ضروری سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں:

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

(خدا نے حکمت کو نیک کام کہا ہے' چنانچہ جہاں بھی یہ نیکی ملے' لے لو)

علم اشیا علم الاسما ستے
ہم عصا و ہم ید بیضا ستے

(علم سائنس ناموں کا علم ہے' جو موسیٰ کے عصا اور ہاتھ کا علم ہے)

علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصار آدم است

(علم اسما سے انسان کا اعتبار قائم ہے' کیونکہ اس علم سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے)

علمِ حرف و صوت را شہپر دہد
پاکیٔ گوہر بہ ناگوہر دہد

(علم: الفاظ اور آواز کو پرواز دیتا ہے اور قطرہ سمندر کو موتی بناتا ہے)

دل اگر سوزد بہ حق پیمبری است
ورز حق بیگانہ گردد کافری است

(اگر دل حق کی تلاش کرے تو پیغمبری ہے ورنہ وہ کافری ہے)

ڈاکٹر صدیقی نے اس کتاب میں پہلے زمان و مکان کے متعلق عوام کے عامیانہ تصورات' اہل یونان کے تصورات' اسلامی علما کے تصورات' جدید فلاسفر اور سائنسدانوں کے تصورات بیان کر کے علامہ اقبالؔ کی ان پر تنقید اور تائید پر تفصیل سے

بحث کی ہے اور پھر علامہ اقبالؔ کے خیالات جو آیات قرآنی' احادیث پیمبر اکرم اور فلسفہ اسلامی پر مبنی ہیں بیان کیا ہے- عام طور پر عوام' زمان (Time) کو ایک خارجی چیز سمجھتے ہیں جو انسان کے شعور سے اس طرح گزرتا ہے جس طرح کوئی دریا ایک پل کے ستونوں پر سے گزرتا ہے- اس نظریہ کے تحت وقت کو موتی کی ایک مالا کہا جا سکتا ہے- جس میں مختلف موتی پروئے ہوتے ہیں- یہ موتی درحقیقت واقعات ہیں جو ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں اور ان کے درمیان ایک فاصلہ ضرور ہوتا ہے- عوام' مکان (Space) کو مختلف اشیا کے مقامات سے تعین کرتے ہیں' چنانچہ اس نظریے کے تحت اشیا کے درمیان ایک فاصلہ ہوتا ہے' اگرچہ وہ کتنے ہی قریب کیوں نہ ہوں- یہ نظریات اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہیں-

یونانی حکیم افلاطون نے بتلایا کہ مکان (Space) وہ ہے جس میں تمام اجسام واقع ہیں اور وہ ہمیشہ غیر متغیر ہے- اس کے مطابق مکان کوئی خارجی مطلق شے نہیں ہے- یونانی حکیم زینو کے مطابق کائنات سکونی ہے اور اس میں حرکت نہیں ہے- علمائے اسلام نے بڑی شدت سے یونانی نظریہ زمان و مکان کی مخالفت کی ہے- علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں مسلمانوں کے مختلف مکاتیب' مثلاً: اشاعرہ' معتزلہ اور دیگر علما' خاص طور پر الاشعری' ابن حزم اور عراقی کے افکار پر تفصیلی تنقید و تبصرہ کر کے یہ بتلایا ہے کہ کس طرح مسلم مفکرین نے یونانیوں کے سکونی تصور کائنات کے خلاف بغاوت کی ہے- علامہ کہتے ہیں' اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا جیسی کچھ ہے اس سے ساتھ رکھو اور یہ فکر چھوڑ دو کہ دنیا کو ایسا ہونا چاہیے تھا- قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہماری کائنات ایک ارتقا پذیر متحرک کائنات ہے اور چونکہ حرکت اس کا اساسی جزو ہے' اس لیے کائنات کے ہر نظام میں اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

قرآن مجید کو ام الکتاب کا لقب اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں ساری تاریخ عالم' علت و معلول کے سلسلے سے آزاد ہو کر ایک فوق الدوام "اب" میں سما جاتی ہے- علامہ اقبالؔ مشہور سائنسدان آئن سٹائن کے بڑے مداح اور معترف تھے چنانچہ "پیام مشرق" میں انھوں نے ایک پوری نظم اس نابغۂ روزگار کی شان میں لکھی ہے- علامہ اقبال

نے فرمایا کہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی وجہ سے مادہ پرستوں اور دہریوں کو خدا کی ہستی کے خلاف یہ استدلال' کہ ایک غیر مادی خالق مادی اشیا کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے ہمیشہ کے لیے تمام ہو گیا' کیونکہ آئن سٹائن نے اپنی تجربہ گاہ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ (Material) اور توانائی (Energy) دو مختلف اشیا نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی شے کی مختلف شکلیں ہیں چنانچہ اس انکشاف نے ایک وسیع انقلاب برپا کیا- علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ''ذروان فرشتہ'' کے تذکرے میں اس حرکت زمان و مکان کے فلسفے کو نظم کیا ہے- مولانا روم فرماتے ہیں' چند شعر ملاحظہ کیجیے :

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

(نزدیکی اور دوری کا احساس شعور میں ہے' معراج حقیقت میں شعور کے انقلاب کا نام ہے)

این بدن' با جان ما انبار نیست
مشت خاکی مانع پرواز نیست

(ہمارا بدن ہماری جان کے لیے انبار نہیں ہے' ہمارا بدن کسی طرح پرواز میں حائل نہیں ہے)

علامہ اقبال نے فرشتہ ذروان کی دو صورتیں بتلائی ہیں جن میں ان کی مراد یہ ہے کہ زمان و مکان کی اضافی خاصیت کا اظہار کیا جائے- مولانا روم اقبال سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں-

بر زمان و بر مکاں اسوار شو
فارغ از پیچاک این زنار شو

(زمان اور مکان پر مسلط ہو جاؤ اور اس گردش سے فراغت حاصل کرو)

چشم بکشا زمان و برمکان
ایں دو یک حال است از احوال جان

(اگر آنکھیں کھول کر زمان اور مکان کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو گا یہ ہماری زندگانی کا ایک ہی رخ ہے)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے تصور کے منافی اس سے زیادہ کوئی تصور نہیں ہو سکتا کہ کائنات سوائے ایک بنے بنائے نقشے کے سوا کچھ نہیں جس کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق کائنات حرکاتی ہے یہ ایک ہر دم تشکیل پانے والی کائنات ہے نہ کہ ایک مکمل چیز جو اپنے خالق کے ہاتھوں سے بہت عرصے پہلے نکلی تھی اور اب فضا میں مادہ کے ایک تودہ کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت کیا
ایک زمانہ کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

علامہ اقبال مثنوی ''اسرار خودی'' میں فرماتے ہیں:

اصل وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست
وقت را مثلِ مکاں گستردۂ
امتیاز دوش و فردا کردۂ
زندگی از دہر و دہر از زندگیست
لا تسبو الدھر فرمان نبی است

''بال جبریل'' میں علامہ اقبال نے ''زمانہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں وقت اپنی صفات کا اظہار خود اپنی زبان سے کرتا ہے:

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا، نظر نہیں جس کی عارفانہ

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ''اسرار خودی'' میں علامہ نے مطالب کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے عرصے میں منظوم کیا جب کہ آئن سٹائن کا نظریہ اضافت ابھی عام رواج پیدا نہیں کیا تھا۔ پروفیسر ایڈنگٹن کی کتاب نیچر آف فزیکل ورلڈ بھی ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی جو زمان اور مکان پر ایک شاہکارانہ بحث ہے۔

بہر حال علامہ اقبال کی فکر بھی ان نابغہ روزگاروں سے کم نہ تھی، شاید اسی لیے علامہ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا:

دگر دانائے راز آید کہ ناید

☆.....☆.....☆

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

علامہ اقبال کی دعا

اگر چہ دعا کا لفظ عربی ہے لیکن یہ سہ حرفی لفظ اردو اور فارسی میں کسی ترجمے اور تفسیر کا محتاج نہیں- دین اسلام نے مسلمانوں کو دنیا اور عقبیٰ کے لیے دعا کرنے کی تاکید کی ہے- انسان عموماً ان خواہشات کے لیے دعا کرتا ہے' جس میں اس کو امداد غیبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دعا کے عنوان کے ذیل میں اسلامی علما نے بتلایا ہے کہ دعا کسے کہتے ہیں؟ دعا کس سے مانگی جاتی ہے؟ دعا کس طرح کی جاتی ہے؟ دعا کس چیز کی کرنا چاہیے؟ دعا میں وسیلے کی کیا اہمیت ہے؟ وغیرہ مختلف طویل بحثیں ہیں-

علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں بچے کی دعا اور دعا کے زیر عنوان اردو میں دو نظمیں لکھیں جن میں علامہ نے بچے کے توسط سے اور دوسری نظم میں کلمہ گو کے لیے دعا لکھی- ان نظموں کے علاوہ بھی علامہ نے کئی اشعار میں دعا کے موضوع کو بڑے خاص طریقے سے پیش کیا' جس دعائیہ نظم کی بابت یہ مضمون بیان کیا جا رہا ہے' وہ علامہ کی فارسی نظم ''دعا'' ہے' جو ''زبور عجم'' میں تمہید کے طور پر پیش کی گئی ہے- یہ سات اشعار پر مشتمل نظم اقبال نے صرف اپنے لیے کہی ہے-اس نظم کے تجزیے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے جو دعائیں مانگیں تھیں وہ سب کی سب قبول ہوئیں- یہ نظم لفظ ''یا رب'' سے شروع ہو کر ''بدہ'' یعنی ''دے'' پر ختم ہوتی ہے- عام انسانوں کی دعاؤں میں شخصی مسائل اور دنیاوی معاملات جن میں مال' عزت' اولاد' طول عمر' کسب جاہ و حشم جیسے امور شامل ہوتے ہیں لیکن علامہ کی دعا میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں ؛ اگر چہ یہ دعا براہ راست موصوف کے لیے تھی لیکن ان تمام دعاؤں کا مقصد ملت اسلام کی بہبود اور سرخ روئی کے سوا کچھ اور نہ تھا- اس موقع پر اس عظیم دعا کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے-

یا رب درون سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ

ترجمہ: اے خدا میرے سینہ کے اندر باخبر دل دے- ایسی نظر دے جو شراب میں پوشیدہ نشہ کو بھی دیکھ سکے- قرآن اور احادیث کی روشنی میں مومن کی شناخت اس کا بیدار باخبر دل ہے جو ہر لحظہ صفحۂ ہستی پر لکھی ہوئی آیات معرفت کی تلاوت کرتا ہے- اسی لیے تو کسی اور مقام پر علامہ نے فرمایا تھا-

کافری بیدار دل پیش صنم
بہ ز دینداری کہ خفتہ در حرم

ترجمہ: ایک کافر بیداری کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبہ میں مردہ دل لیے بیٹھا ہے- حق تو یہ ہے کہ اقبال کی یہ دعا ایسی مستجاب ہوئی کہ اقبال ایک باخبر زندہ دل شاعر کے نام سے مشہور ہوئے- دوسری دعا ایسی نظر دے کہ شراب میں پوشیدہ نشہ کو دیکھ سکوں- اس نظر کو نظر معرفت الٰہی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے- جس میں اثر کے توسط سے عوامل کو پہچانا جاتا ہے- کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کا جلوہ موجود ہے- صرف نظر بصیرت چاہیے- سچ تو یہ ہے کہ یہ دعا اقبال کی مکمل مستجاب ہوئی اور اقبال نے اپنی دیدہ ریزی سے وہ مطالب کشف کیے کہ دنیا نے آپ کو مولانا اقبال لاہور کے نام سے یاد کیا-

شعر (۲)

ایں بندہ را کہ بانفس دیگران نزیست
یک آہ خانہ زاد مثال سحر بدہ

ترجمہ: اس بندہ کو دوسروں کے خیراتی سانوں پر زندہ نہ رکھ- سحر کی طرح ایک ذاتی شعلہ اور روشن آہ عطا کر دے-

اقبالیات کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ علامہ نے اپنے مقام یا اپنے کلام کی بلندی کے لیے کسی کی مدد حاصل نہیں کی بلکہ اس سنگلاخ وادی کو اپنی محنت مشقت اور تائید الٰہی کے ذریعہ عبور کیا-

چوتھی دعا میں فرماتے ہیں مجھے سحر کی طرح ایک ذاتی شعلہ ور روشن آہ عطا کر دے-

اگر چہ علامہ نے مولانا روم سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن خودی' رموز بے خودی کے فلسفوں میں جو کچھ روشنائی نظر آتی ہے وہ سب ان کی ذاتی بصیرت اور پاکیزگی خیال سے ہے۔ یہ دونوں دعائیں بھی اقبال کی زندگی ہی میں مورد قبول درگاہ ایزدی ہوئیں۔

شعر (۳)

سلیم مرا بجوی تنک مایہ ئی مپیچ
جولانگہی بوادی و کوہ و کمر بدہ

ترجمہ: مرے خیالات کے سیلاب کو تنگ نہروں سے مت گزار بلکہ اس کو وادیوں' کہساروں اور میدانوں میں بکھیر دے۔ علامہ اقبال کو گزرے ہوئے ۹۰ سال کا عرصہ ہوا ہے۔ آج علامہ اقبال کا شمار مولانا روم کے بعد سب سے مشہور مشرقی شاعر میں ہوتا ہے۔ علامہ کا کلام تقریبا دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ اور تشریح ہو چکا ہے۔ اقبالیات پر اس نصف صدی میں تقریبا بارہ سو سے زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کیا اب بھی کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ یہ دعا اقبال کی قبول نہ ہوئی۔

شعر (۴)

سازی اگر حریف' یم بیکران مرا
با اضطراب موج سکون گہر بدہ

ترجمہ: کیونکہ میرا حریف موجود ہے اس لیے میرے دریائے بیکراں کو موجوں کا اضطراب اور مروارید کا سکون عطا فرما۔ علامہ کی زندگی میں ان کے کلام اور پیام کو سمجھے بغیر نام نہاد لیڈروں اور بعض مسلم علماؤں کی جانب سے شدید مخالفت کی گئی۔ کفر کے فتوے منبروں سے دیے گئے۔ شکوہ کی کتابیں خرید خرید کر جلائیں گویں لیکن یہ گرد کارواں اور دم گھٹانے والا دھواں دیرپا نہ رہا۔ اقبال کے خیالات کا موجیں مارتا سمندر اور گہر دار ندرت فکر کے موتی عوام کے نصیب ہوئے۔ خدا نے اقبال کی اس دعا کو بھی سرفراز کیا' چنانچہ اقبال انگریز کی دہلیز پر سرنہیں ہوئے بلکہ آستان محمدی پر سرفراز ہو گئے۔

شعر (۵)

شاہین من بصید پلنگان گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازیں تیز ترب دہ

ترجمہ: جب تو نے میرے شاہین کو چیتوں کے شکار پر مامور کیا ہے تو اسے بلند ہمت اور تیز پنجہ سے مسلح کر دے۔ کون اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ علامہ اقبال کی تمام زندگی بڑی بڑی طاقتوں اور شخصیتوں سے دست و پنجہ نرم کرنے میں گزری۔ اتہام، بہتان، الزام کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کی شرارتیں آپ کی کمین میں تھیں لیکن اس جنگ و جدل میں بھی آخر کار اقبال فتح یاب اور اقبال رہے اور اقبال کے شاعر شاہین کے پنجوں کی طرح درندوں کو درید کرتے رہے۔

شعر (۶)

رفتم کہ طائران حرم را کنم شکار
تیری کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

ترجمہ: میں حرم کے پرندوں کے شکار کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے ایسے تیر دے جو ہدف پر لگیں اور جو ٹوٹ کر بیکار نہ ہو جائیں۔

علامہ اقبال کی یہ انوکھی اور دلچسپ دعا ہے۔ اس دعائیہ شعر میں طائران حرم یعنی نام نہاد مسلمان علما اور نادان مولویوں کی طرف اشارہ ہے جو عوام کو اپنے ظاہری لباس سے دھوکا دیتے ہیں اور اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں چنانچہ ان کو افشا کرنا بڑا دشوار کام ہوتا ہے۔ یہ بت جو اسلامی لبادہ اوڑھے ہوئے تھے علامہ نے نہ صرف انہیں بے نقاب کیا بلکہ نابود کر دیا۔ یعنی علامہ کی دعا موثر اور معتبر رہی۔ علامہ نے اس نظم کے آخری شعر میں دو دعائیں کیں۔ فرماتے ہیں۔

شعر (۷)

خاکم بہ نور نغمہ ای داود بر فروز
ہر ذرہ ئی مرا پر و بال شر بدہ

ترجمہ: میری خاک کو حضرت داؤدؑ کے نغمہ کے نور سے روشن کر دے۔ میرے ہر ذرہ کو شعلے کے ذروں کی طرح قوت پرواز عطا کر دے۔

علامہ اقبال کا کلام قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا آئینہ ہے۔ خدا کی معرفت اور عشق رسالت میں ڈوبے ہوئے یہ ترانے جسے علامہ اپنے نرم ترنم میں پیش کرتے تو لوگوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی تو نغمہ داؤدؑ کی دین تھی اور یہی تو

دعا قبولیت کے آستانہ پر تھی- علامہ نے اپنی خاک کے ہر ذرہ کو شعلہ فشاں رازِ درون کر دیا اور اس نفسِ گرم کو شعروں میں ایسا پیوست کیا کہ آج بھی ہر شعر قاری کے خون کو جوش میں لانے اور اس کی آہ سرد کو آتش خرمن کفر بنانے کے لیے کافی ہے- یہ دس دعائیں علامہ نے سات اشعار میں مانگیں اور سب مستجاب ہوئیں- اس گفتگو کے اختتام پر میں علامہ اقبالؔ کا وہ شعر جو انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا ہے رقم کرتا ہوں-

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

☆......☆......☆

خاندانِ میر انیسؔ

دنیائے ادب کا واحد ممتاز اور منفرد سلسلہ

اردو ادب ہی نہیں بلکہ دنیائے ادب کی کسی بھی زبان میں ایک ایسا سلسلہ' جس میں پے در پے' نسل در نسل آٹھ ممتاز و معروف شاعر پیدا ہوئے ہوں' نظر نہیں آتا' اس طرح تمام تاریخ ادبیات عالم میں میر انیسؔ کا خاندان ہی ایک ایسا واحد منفرد خاندان ہے جس نے تقریباً تین صدیوں تک پہلے فارسی اور پھر اردو زبان کی ایسی خدمت کی کہ اس خاندان کا لب و لہجہ اردو ادب کا گہوارہ تصور کیا جانے لگا چنانچہ اسی لیے مشہور شاعر شیخ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ ''بھئی زبان سیکھنی ہو تو میر خلیق کے یہاں جایا کرو'' اور بعض اوقات میر انیس خود مرثیہ پڑھتے ہوئے فرماتے تھے: صاحبو! یہ میرے خاندان کا لب و لہجہ ہے' اہل لکھنو اس طرح سے نہیں کہتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر شجرۂ خاندان میر انیس پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ قدرت نے ان کی نسل میں کمالات اس طرح ودیعت کیے کہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ عربی' فارسی' انگریزی اور اردو شاعری میں بعض ایسے خاندان موجود ہیں' جن میں شاعری دو تین پشتوں تک مسلسل ملتی ہے' لیکن یہ سلسلے زیادہ تر غیر معروف متوسط شعرا کے ہیں۔ اردو کے عظیم شعرا' جن میں میر تقی میرؔ' مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ شامل ہیں کسی نسلی شعری وراثت کے حامل نہیں ہیں۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ کے فرزند جناب کلوؔ جو خود بھی مقبول شاعر تھے اور ان کے ایک معروف شعر کا ذکر یہاں بے محل نہ ہو گا۔

آسیاب کہتی ہے' ہر صبح' با آواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزاق دھن پتھر کے

انگریزی ادب کے مشہور شاعر براؤننگ اور اس کی بیوی: دونوں مشہور شاعر

گزرے ہیں۔ ورڈس ورتھ کی بہن بھی مشہور شاعرہ تھی؛ لیکن بہرحال یہ مسئلہ ایک دو نسل یا صرف ایک ہی ماحول کے اثر سے آگے نہ بڑھ سکا۔ شاید اسی ودیعت آسمانی کو حفظ کرنے کے لیے میر انیسؔ نے فرمایا تھا:

یا رب! مرا نہال تمنا ہرا رہے
یہ نخل' باغِ دہر میں' پھولا پھلا رہے

چنانچہ میر انیس کے مرنے کے ۸۰ سال بعد تک یہ باغ مرثیہ اسی طرح ہرا بھرا اور پھولا پھلا رہا۔ میر انیس نے اپنے مشہور مرثیے' جس کا مطلع تھا: نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری ......' میں فرمایا تھا۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

اگر اسی خیال کو انیسؔ کے پڑپوتے میر محمد حسین لذن فائزؔ کہتے تو پانچویں پشت کے بجائے آٹھویں پشت کہنا پڑتا۔ جناب فائزؔ' جو خاندانِ انیسؔ کے آخری چراغ تھے ۱۹۴۷ء میں انتقال کر گئے۔

میر انیسؔ کا شجرہ

یا رب! مرا نہال تمنا ہرا رہے
یہ نخل' باغِ دہر میں پھولا پھلا رہے

میر انیسؔ موسوی سادات' یعنی امام موسیٰ کاظم علیہ سلام کی نسل سے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ میر امامی موسوی ہراتی' مغلیہ عہد دور شاہ جہانی میں ہرات سے دہلی تشریف لائے۔ میر امامی جید عالم اور فارسی کے معتبر شاعر تھے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں اشعار کہے۔ ان کا تقریباً سارا کلام ضائع ہو گیا۔ ان کی فارسی تصنیف میں ایک مثنوی "باغ مراد" بہت مشہور ہے۔ میر امامی کے فرزند میر عزیز اللہ کی شاعری کے بارے میں تاریخ و تذکرے خاموش ہیں۔ میر عزیز اللہ کے فرزند میر غلام حسین ضاحک فارسی اور اردو کے مشہور و معروف شاعر گزرے ہیں۔ میر ضاحک میر انیسؔ کے پردادا' میر خلیقؔ کے دادا اور مشہور مثنوی نویس شاعر میر حسنؔ کے والد تھے۔ اگرچہ میر ضاحک کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا ٹھیک پتا نہیں چلتا' لیکن ان کے فرزند میر حسنؔ کے تذکرہ سے یہ بات

واضح ہوتی ہے کہ میر ضاحک ۱۱۹۱ ہجری تک زندہ رہے- قاضی عبدالودود کی تحقیقات کے مطابق میر ضاحک کا انتقال ۱۱۹۶ ہجری اور ۱۱۹۸ ہجری کے درمیان ہوا ہے- میر ضاحک کا دیوان، جو ۱۱۹۹ ہجری کا مرقومہ ہے، جس میں ہزلیں، غزلیں، ہجویات اور رباعیات شامل ہیں- میر ضاحک نے سلام، منقبت، نوحے اور مرثیے بھی کثرت سے لکھے جس کا کچھ حصہ ہمارے درمیان موجود ہے- میر ضاحک محمد رفیع سودا کے ہم عصر تھے اور ان دونوں کی ہم عصر چشمک آرائی اور نوک جھونک نے ہجویات کا انبار ترتیب دیا تھا، جو تقریباً سارا ضائع ہو گیا؛ پھر بھی اتنا باقی ہے، جس سے اس معرکہ آرائی کا پتا چل سکتا ہے- میر ضاحک کے بیٹے اور میر انیس کے دادا میر غلام حسن کی پیدائش ۱۱۵۴ ہجری اور ان کے انتقال کی تاریخ جو مصحفی کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ کے مصرع سے ''شاعر شیریں زبان'' تاریخ یافت سے نکلتی ہے جو ۱۲۰۱ ہجری ہے- میر حسن اگرچہ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن اپنے والد کے ساتھ فیض آباد منتقل ہو گئے- علوم عروض و قواعد پہلے اپنے والد میر ضاحک اور پھر میر ضیا سے سیکھا لیکن شاعری میں محمد رفیع سودا اور میر تقی میر کی پیروی کی- میر حسن کا شمار اردو کے بڑے شعرا میں کیا جاتا ہے- میر حسن مثنوی کے بادشاہ تصور کیے جاتے ہیں میر حسن کی مثنویات میں ''سحر البیان'' ''گلزار ارم'' ''رموز العارفین'' ''حویلی میر حسن'' ''قصر جواہر'' ''شادی'' اور ''تہنیت عید'' شامل ہیں- مثنوی ''سحر البیان'' اردو کی بہترین مثنوی شمار کی جاتی ہے- اس کے علاوہ ''کلیاتِ میر حسن'' میں غزلیات، قصیدہ، سلام، مرثیے، منقبت، مخمس، مسدس اور کچھ رباعیات بھی نظر آتی ہیں- اردو شعرا کا تذکرہ جو فارسی زبان میں ہے اور جو تین ہزار شعرا کے حالات اور نمونہ کلام سے ترتیب دیا گیا ہے : میر حسن کا ادبی شاہکار ہے، جو ۱۱۹۸ ہجری میں تالیف کیا گیا ہے- میر حسن دہلوی کے چار بیٹے : میر احسن خلق، مخلوق، میر مستحسن خلیق اور میر محسن شاعر تھے لیکن ان میں صرف میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق معروف اور ممتاز ہوئے- آپ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ مصحفی کے ''تذکرہ ہندی گویاں'' سے میر خلیق کی پیدائش ۱۱۹۰ ہجری نکلتی ہے- آپ نے ۱۲۶۰ ہجری میں وفات پائی- بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا- مصحفی غزل کے استاد تھے۔ پہلے غزلیات کہیں پھر مرثیہ کی طرف منہ موڑا اور آپ کا شمار مشہور مرثیہ گویوں، جن میں میر ضمیر، میاں دلگیر اور مرزا فصیح شامل تھے ; ہونے لگا- غزلیات اور رباعیات کے علاوہ تقریباً دو سو سے زیادہ مراثی لکھے- آپ کے تین بیٹے : میر ببر علی

انیسؔ، میر مہر علی انسؔ اور میر نواب مونسؔ مرثیے کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ خلیقؔ نے انیس اور انس کے کلام پر اصلاح دی، لیکن چھوٹے بیٹے مونس نے بڑے بھائی انیس کی شاگردی قبول کی۔ میر خلیقؔ کے تینوں بیٹوں نے نہ صرف مرثیہ گوئی بلکہ مرثیہ خوانی کا ذوق اور ہنر، جو انہیں وراثتاً پہنچا تھا اپنی اپنی استعداد کے مطابق حاصل کر کے اسے ترقی دی۔

میر انیسؔ کے تینوں بیٹے: میر نفیسؔ، میر سلیسؔ اور میر رئیسؔ شاعر تھے، لیکن ان میں میر خورشید علی نفیسؔ نے بڑا نام پیدا کیا اور میر انیس کی زندگی میں ہی لوگ آپ کے مرثیوں کے شیدا ہو گئے۔ میر نفیسؔ ۱۸۲۷عیسوی میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۱عیسوی میں لکھنو میں انتقال فرمایا۔ آپ نے بھی اپنی خاندانی روایت اور وراثت، جو مداحیِ محمدؐ اور آلِ محمدؐ تھی تمام زندگی بسر کر دی۔ متعدد سلام صدہا مراثی، منقبت اور رباعیات وغیرہ ہمارے درمیان میں موجود ہیں۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں اپنے والد میر انیس کے دوش بدوش رہے اور والد کی زندگی میں ہی اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے مشہور اور ممتاز قرار پائے چنانچہ لکھنو ہی نہیں بلکہ دوسری ریاستوں میں جہاں میر انیس مجالس پڑھا کرتے تھے آپ کی وفات کے بعد میر نفیس ہی مرثیہ پڑھنے لگے اور لوگ میر انیس کی طرح ان کی قدردانی اور ان کے کلام کی منزلت کے قائل ہوتے رہے۔ میر نفیس کے فرزند میر خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروجؔ (وفات ۱۹۳۰ء) اور پھر ان کے فرزند میر محمد حسین عرف لڈن صاحب فائزؔ (وفات ۱۹۴۷ء) نے شمعِ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو کم و بیش اسی طمطراق سے روشن رکھا، جس طرح سے یہ شمع دو صدی سے اس خاندانی فانوس میں روشن رکھی گئی تھی۔ ان افراد کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو دیکھ کر لوگوں کی نظروں میں میر انیس اور ان کے آباو اجداد کی تصویریں لیے پھرنے لگیں اور ان کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ چونکہ لڈن صاحب فائزؔ لاولد تھے اس لیے میر انیس کا خاندان بیٹوں کے صلب سے ۱۹۴۷ء میں تمام ہوا، لیکن میر انیسؔ کی بیٹیوں سے نسل آج بھی باقی ہے۔ میر انیس کی بیٹی، جو احمد صاحب صابر کی زوجہ تھیں؛ ان کے بطن سے مشہور شاعر پیارے صاحب رشیدؔ (وفات ۱۹۱۷ء)، اور میر انیس کی دوسری بیٹی جو سید محمد حیدر کی زوجہ تھیں، ان کے بطن سے میر علی محمد عارفؔ (وفات ۱۹۱۹ء) بھی مشہور مرثیہ گو شاعر گذرے ہیں، جن کے سلام اور مرثیوں سے بھی گلشن وطن کی خوشبو میں اضافہ ہوا۔ اس وقت میر انیس کے

خاندان کا کوئی مشہور و معروف مرثیہ گو شاعر بقیدِ حیات نہیں ہے لیکن بہرحال میر انیسؔ کے کلام نے اس خاندان کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

مجھے یہ کہنے دیجیے کہ آج نہ صرف اردو شعر و ادب بلکہ دنیائے ادب میں کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا' جس کے اشعار میر انیسؔ کے اشعار کی طرح کثرت سے پڑھے جاتے ہوں۔ ایک اندازے کے مطابق سڈنی آسٹریلیا سے کیلفورنیا امریکہ تک اور سویڈن یورپ سے جنوبی افریقہ کے ساحل تک' جہاں کہیں بھی اردو زبان افراد عزا داری امام حسینؑ کی محفل سجاتے ہیں اس میں انیس کا کم از کم ایک شعر اور زیادہ سے زیادہ کئی سو اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ عزا داری کے منتظمین کی رائے کے مطابق محرم کے پہلے دس دنوں میں کم از کم دس ہزار مجلس فرشِ دنیا پر برپا ہوتی ہیں' یعنی ہر سال' ان دس دنوں میں' کم از کم دس ہزار بار میر انیسؔ کا کلام عقیدت سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ کم از کم ان دس دنوں میں میر انیسؔ کے سخن کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ آج میر انیسؔ کی اولادِ صلب موجود نہیں' لیکن ان کے فرزندانِ روحانی: اشعار' قیامت تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے' اسی لیے تو ذوقؔ نے کہا تھا۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے' ذوقؔ!
اولاد سے رہے' یہی دو پشت' چار پشت

حق تو یہ ہے کہ میر انیسؔ اور ان کے خاندان کو اردو ادب کے شاعروں' ادیبوں' نقادوں اور اہلکاروں کی ضرورت نہیں' بلکہ ان تمام افراد اور اردو ادب کو میر انیسؔ کی ضرورت ضرور ہو گی' اس لیے تو میر انیسؔ نے فرمایا تھا:

میری قدر کر' اے زمینِ سخن!
تجھے بات میں آسماں کر دیا
سبک ہو رہی تھی ترازوے شعر
مگر پلہ' ہم نے' گراں کر دیا

☆......☆......☆

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

علامہ اقبال اور حیدر آباد دکن

تاریخی دستاویز کے بموجب علامہ اقبال ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد دکن تشریف لے گئے- حیدر آباد کے دیدار کی خواہش اقبال کو نوجوانی کے زمانے سے تھی' چنانچہ ۱۸۹۹ء میں علامہ اقبال نے کہا تھا: اگر شوق دیدار' حضرت داغ اسی طرح رہا تو میں حتما ایک دن ملک دکن کا سفر ضرور کروں گا- اقبال نے حیدر آباد دکن کا دوبار سفر تو کیا' لیکن حضرت داغ سے ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی کیونکہ داغ دہلوی مرحوم ہو چکے تھے-

علامہ اقبال پہلی بار ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدر آباد آئے- حیدر آباد کے عوام اور خواص' جن میں ادبی' سماجی اور سیاسی ممتاز افراد بھی شامل تھے علامہ اقبال کے نام اور ان کے پیام و کلام سے واقف تھے' کیونکہ اقبال کا کلام دکن کے مجلہ جات اور اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا- علامہ اقبال کی سر اکبر حیدری (وزیر اعظم حیدر آباد : ۳۸-۱۹۳۸ء) مہاراجا کشن پرشاد (وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف) سے نامہ نگاری بھی تھی- اس کے علاوہ اردو اور فارسی کے مشہور شاعر جناب غلام قادر گرامی مقیم حیدر آباد سے دوستانہ روابط برقرار تھے- اس زمانے میں نواب میر محبوب علی خان حیدر آباد دکن کے حکمران تھے جن سے علامہ اقبال کی ملاقات نہ ہو سکی' اس بارے میں ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء کے خط میں علامہ نے جو حیدر آباد کے قیام کے دوران عطیہ فیضی کو لکھا ہے' لکھتے ہیں: اگر طولانی مدت کے لیے حیدر آباد میں قیام کروں' تو مجھے یقین ہے کہ عالی جناب نظام مجھ سے ملاقات کریں گے- حیدر آباد میں معروف اور سر شناس شخصیتوں سے ملاقات رہی- اکثر افراد نے مجھے اپنے گھروں پر دعوت دی- جناب سر اکبر حیدری اور ان کا خاندان نہایت شریف اور مہمان نواز اور علم دوست ہے-

حیدر آباد کے قیام کے دوران علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق سر اکبر حیدری

نے نظم طباطبائی سے موصوف کی ملاقات بھی کرائی' جو اس زمانے میں نظام کالج حیدر آباد میں فارسی زبان کے پروفیسر تھے۔ علامہ کے اصرار پر نظم طباطبائی نے کچھ اشعار سنائے جنھیں اقبال نے سراہا اور تعریف کی۔ اس کے علاوہ علامہ نے حافظ جلیل حسن مانک پوری سے جو داغ دہلوی کے بعد میر محبوب علی پاشا کے استاد ہوئے ملاقات کی۔ جناب ظہیر دہلوی اور مہاراجا کشن پرشاد سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے اس حیدر آباد کے قیام کے دوران ایک ۵۸ اشعار پر مشتمل نظم ''گورستانِ شاہی'' لکھی' جسے حیدر آباد سے واپسی پر مجلّہ ''مخزن'' شمارہ جون ۱۹۱۰ء میں چند مقدماتی جملوں کے ساتھ شائع کروایا' جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

حیدر آباد کے مختصر قیام کے دوران جناب نذر علی صاحب کے ہمراہ قطب شاہی مقبروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقبرے' جن کی عظمت باشکوہ اور جن کی تاریخ درس آموز ہے' جہاں سلاطین قطب شاہی آرام کر رہے ہیں۔ یہاں خاموشی نے سکوت شب میں آسمان پر ابر کے ٹکڑوں کا ہجوم اور چاند کا منظر؛ دردناک اور احساساتی بھی ہے۔ اس منظر نے مجھ پر ایسا اثر طاری کیا ہے جسے میں ہرگز بھول نہیں سکتا۔ یہ اشعار میرے حیدر آباد کے سفر کی یادگار کے ساتھ ساتھ جناب سر اکبر حیدری اور ان کی بیگم کی مہمان نوازی اور محبت کی یاد بھی تصور کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدر آباد سے لاہور واپس ہوئے۔ سفر کے دوران دو روز اورنگ آباد میں قیام کیا اور عالمگیر اورنگ زیب کی قبر کی بھی زیارت کی۔

اس زمانے میں دہلی' لکھنؤ کی طرح حیدر آباد دکن بھی علمی ادبی اور ثقافتی راہوں پر گامزن تھا چنانچہ نظام دکن کی علم پروری اور ادب نوازی سے علامہ اقبال باخبر تھے۔ اس کے علاوہ مہاراجا کشن پرشاد' سر اکبر حیدری' استاد جلیل مانک پوری' ظہیر دہلوی اور عبدالقادر گرامی جیسی شخصیتوں کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔ اس کشش کی ایک وجہ سرزمین دکن میں علامہ اقبال کی قدردانی اور اردوئے معلّٰی (دہلی' لکھنؤ' آگرہ) کے دبستانوں اور مجلّات میں علامہ کی زباندانی پر مسلسل اعتراضات بھی شامل تھے: چنانچہ جب ۱۹۱۷ء میں جسٹس سید ہاشم بلگرامی کے انتقال کی وجہ سے حیدر آباد دیوان عالی میں جج کی نشست خالی ہوئی تو علامہ اقبال نے اس نشست کو حاصل کرنے کے لیے مہاراجا کشن پرشاد کے خط میں خواہش کا اظہار کیا لیکن قسمت نے یاری نہ کی اور سیاست بازی

نے ہمکاری نہ کی اور علامہ کی خدمات سے محکمہ دیوان عالی محروم رہا- علامہ کے اس خط میں جو مہاراجا کشن پرشاد کے نام ہے ہمیں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ علامہ کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ وہ ایک کتاب اسلام کی فقہ کے بارے میں انگریزی میں لکھیں لیکن عدم فرصتی نے اس کی اجازت نہ دی- سر اکبر حیدری نے چند مہینوں بعد علامہ اقبال کو قانون کے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی پیشکش کی لیکن اس پیش کش کو علامہ نے قبول نہ کیا-

عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر لیکچر دینے کے لیے علامہ اقبال بذریعہ ٹرین ۱۹۲۹ء کو حیدر آباد پہنچے- ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال کو خبر دی گئی کہ وہ نظام حیدر آباد کے مہمان ہیں' اس لیے شاہی مہمان خانے میں قیام کریں- اسٹیشن پر طالب علموں کی کثیر تعداد کے علاوہ سر اکبر حیدری' ڈاکٹر عبدالحکیم خلیفہ' ڈاکٹر عبداللہ عمادی' ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور دیگر اساتذۂ عثمانیہ یونیورسٹی استقبال کے لیے موجود تھے- گل پوشی کے بعد طالب علموں نے اقبال کی نظم ''ترانہ ہندی'' پڑھی-

اقبال اس بار چار دن حیدر آباد میں رہے- پہلے دن عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے کا جائزہ لیا اور دفتر کتب خانہ میں اپنا نام ثبت کیا- دوسرے دن باغ عامہ میں منعقدہ ایک جلسہ عام میں تقریر کی' جس کی صدارت مہاراجا کشن پرشاد نے کی- اسی رات ضیافت عصائیہ کے بعد مہاراجا کی حویلی میں محفل مشاعرہ برگزار ہوئی- مشہور شعرائے فارسی اور اردو نے اس مشاعرہ میں شرکت کی جن میں حیدر جنگ' نظم طباطبائی' ضیاد جنگ' عزیز یار جنگ' مسعود علی محوی' نظام تیموری' کاظم علی باغ اور جوش ملیح آبادی قابل ذکر ہیں- اقبال نے مہاراجا کے اصرار پر چند فارسی اشعار پڑھے- دو شعر پیش کیے جاتے ہیں :

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
ای کہ در قافلہ بی ہمہ شو باہمہ رو
آن نگینی کہ تو با آہرمان ساختہ ای
ہم بہ جبرئیل امین ہم نتواں داد گرو

تیسرے دن ۱۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو گیارہ بجے علامہ اقبال نے نظام دکن سے ملاقات کی- ملاقات کے دوران علامہ نے چند فارسی اشعار پڑھے اور ایک نسخہ ''رموز بیخودی'' کا حضور نظام کو پیش کیا- حضور نظام نے اقبال سے گلہ کرتے ہوئے کہا کہ جب

میر تقی میر کا رثائی کلام

یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ خدائے سخن میر تقی میرؔ کے رثائی کلام سے بہت کم لوگ واقف ہیں- تقریباً تمام علمائے ادب و شعراس بات پر متفق ہیں کہ اردو شاعری کا سب سے بڑا شاعر میر محمد تقی میرؔ ہے- وہ میرؔ جس نے اپنے بارے میں خود کہا تھا-

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میر شاعرانہ تعلی کے امیر تسلیم کیے جاتے ہیں کئی واقعات ان کی تعلی اور نازک مزاجی کے گواہ ہیں- مسجد تحسین کا واقعہ کس نے نہیں سنا ہے- دہلی سے لکھنؤ کے سفر میں کم سخن رہنے کی وجہ کسے نہیں معلوم؟ لیکن ان تمام فخر و مباہات کے ساتھ وہ ایک درویش صفت، پاک نفس، خوش اعتقاد مسلمان اور باعمل مومن تھے- ان کی رگ رگ میں عشق محمدؐ و آل محمدؐ موجزن تھا جس کا ثبوت ہمارے درمیان ان کے کلام سے ظاہر ہے- آج میر تقی میر کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹۰ سال کا عرصہ ہو چکا ہے- لیکن آج بھی میر صاحب ہی امیر سخن تسلیم کیے جاتے ہیں- ان کے ہم عصر محمد رفیع سودا جو خود عظیم شاعر گزرے ہیں اور جن کے قصیدوں کا آج بھی اردو ادب میں جواب نہیں ہے؛ فرماتے ہیں:

سودا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرح

جب میرؔ نے مصحفی کے ایک شعر کی تعریف کی تو مصحفی نے جھک کر تعظیم کی اور اس واقعہ کا ذکر اپنے دیوان میں بڑے فخریہ انداز میں کیا- حضرت ناسخ جو لکھنؤ کی روایتی غزل کے معروف شاعر تھے میر کے تعارف میں بجا فرماتے ہیں-

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

دہلی کے دربار کا ہر بڑا شاعر لاشعوری طور پر میر کی شاعری کی پرستش کرنا ہی اپنا دین سخن سمجھتا تھا- اسی لیے تو مرزا غالب نے اعتراف کیا-

ریختی کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ملک الشعراء میاں ابراہیم ذوق نے بھی غالب کی بعض غزلوں پر میر نگاری دیکھ کر طنز کیا تھا-

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل پہ مارا

اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب سے زیادہ ذوق نے میر کی پیروی کرنے کی کوشش کی جس کو اکبر الہ آبادی نے بھی ظاہر کیا ہے-

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر
ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

یوں تو میؔر کے کلام میں ہر صنفِ سخن، جن میں قطعات، رباعی، غزل، قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد اور مسمط میں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس نظر آتے ہیں لیکن رثائی شاعری کے ذیل میں جو کلام ملتا ہے اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: ایک رباعی، چند قطعات، تین نوحے غزل کی ہیت میں اور چھے سلام جن میں ایک سلام مربع شکل میں نظم کیا گیا ہے-

میر تقی میر کے ۳۴ مراثی ہمارے درمیان موجود ہیں، جن میں ۲۹ مراثی مربع شکل میں، تین مرثیے ترکیب بند اور ایک مرثیہ ترجیع بند میں ہے- سب سے طویل مرثیہ ۴۰ بند ۱۸۰ اشعار اور سب سے چھوٹا مرثیہ بارہ بند ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے- کل رثائی اشعار کی تعداد ۱۸۵۴ ہے- اس کے علاوہ ایک نعتیہ مسدس، تین منقبتی مسدس، گیارہ منقبتی مخمس، ایک منقبتی ترکیب بند اور چار قصیدے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی شان میں آپ کے کلیات میں شامل ہیں جو بعض علمائے عروض کے بموجب جزو رثائی ادب ہیں- مضمون کے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ایک رباعی، سلام کے چند شعر، مرثیے کے چند بند اور نوحے کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں تاکہ اس عظیم شاعر کے اس گنج عشق سے شناسائی ہو سکے-

رباعی

اترا تھا غریبانہ کنارے آ کر
لب خشک ہوا سو نور چشم حیدرؑ
تر حلق دم آب سے اس کا نہ ہوا
اے آب فرات خاک تیرے سر پر

سلام

اے بدخشاں نبی کے لعل احمر السلام
دے گلستان علی کے لالہ تر السلام
ایک ساعت ہی میں امت پھر گئی نانا کی سب
کیا قیامت لائی تیرے سر کے اوپر السلام
بوند بھر پانی نہ دریا پر تجھے پینے دیا
اے تمنا دل ساقی کوثر السلام

سب

سب کنارے لگ گئے تو بحر خوں میں غرق ہے
اے کنار مصطفیٰ کے ناز پرور السلام
کیا ستم کشاں بیاں تیری کرے دل خستہ میر
نام تیرا سن کے آنکھیں روتی ہیں تر السلام

میر کے ایک مرثیہ سے جو ۲۵ بند پر مشتمل ہے صرف ۶ بین کے بند پیش کیے جا رہے ہیں۔

نسیم غم سے ہے آتش بہ جاں امام حسینؑ!
دم ایک اور ہے اب میہماں امام حسینؑ!
چراغ آخر شب ہے گا یاں امام حسینؑ!
سحر نمود ہوئی پھر کہاں امام حسینؑ!
نبیؐ نے برسوں تئیں جس کا ناز اٹھایا تھا
علیؑ نے آنکھوں پہ مدت جسے بٹھایا تھا

جسے کہ مہد میں جبریل نے جھلایا تھا
وہ خاک و خون میں اب ہے تپاں امام حسینؑ
تمام شکل نبیؐ ہی کی تھا علی اکبرؑ
اسی کو دیکھتے مشتاق روئے پیغمبرؐ
ہوا برابر خاک سے وہ گوہر تر
دیا ہے ہاتھ سے کیسا جواں امام حسینؑ!
بھتیجا یوسف ثانی تھا جس کو کھو بیٹھا
بغل میں اصغر ناداں کو لا کے رو بیٹھا
حشم خدم سبھی سے ناامید ہو بیٹھا
محل رحم تھا بے خانماں امام حسینؑ!
کوئی نہ داد گر و داد رس جو دیوے داد
ستم اس ایک پہ واں ہو رہا تھا حد سے زیاد
بلند چاروں طرف سے ہوئی تھی تیغ عناد
کلف دریغ ہوا درمیاں امام حسینؑ!
تمھارے لطف سے خاطر میں میر کی ہے نہاں
کہ روز حشر کو ہوئے رکاب پی میں رواں
صف نعال جواناں کربلا ہو جہاں
ملے اسے بھی اسی جا مکاں امام حسینؑ

اس مضمون کے آخر میں میر کے نوحے سے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

کیا نحس تھا دن روز سفر ہائے حسینؑا
ناموس کو نے گھر ہے نہ در ہائے حسینؑا!
اعوان ترے جو تھے انھیں کھا گئی تلوار!
انصار ترے سب گئے مر ہائے حسینؑا!
منظور نجابت نہ شرافت نہ سیادت
اب عیب ہوئے سارے ہنر ہائے حسینؑا!

تیرا ہی جگر تھا کہ ستم تو نے یہ دیکھے
سب ٹکڑے ہوئے تیرے جگر ہائے حسینا!
جز جور و ستم کچھ نہیں دیتا ہے دکھائی
جاتی ہے جدھر اپنی نظر ہائے حسینا!
آگے بھی کہیں میر جو کچھ بات رہی ہو
ہے لب پہ یہی شام و سحر ہائے حسینا!

☆......☆......☆

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ

آسمان مرثیہ کے آفتاب اور ماہتاب

مرثیہ کے لغوی معنی' کسی مرنے والے کی موت پر رونے' غم منانے اور مرنے والے کے اوصاف کو بیان کرنے کے ہیں۔ اس کو علمائے قدیم نے قصیدہ طور بھی کہا ہے۔ مرثیہ: عربی' فارسی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں کچھ اختلاف کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اردو زبان میں مرثیہ کا اصطلاحی مفہوم ایسی نظم کو کہتے ہیں جو شہدائے کربلا کے واقعات' شہادت اور تاثرات پر مشتمل ہو۔ ڈاکٹر صدیقی ۱۹۴۲ء میں نسیم امروہوی کو خط میں اردو مرثیہ کی بابت لکھتے ہیں کہ ہماری زبان میں مرثیے کے معنی میر انیس اور مرزا دبیر کے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی دو انقلابی مرثیہ نگار شاعر تھے جنھوں نے بگڑا شاعر مرثیہ گو کو بڑھیا شاعر مرثیہ گو بنا دیا' چنانچہ اسی لیے مولانا ابو الکلام آزاد کو لکھنا پڑا کہ غالب کی غزلیں اور میر انیس کے مرثیے دنیائے ادب کو اردو ادب کی جانب سے تحفے ہیں۔ شاعری کی دنیا میں' اردو شاعری' فارسی کی نسبت مثنوی' رباعی' غزل اور قصیدے میں کسی حد تک برابر ہو سکی' لیکن فارسی کی بلند پروازیوں سے اونچی پرواز نہ کر سکی۔ غالب کی غزلوں نے اردو غزلیات کو فارسی غزلیات کا ہم پلہ بنا دیا' میر حسن کی مثنویات' جن کی تعداد گیارہ ہے اور جس میں ''سحر البیان'' اور ''گلزار ارم'' بہت اونچی سطح کی مثنویاں ہیں' لیکن پھر بھی مولوی کی مثنوی کے سامنے سر اونچا نہ کر سکیں۔ اردو کے رباعی گو اور قصیدہ گو شاعروں کا کلام بھی بہت معیاری اور اونچا ہوا' لیکن فارسی شعرا کے کلام سے بڑھ نہ سکا۔ تمام ناقدین' مبصرین اور مفسرین کا بلا تردد یہ فیصلہ ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر اور ان کے حلقہ مرثیہ نگاری نے اردو مرثیہ کو وہ مقام عطا کیا کہ عربی اور فارسی کا مرثیہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔

میر انیس نے ایک مرثیہ کے آغاز پر چہرہ میں یہ دعا مانگی تھی:

یا رب! چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم! خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے
تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

میر انیس کی یہ دعا ایسی مستجاب ہوئی کہ میر انیس کا شمار اردو زبان کے چار بڑے شعرا میر تقی میر، غالب اور علامہ اقبال میں سرفہرست ہوگیا۔ میر انیس نے ۷۴ سال عمر پائی۔ بقول محمد حسین آزاد مولف ''آب حیات'': میر انیس نے کئی ہزار مرثیے لکھے۔ حسن احسن لکھتے ہیں کہ میر انیس نے ۱۴۰۰ مرثیے رقم کیے لیکن اب ہمارے پاس صرف ۲۰۰ کے قریب مراثی طبع شدہ ہیں اور بقول مسعود حسن ادیب موجودہ مراثی انیس کی تعداد ۲۴۵ سے ۲۵۰ کے درمیان ہے یعنی میر انیس کے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف ہو گیا' جو اردو ادب کا بڑا المیہ ہے۔ مبصرین نے لکھا ہے کہ مرزا دبیر نے تین ہزار مراثی قلم بند کیے لیکن اب صرف بیس جلدوں میں مراثی باقی رہ گئے ہیں جنھیں ان کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج نے مرتب کیا۔ ان جلدوں میں پہلی پندرہ جلدیں مراثی پر' تین جلدیں سلام پر' ایک جلد رباعی اور ایک جلد متفرقات پر مشتمل ہے۔

یہ بات صرف اردو شاعری ہی پر محدود نہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں ایسا سلسلہ نظر نہیں آتا جس میں ایک ہی نسل میں مسلسل قہرمان اور بلند ترین شعرا زمان پیدا ہوئے ہوں اسی لیے تو میر صاحب نے فرمایا تھا۔

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس کے پردادا میر ضاحک اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ نگار' غزل گو اور ہزل گو شاعر گزرے ہیں- آپ کے دادا میر حسن اپنے دور کا یکتا فن شاعر تھے جنہوں نے گیارہ مثنویات رقم ہیں' آپ کے والد میر خلیق نے مرثیہ کی وہ بنیاد رکھی جس پر بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری انیس نے مرثیہ کا تاج محل تعمیر کیا-

یہی نہیں بلکہ میر انیس کے بیٹے میر نفیس نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں اپنا مقام پیدا کر کے یہ بتلایا ان کی روشنی بھی خورشید سخن سے کم نہیں- انیس کے پوتے عروج نے بھی معرکہ آرا مراثی تصنیف کیے- اس کے علاوہ میر انیس کی بیٹی کی اولاد میں پیارے میاں رشید' میر عارف اپنے زمانے کے یگانہ فن گزرے ہیں- میر انیس کے بھائی نواب محمد مونس اور انس کے علاوہ میر انیس کے دوسرے بیٹے سلیس اور رئیس کے مراثی بھی مشہور اور معروف ہوئے- چنانچہ اس طرح سے اردو ادب بالخصوص رثائی ادب کی خدمت میر انیس کے خاندان کی طرح کوئی اور خاندان نہ کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کرنے کی امید کی جا سکتی ہے- اسی لیے تو میر انیس نے فرمایا-

مری قدر کر اے زمین سخن
کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا
سبک ہو رہی تھی ترازوئے شعر
کہ پلے کو ہم نے گراں کر دیا

میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ میں تمام اصناف شاعری کو یکجاہ جمع کر دیا- بقول کسی آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری اس میں غزل کا تغزل' مثنوی کی واقعہ نگاری اور منظر کشی' نظم کا تسلسل اور سلاست' قصیدہ کا شکوہ رزمیہ کی جھلک اور رباعی کی چھلک نظر آتی ہے- اس کے علاوہ شاعری کے محاسن زبان و بیان صنائع معنوی و لفظی' روز مرہ اور محاورے' تشبیہات اور استعارات' تکرار و تناسب' لف و نشر وغیرہ بدرجہ اتم نظر آتے ہیں- اسی لیے تو میر انیس نے اپنے کلام کے بارے میں فرمایا

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں

میر انیس ہر لفظ کو اس کے مقام پر اس طرح سے رکھتے تھے جس طرح ایک

زرگر نگینہ کو انگوٹھی پر۔ چنانچہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ''ہر سخن موقع دارد و ہر نکتہ مقامی دارد'' وبعض مناظر کشی میں شوکت الفاظ سے تاج محل تعمیر کرتے تو دوسرے مقام پر روزہ مرہ سے وہ کیفیت پیدا کر دیتے کہ چھوٹے سے الفاظ سے آسماں کا سماں باندھ دیتے۔ ''کہاں'' اور ''کیا'' بڑے معمولی الفاظ ہیں' لیکن میر صاحب کی کرشمہ سازی ملاحظہ کیجئے ''کہاں'' کا تکرار دیکھئے جس میں غضب کا درد بھرا ہے۔

کہاں تھا مدینہ کہاں کربلا
کہاں کا مسافر کہاں آ گیا

کیا کے لفظ کو مطلع کے مصرع میں ایسا رکھا کہ سارے کائنات کی تنہائی اس میں سما گئی۔ روز عاشور کا منظر ملاحظہ کیجئے۔

آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے

غالب کے ہم عصر مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اس مصرع کو سن کر کہا تھا کہ میر صاحب نے تمام مرثیہ بے خود کہا' صرف یہی ایک مصرع پورا مرثیہ ہے جس میں دو عالم کی تنہائی بھر دی گئی ہے۔

علما ادب نے لکھا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر مرثیہ میں روزمرہ ایسے برتے تھے کہ گفتگو معلوم ہوتی تھی۔ میر انیس نے ایک کمسن لڑکی سے امام حسینؑ کی گفتگو کو کس طرح سے نظم کیا ہے ملاحظہ کیجئے۔ حضرت سکینہؑ امام حسینؑ کی چھوٹی صاحبزادی تھیں جن کو امام حسینؑ بہت پیار کرتے تھے۔ چنانچہ رخصت ہوتے ہوئے فرماتے ہیں۔

راحت کے دن گذر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو کہ یتیمی کا دور ہے۔

چونکہ بچی لفظ یتیم پہلی بار سنتی ہے' اس لیے فوراً کہتی ہے:

ننھے سے ہاتھ جوڑ کر بولی' وہ تشنہ کام:
بتلایئے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھوں سے خوں بہا کے' یہ کہنے لگے امامؑ
کھل جائے گا یہ درد الم' تم پہ' تا بہ شام
بی بی نہ پوچھ کچھ' یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ' وہ بچہ یتیم ہے

سفیرِ اردو ڈاکٹر انعام الحق جاوید نیو یارک میں

خواتین و حضرات! دنیا کی تمام حکومتوں کا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ جب کسی ملک کا سربراہ یا سفیر آتا ہے تو اس کا شاندار خیر مقدم کیا جاتا ہے اور اس شہر کی ممتاز اور معروف شخصیتوں سے اس کا تعارف کرایا جاتا ہے؛ چنانچہ اسی رسم کی تکمیل کے لیے نیو یارک کی پھر آج یہ محفل سجائی' تاکہ سفیرِ اردو جناب ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا خیر مقدم' ان کی شخصیت کا تعارف اور خدمات کا کسی حد تک اعتراف ہو سکے۔

دنیائے ادب میں اردو' آبادی کے لحاظ سے تیسرا بڑا ملک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے باشندوں کی تعداد نو سو ملین سے زیادہ ہے۔ مملکتِ اردو کا رقبہ اور اس کی حدوں کا تعین کرنا اس لیے دشوار ہے کہ اس کی سرحدیں تقریباً دنیا کے تمام ملکوں سے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں' یعنی اردو زبان' دنیا کے تمام ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

تاریخ کے پس منظر میں اگر امیر خسرو کی اُردو شاعری کو اردو کی پہلی مستند دستاویز قبول کیا جائے تو اردو سلطنت کی عمر کوئی سات سو سال کے لگ بھگ ہوتی ہے اور اگر ادبیات کے کتب خانے میں دیکھا جائے تو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ معانی کا دیوان تقریباً چار سو سال پرانا نظر آتا ہے۔ بہر حال' یہ حکومت اردو' نئی ہوتی ہوئی بھی بہت پرانی ہے' جس کے مختلف زمانوں میں مختلف نام رہے ہیں۔

چونکہ کائنات تغیرات کا نام' تکامل کا گام اور حادثات کا جام ہے؛ اس لیے دنیائے ادب ان حالات سے محفوظ نہ رہ سکا' چنانچہ جو بھی حادثات اور واردات ادب کی سرزمین پر شعوری اور لاشعوری طور پر واقع ہوئے ان کا اثر باقی رہا اور ان ہی نقش حادثات نے اس کاروان کی راہ پیمائی کا نقشہ ہمیں سات سو سال کے بعد فراہم کیا اور جس کے مطالعہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری کی حکومت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جو امیر خسرو سے شروع ہو کر نظامی دکنی پر ختم ہوتا ہے اردو کا بچپن

ہے- اردو کا دوسرا دور ملا وجہی سے شروع ہو کر مومن خان مومن کی عشقیہ شاعری پر ختم ہوتا ہے- تیسرا دور محمد حسین آزاد سے شروع ہو کر علامہ اقبال پر تمام ہوتا ہے اور چوتھا دور جو ترقی پسند شاعروں سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے اردو کے پہلے اور دوسرے دور میں اسے مختلف ناموں سے پکارا گیا جس میں ہندوی' بھاشا' گجری' کھری بولی' پراکرت' زبان معلی اور ریختہ قابل ذکر ہیں- اردو کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ کبھی اس کی زلفوں کو شہنشاؤں کے دربار میں سلجھایا گیا اور کبھی اس کے پیروں میں گھنگرو باندھ کر بازاروں میں ناچایا گیا- اردو کے حکمراں پہلے صرف اردو معلی کے حامی ہوا کرتے تھے جو دبستان دہلی' آگرہ' امروہہ اور لکھنو سے تعلق رکھتے تھے' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی باگ اور نشو ونما کی ذمہ داری تمام تر اردو محلّہ کے حامیوں نے تھامی اور آج اسی لیے اردو محلّہ کا ایک سپوت ڈاکٹر انعام الحق جاوید جو پنجابی لہجہ سے مزین ہوتے ہوئے بھی اردو کا سفیر ہو کر ہمارے درمیان آیا ہے-

آج سے ۴۷ سال قبل جب ماں باپ نے انعام الحق نام رکھا تو یہ فرزند حق انعام ہوتے ہوئے اردو ادب کا انعام بھی بن گیا اور اردو کے حق کو منوانے کا حق دار ثابت ہوا ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے نام سے تو میں واقف تا اور ان کے کام سے بھی کچھ آشنائی تھی لیکن حضرت ضمیر جعفری کی زبانی ہمیشہ ان کا ذکر خیر سن کر بڑی خواہش ہوئی کہ اس ہستی سے ملاقات کی جائے جو گذشتہ ہفتہ واشنگٹن میں پوری ہوئی- میرے پاس لے دے کے ڈاکٹر صاحب کی صرف دو کتابیں تھیں' ایک مزاحیہ کلام کا مجموعہ ''خوش کلامیاں'' اور ایک سنجیدہ بیان کا مجموعہ ''ساتویں سمت'' جب کہ موصوف کی سات کتابیں شائع ہو چکیں ہیں اور چھ کتابیں زیر طبع ہیں- کیونکہ ہم نیو یارک میں رہتے ہیں جہاں پر بقول ضمیر جعفری صاحب کتے زیادہ اور اردو کی کتابیں کم نظر آتی ہیں- ہم نے انہی دو کتابوں کو غنیمت جانا اور موصوف کی سنجیدہ شاعری کو ہی اپنا مضمون بنایا- مجھے صرف تین دن قبل اس مضمون کو لکھنے کا حکم دیا گیا- ایک طرف ڈاکٹر انعام الحق جیسی شخصیت جو ادیب' شاعر' نقاد' مضمون نویس' کالم نگار اور ٹیلی ویژن اسٹار کی تیس سالہ خمات کو تین چار صفحوں میں بیان کرنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن تھا تو دوسری طرف اپنی اور قارئین کی تشنگی کو دور کرنا ضروری' چنانچہ اس دریائے لطافت سے کچھ چھینٹیں کرنا لازم جانا اور بس اشارے کرتا ہوا گزر جاؤں گا اور بقول علامہ اقبال ''برہنہ نگفتن ہنر گویائیست-''

جیسا کہ آپ سب واقف ہیں ڈاکٹر انعام الحق اردو ادب کے ایم اے اور پنجابی کے ایم اے پی ایچ ڈی ہیں- اگرچہ ہمارے ملکوں میں شاعر اور ماہر کے لیے اتنی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی- موصوف آج کل مقتدرہ قومی زبان (Alumani for National Languages) کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہیں جس کے صدر جناب افتخار عارف ہیں- اس کے علاوہ پنجاب میان کی ایک وسیع تنظیم ادبی پریوار کے صدر اور (Pakistan Writers Form for Kashmir) میں جناب ضمیر جعفری کے (Second in Command) ہیں-

فارسی کی ایک مشہور کہاوت ہے ''ولی را ولی می شناسد'' ہم اگرچہ دیار غربت میں ہیں لیکن تحقیق اور تنقید کے دریا میں شناور ہیں چنانچہ موصوف سے کچھ ہی گفتگو کرنے کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سمندر کی گہرائیوں سے موتی رولنے والوں میں سے ہیں- اسی لیے تو حکومت پاکستان نے ان کی تنقید وتبصرہ کی کتابوں پنجابی ڈراما ''پنجابی ادب دا ارتقا'' کو ۱۹۸۶ء اور ۱۹۹۰ء میں خوشحال خٹک اور ''جام درک ایوارڈ'' عطا کیا- اس کے علاوہ پنجابی تنقید ''پرکھاں'' کو ۱۹۷۹ء میں گلڈ ایوارڈ اور مزاحیہ شاعری کے مجموعہ ''خوش کلامیاں'' کے عالمی ایوارڈ برائے طنز و مزاح ایشین آرٹس کونسل ناروے کی جانب سے دیا گیا- ڈاکٹر صاحب کی دوسری تصانیف جو زیر طبع ہیں ان میں قلم برداشتہ' گورا گورا گورستان' سفرنامہ یورپ اور پنجابی شاعری قابل ذکر ہیں-

ادب کا سرمایہ جو قارئین ادب کو انعام الحق جاوید کی جانب سے انعام ہو گا اور یہ خیالات کی بارات ہر ذہن انسانی میں زندہ جاوید رہے گی- ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی سنجیدہ شاعری کا مجموعہ ''ساتویں سمت'' آپ کے فکر و خیال اور زبان کے برتنے کے سلیقہ کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے- چنانچہ اسی لیے تو مشہور شخصیت جناب امجد اسلام امجد نے لکھا ہر قہقہے کے پیچھے آنسوؤں کا ایک نظر نہ آنے والا دریا ہوتا ہے- انعام الحق جاوید کی یہ سنجیدہ شاعری اپنی نظر نہ آنے والے آنسوؤں کے دریا کا عکس ہے- اس اعتبار سے وہ ضمیر جعفری اور انور مسعود کے بعد ہمارے عہد کا تیسرا بڑا شاعر ہے-

جناب احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں : انعام الحق جاوید کی غزل میں اس مقامی لہجے کا بھرپور حسن موجود ہے جسے آئندہ پاکستان میں کہی جانے والی غزل کی کسوٹی بننا ہے-

جناب افتخار عارف لکھتے ہیں : ہفت اقلیم لفظ و معانی کا یہ نوجوان مسافر اب

نئی سج دھج کے ساتھ شاعری کی سوغات لے کر آیا ہے۔

ہاں ! بے شک یہ سفیر شعر و سخن' یہ بلبل گل و چمن : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ہمارے شہر نیو یارک میں کچھ اشعار بشکل انعام لایا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :

میں پیاس کا دریا ہوں' یہاں کون ہے میرا
دریا کا بہاؤ تو سمندر کی طرف ہے
میں اس کو بھول کے جاؤں تو کس طرف جاؤں
وہی تو ہے' جو میرا معتبر حوالہ ہے
کسی سے کام لینا بھی کوئی آساں نہیں' لیکن
کسی کے کام آنا بھی بڑا دشوار ہوتا ہے

قطعہ ملاحظہ کیجیے :

ظالم کو' شر کے خوف سے' مظلوم کہہ گئے
مصنف' گناہ کار کو معصوم کہہ گئے
کاٹا درخت بیٹھ کے سائے میں' اور پھر
سورج کی تیز دھوپ کو مذموم کہہ گئے
انصاف کی تلوار ہے شہ رگ پہ انھی کی
وہ لوگ' جو قانون کے پابند بہت ہیں
کیا خوب' تمناؤں کی وحدت میں ہے کثرت
دامن تو فقط ایک ہے' پیوند بہت ہیں
زمیں سے آسماں تک' فاصلہ حدِ نظر کا ہے
زمین اور آسماں لیکن' کبھی باہم نہیں ہوتے
وہ جانتا ہے کہ میں گر کے ٹوٹ جاؤں گا
اسی لیے تو وہ اونچا اڑا رہا ہے مجھے

آخر میں موصوف کی اس غزل پر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں :

قفس کو آشیاں لکھتے رہے ہیں
بہاروں کو خزاں لکھتے رہے ہیں

ہمارے سامنے تھے زرد چہرے
مگر ہم سرخیاں لکھتے رہے ہیں
قلم کی جس نے بھی قیمت چکائی
اسی کی داستاں لکھتے رہے ہیں
جسے کہتا ہے گلچیں سارا عالم
اسے ہم باغباں لکھتے رہے ہیں

☆……☆……☆

قصیدہ بردہ ...... بوصیری اور علامہ اقبال

تاریخ نعت میں دو نعتیہ قصیدے اور تین نعت گو شعرا مشہور ہوئے ہیں، جن کو حضور اکرم ﷺ سے خاص نسبت حاصل رہی ہے۔ قصیدہ بانت سعاد، جسے قصیدہ چادر بھی کہتے ہیں؛ جناب کعب بن زہیر کا ہے۔ جناب کعب بن زہیر زمانہ جاہلیت کے ممتاز شعرا میں شمار کیے جاتے تھے جنہوں نے پہلے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخانہ اور توہین آمیز اشعار کہے لیکن بعد میں اپنے کیے پر نادم ہو کر رحمت العالمین سے معافی طلب کر کے حضورؐ کی شان میں نعتیہ قصیدہ بانت سعاد پڑھا جس کے ایک شعر پر حضورؐ نے اصلاح کرتے ہوئے کعب کو اپنی ردائے مبارک عطا کی جس سے ان کا لقب شاعر چادر رحمت ہو گیا۔ یہ ردا آج بھی ترکی میں (Topeopi) میں محفوظ ہے۔ ایک شعر میں جو حضورؐ نے تصحیح فرمائی وہ سیف الہند کی جگہ سیف اللہ ہے۔ یعنی رسول خدا ﷺ ہند کی تلوار نہیں بلکہ خدا کی تلواروں میں سے ایک چمکدار اور آبدار تلوار ہیں جن سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔

دوسرا مشہور قصیدہ "الکواکب السعدیہ فی مدح خیر البریہ" یا قصیدہ میمیہ ہے، جو قصیدہ بردہ شریف کے نام سے مشہور ہے، جسے شرف الدین ابو عبداللہ محمد بن سعید بوصیری نے لکھا ہے۔ علامہ بوصیری ۶۰۸ ہجری میں مصر کے ایک گاؤں بوصیر میں پیدا ہوئے اور ۸۸ سال عمر بسر کر کے ۶۹۶ ہجری میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ قصیدہ، قصیدہ بانت سعاد کے تقریباً ۶۵۰ سال بعد لکھا گیا ہے۔ مختلف مستند حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بوصیری فالج کا حملہ سے مفلوج ہو چکے تھے چنانچہ برص اور جذام کی بیماری کی روایت ضعیف ہے۔

جب فالج کا کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا تو بوصیری نے حضور اکرم کی بارگاہ میں قصیدہ لکھا۔ اسی رات خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور

حضور اکرم ﷺ کو یہ قصیدہ سنایا۔ حضور نے خوش ہو کر آپ کے مفلوج بدن پر دست مبارک پھیرا اور بوصیری پر اپنی چادر اوڑھائی۔ جب آنکھ کھلی تو بوصیری مکمل صحت یاب تھے۔ صبح کو بغیر سہارے کے چلتا ہوا دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوا۔ راستے میں قطب زماں شیخ ابو الرجا ملے انہوں نے علامہ بوصیری سے قصیدہ کا مطلع پڑھ کر وہی قصیدہ سنانے کی درخواست کی جو انہوں نے حضور ﷺ کو گذشتہ شب سنایا تھا۔ تمام لوگ یہ سن کر حیرت میں پڑ گئے کیونکہ بوصیری نے اس قصیدہ کو ابھی تک لوگوں کو نہیں سنایا تھا اور نہ اس واقعہ کو بیان کیا تھا۔ اس وقت سے یہ قصیدہ حضور کی عطا کی گئی چادر کی نسبت سے قصیدہ بردہ ہی کہلاتا ہے۔ یہ قصیدہ ۱۶۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ رفع و دفع بلا اور حلال المشکلات مانا جاتا ہے اس میں حضور ﷺ کے فضائل خصائل شمائل مناقب معجزات اور ولائے محمدی کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ اس موقع پر اس بات کا انکشاف بھی بے محل نہیں کہ سب سے عظیم نعت گو شاعر جنہیں حضور نے منبر پر بٹھا کر نعت سنی حسان بن ثابتؓ ہیں۔ جنہیں شاعر دربار رسالت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق گفتگو اور ان کے نعتیہ کلام پر تاریخ نعت گوئی میں کافی ذخیرے موجود ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے فارسی کلام میں کعب بن زہیر کا ایک بار اور علامہ بوصیری کا دو بار منظوم تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے خطوط میں اس کا ذکر بھی کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے ان دو شاعروں یعنی کعب بن زہیر کو اپنی زندگی میں تمام اصحاب کے سامنے اور علامہ بوصیری کو حالت خواب میں کئی صدیوں کے گذر جانے کے بعد چادر رحمت عطا کر کے روحی اور بدنی بیماریوں سے نجات دے کر وہ مقام عطا کیا کہ آج کسی کو حاصل نہیں چنانچہ شاید اسی لیے علامہ اقبالؔ نے بھی ان افراد کا حوالہ دیتے ہوئے حضور سے شفایابی کی دعا کی ہو گی۔

رموز بیخودی کی ۳۸ اشعار پر مشتمل مثنوی بعنوان ملت محمدیہ کا اساس توحید اور رسالت ہے کے ذیل میں علامہ کعب بن زہیر کے قصیدہ بانت سعاد کی بابت لکھتے ہیں۔

پیش پیغمبر چو کعب پاک زاد
ہدیہ ئی آورد از بانت سعاد
در ثنایش گوہر شب تاب سفت
سیف مسلول از سیوف الہند گفت

گفت سیف من سیوف اللہ گو
حق پرستی جز براہ حق مپو

ترجمہ: کعب پاک ذات نے حضور کی خدمت میں قصیدہ بانت سعاد کا تحفہ پیش کیا جو آپ کی ثنا میں موتیوں کے ہار کی مانند درخشاں تھا جس میں حضور کو ہند کی شمشیر بتلایا- حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سیف خدا کہو اور ہمیشہ حق کی پرستش کرو اور غیر از حق کسی دوسری راہ پر قدم مت بڑھاؤ جہاں تک جناب بوصیری کے تذکرے کا تعلق ہے علامہ اقبالؔ نے دو بار ان کا ذکر کیا ہے- ایک بار ۱۹۱۸ء کے رموز بیخودی میں بعنوان عرض حال مصنف بحضور رحمت العالمین ہے دوسرا ۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال میں سرسید احمد خان کو خواب میں دیکھنے کے بعد اور سرسید کی تاکید پر اپنی بیماری کے لیے حضور سے شفا طلب کرنے کی ہدایت پر ملتا ہے-

رموز بے خودی میں ۴۵ اشعار کی مثنوی کے ۴۴ویں شعر میں فرمایا-

ای بصیری را ردا بخشندہ ئی
بربط سلما مرا بخشندہ ئی
ذوق حق دہ این خطا اندیش را
اینکہ نشناسد متاع خویش را

یعنی مسلمان اسرار نبی سے بیگانہ ہو گئے ہیں اور پھر کعبہ بت خانہ بن گیا ہے- ہمارا شیخ برہمن سے بھی بڑا کافر ہے کیونکہ سومنات ہمارے شیخ کے سر کے اندر ہے جبکہ برہمن کا سومنات اس کے بدن سے باہر ہے-

علامہ اقبالؔ نے اپنے خط ۲۹ جون ۱۹۳۶ء میں سر راس مسعود کو لکھا کہ ۳ اپریل ۱۹۳۶ء جب میں بھوپال میں تھا آپ کے جد سرسید احمد خاں کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہہ رہے تھے اپنی بیماری کو حضور کی خدمت میں عرض کرو چنانچہ جیسے ہی خواب سے بیدار ہوا میں نے چند اشعار بزبان فارسی لکھے اور اب لاہور پہنچا تو اس کو ایک مثنوی کی شکل میں ترتیب دے کر اس کا نام ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' رکھا ہے- (مکتوبات اقبالؔ بھوپال صفحہ ۶۰ ' اخلاق اثر) اس مثنوی کے آخری ۹۲ اشعار بعنوان در حضور رسالت مآب میں ۵ اشعار اقبالؔ اپنی بیماری اور دوا خوری کے بارے میں لکھتے ہیں

اور حضور سے بصیری کا واسطہ دے کر شفاعت طلب کرتے ہیں۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کی بیماری کے عنوان کے ذیل میں لکھا کہ علامہ چھوٹے بچوں کی طرح کڑوی اور تلخ دواؤں سے گھبراتے تھے اور انہیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

کار ایں بیمار نتواں برد پیش
من چو طفلاں نالم از داروی خویش
در نسازد بادوا با جان زار
تلخ و بویش بر مشامیم ناگوار

☆...☆...☆

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

علامہ اقبال کا شاہین

شاہین کے موضوع پر علامہ اقبال کے فارسی اور اردو اشعار پر مشتمل پہلا تحقیقی جائزہ

کسی مشاعرے میں بابائے ظرافت سید ضمیر جعفری کا یہ مزاحیہ، طنزیہ اور سنجیدہ شعر گوش زد ہوا:

ڈاکٹر اقبال کا شاہین کب کا اڑ گیا
اب کوئی اپنا بجائے جانور پیدا کرو

اس مصرعے اولیٰ میں اقبال کا شاہین میری فکر و توجہ کا مرکز بنا اور اسی شاہین کی تلاش میں سب سے پہلے میں نے پرندوں پر شکاری پرندوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا تاکہ شاہین کے جغرافیائی، تاریخی، ماحولی، خاندانی اور فطرتی حالات کا علم ہو سکے۔ پھر ان معلومات کی روشنی میں شاہین کو علامہ کی تحریروں اور تقریروں میں ڈھونڈنے کی کوشش کی اور آخر میں علامہ اقبال کے فارسی اور اردو کلام کے آئینے میں شاہین کی مکمل تصویر اور تنویر دیکھی، جس کا عکس آپ کی نظر کے سامنے ہے۔

یوں تو علامہ اقبال کے شاہین پر مختلف مختصر تحریریں، اقتباسات: اقبالیات کے دامن میں نظر آتی ہیں، لیکن یہ پہلی تحقیقی تحریر ہے جس میں علامہ کے ۶۳ اشعار کو شامل کیا گیا ہے اور اس موضوع پر کل فارسی اور اردو اشعار، جن کی تعداد ۱۰۶ ہے؛ زیرِ مطالعہ اور بحث قرار دیے گئے ہیں۔

علامہ اقبال سے قبل اور علامہ اقبال کے بعد اغلب فارسی اور اردو کے شاعروں نے اپنے کلام میں بعض پرندوں کو ان کی فطرت، آواز، رنگ و شکل اور ماحولی کیفیت کے

اعتبار سے نظم کیا ہے' جن میں مرغِ عشق' بلبل' ذاغ' زغن' قمری' کبوتر' عقاب' شاہین' مور' طوطا' کبک' فاختہ اور چڑیا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض شعرا نے ان پرندوں کی جمالی تصویر اور فطرتی تفسیر بھی کی ہے اور دنیائے ادب میں ایک خاص پرندے کے فطرتی تقاضوں کو تمثیلی طور پر انسان کی کامیاب زندگی کے لیے مشعلِ راہ بنا کر پیش نہیں کیا۔ علامہ نے اس بات کی کوشش کی کہ ملتِ اسلامیہ دنیا کی دوسری قوموں میں اس طرح زندگی کرے جس طرح پرندوں کی دنیا میں شاہین ؛ چنانچہ اس طرح علامہ اقبالؔ کے مختلف فلسفیانہ نظریات جن میں خودی' بے خودی' تصوف' جہاد' اجتہاد اور مردِ مومن شامل تھے' شاہین بھی شامل ہو گیا ؛ اسی لیے علامہ کی تصویر کے ساتھ بعض اوقات شاہین کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبالؔ' مولوی ظفر احمد صدیقی کو خط میں لکھتے ہیں

شاہین بے شک ایک پرندہ ہے اور میں نے اسے اپنے اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت بھی دی ہے۔ اس کا اندازہ ان عوامل سے ہو سکے گا' جن کا تعلق شاہین کی فطری خصوصیات سے ہے۔ میرے کلام میں شاہین کو تشبیہ محض شاعرانہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ خود دار اور غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا' دوسرے یہ بے تعلق آشیانہ نہیں بناتا' سوم یہ کہ بلند پرواز ہے' چہارم یہ کہ خلوت پسند ہے اور سب سے آخری بات یہ کہ تیز نگاہ ہے۔ میرے نزدیک اسلام میں مردِ مومن کی خصوصیات بھی کم و بیش یہی ہیں' جو بظاہر اس حقیر سے پرندے میں پائی جاتی ہیں ؛ یہی وجہ ہے کہ میں نے شاہین کو اپنے اکثر اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہو گا کہ شاہین کے علاوہ اقبالؔ نے اسی خاندان کے دوسرے پرندوں' جن کی عادات و اطوار شاہین کے طرح ہوتے ہیں ؛ شعری ضرورت کے طور پر استعمال کیا ہے جن میں عقاب (Eagle) شہباز (Hawk) اور دریائی عقاب (Osprey) قابلِ ذکر ہیں۔

اگرچہ علامہ کے نثری حوالہ جات میں یہی پانچ خصوصیات شاہین کی نظر آتی ہیں لیکن آپ کے منظوم کلام میں جو اردو میں ''بانگِ درا'' ''بالِ جبرائیل'' ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' اور فارسی میں ''اسرارِ خودی'' ''رموزِ بے خودی'' ''زبورِ عجم'' ''پیام

مشرق'' ''جاوید نامہ'' ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' اور ''ارمغان حجاز'' شامل ہیں تقریباً دس شاہین کی خصوصیات' بیان کی گئی ہیں' یعنی:

☆ شاہین' کلمہ گویوں کی طرح دنیا کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے-
☆ شاہین جسور اور دلیر ہوتا ہے-
☆ شاہین تیز رفتار اور اس کی ضرب کاری ہوتی ہے-
☆ شاہین ہر رنگ کا ہوتا ہے-
☆ شاہین پرندوں کی دنیا میں ممتاز اور منفرد ہوتا ہے-

علامہ اقبال کے اردو کلام میں ۳۲ اشعار شاہین پر اور پانچ اشعار شاہین صفت پرندے باز' شہباز اور عقاب پر ملتے ہیں- جس میں ایک ۸ اشعار پر مشتمل نظم ''شاہین'' ''بال جبریل'' میں شامل ہے- آپ کے فارسی کلام میں ۳۶ اشعار شاہین پر اور ۲۷ اشعار شاہین صفت باز: شہباز پر نظر آتے ہیں' جن میں ۲ نظمیں ''شاہین و ماہی'' اور ''پند باز بہ بچہ خویش'' ''پیام مشرق'' میں شامل ہے- اس طرح اس موضوع پر کل ۱۰۶ اشعار موجود ہیں-

اگرچہ اسلامی حکومتوں کا زوال اٹھارویں صدی سے شروع ہو چکا تھا' لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی کسمپرسی اور ان کا معنوی' اقتصادی اور اخلاقی زوال انتہا پر پہنچ چکا تھا- ساری دنیا میں ملت اسلامیہ ذلت و خواری اور تفرقہ کاری میں مبتلا تھی- ایسے مایوس دور میں حکیم الامت انھیں شاہین کی مثال دے کر بلند پروازی کی دعوت دے رہے تھے-

تو شاہین ہے' پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد
میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
تیرے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
ہماں فقیہ ازل گفت جرہ شاہین را
بہ آسمان گردی باز میں نہ پروازی

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

ذو بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمین چیست
صحرااست کہ دریااست تہ بال و پر ماست

(ترجمہ: پکارا کہ میں شاہین ہوں مجھے زمین سے کیا کام- صحرا ہو کہ دریا سب میرے پروں کے نیچے ہیں)

گرفتم این کہ چوں شاہین بلند پروازی
بہوش باشد کہ صیاد ما کہن دام است

(ترجمہ: چونکہ ہم شاہین بلند پرواز ہیں اس لیے ہوشیار زندگی گزارنی چاہیے کیونکہ ہمارا صیاد تجربہ کار ہے)

تو عقابی طائف افلاک شو
بال و پر بکشاد پاک از خاک شو

جامعہ اسلامی میں شہنشاہی نظام' جاگیرداری نظام' خانقا مزاجی اور دریوزہ گری کا رواج عام تھا- ہر شخص کام وکاج سے کتراتا تھا اور قضا و قدر کا بہانہ کر کے مفت خوری میں مبتلا تھا- ہر شخص کی آنکھیں دوسرے کے مال و دولت پر جمی ہوئی تھیں جب کہ دنیا کی دوسری اقوام دن دو گنے رات چوگنے ترقی کر رہے تھے اور محنت اور مشقت ان کا شیوہ تھا- اس خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے علامہ نے شاہین صفت کردار کو اپنانے کی پیش کش کی' تاکہ مسلمان دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت و عزت دوبارہ حاصل کرسکیں:

نگاہ عشق' دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار' مردہ' سزاوار شاہباز نہیں

پھرا فضاؤں میں کرگس' اگرچہ شاہیں وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

رزق ذاغ و کرگس اندر خاک گور

رزق بازان و سواد ماہ و ہور

(ترجمہ: کوے اور گیدڑ کا رزق قبر کی خاک میں ہے لیکن باز کا رزق چاند اور سورج کی جستجو میں چھپا ہے)۔

دانہ دانہ گوہر از خاکش مگیر
صید چون شاہین از افلاکش بگیر

(ترجمہ: خاک سے دانہ دانہ مت اٹھا! شاہین کی طرح اپنا شکار آسمان سے حاصل کر)

ندارد کار با دون ہمتاں عشق
تذرو مردہ را شاہین نگیرد

(ترجمہ: عشق کبھی پست ہمتوں سے کام نہیں رکھتا' مردہ تذرو کو بھی شاہین نہیں پکڑتا)

علامہ اقبالؒ کے نظریہ کے مطابق وطن پرستی اقدار اسلامی کے مغائر ہے چونکہ اسلام کوئی سرحد نہیں رکھتا اسی لیے تو حضور اکرمؐ کی حدیث کو علامہ نے نظم کر کے کہا تھا ''مسجد من ایں ہمہ روی زمین'' (میری مسجد تمام کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے۔) وطن سے محبت اور وطن کی حفاظت کرنے کی اسلام تاکید کرتا ہے۔ جب بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم ممالک میں وطن پرستی کی وبا پھیلنے لگی تو علامہ نے فرمایا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو اس کا لباس ہے' وہ ملت کا کفن ہے

علامہ اقبالؒ نے وطن سے پیار و محبت کرتے ہوئے بھی ساری دنیا کے ممالک سے رشتہ برقرار رکھنے کی تاکید کی۔ فرماتے ہیں:

ہر ملک' ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست

(ترجمہ: ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے)

اس وطن پرستی یا آشیانہ بندی' جدائی اور تفرقہ کو مضر جانتے ہوئے علامہ نے شاہین صفت زندگی گزارنے پر مشورہ دیا۔ یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ شاہین: پہاڑوں اور چٹانوں پر اپنا خاندان تشکیل دیتا ہے اور رہبانیت کا پیرو نہیں ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے' بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی

چنیں یاد دارم ز بازان پیر
نشیمن بشاخ درختی مگیر

(ترجمہ: بڈھے باز کی نصیحت مجھے یاد ہے کہ کبھی کسی درخت کی شاخ پر نشیمن تعمیر نہ کرنا)

کنامی نگریم در باغ و کشت
کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت

(ترجمہ: میرا گھر، باغ اور کھیتوں میں نہیں ہے، کیونکہ میری جنت ؛ کوہ، دشت اور صحرا میں ہے)

خلوت پسندی، اندیشہ گری اور خود شناسی : انسانی اقدار کی اعلی صفتیں ہیں- اس سے انسانی جوہر آشکار ہوتا ہے اور ایک بے ذرا ابوذرؓ بن جاتا ہے- علامہ کا مرد مومن ان صفات سے متزہ ہے- محافل شعر و رقص، درباری اجلاس و جلوس، بزم عیش و نوش، خانقاہوں کے رسومات، میخانوں کے حکایات اور میلوں عرسوں کے خرافات ؛ جامعہ اسلامی کے لیے افیون کا قرص بن چکے تھے اور علامہ اس نشے کو خلوت کی ترشی سے کاٹنا چاہتے تھے؛ چنانچہ شاہین کی خلوت پسندی کی مثال لے کر ملت اسلامیہ کو خلوت گری، خود شناسی اور خودی پر غور کرنے کی دعوت دی :

مجو انجمن مثل آہو و میش
بہ خلوت گرا چون نیاکان خویش

(ترجمہ: ہرنوں اور بھیڑوں کی طرح گلے کی تلاش میں مت رہو، بلکہ اپنے اسلاف کی طرح خلوت پسند ہو)

ع : بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو

خیاباتوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

فکر و تدبر ، باریک بینی اور معرفتِ الٰہی میں غور و خوض کرنا بڑی عبادت ہے- یہی وہ ریاضت تھی جس کی وجہ سے صدر اسلام میں وہ شخصیتیں نمودار ہوئیں جو نابغہ

روزگار شمار کی جانے لگیں۔ تاریخ اسلام کا دامن ایسی روشن ہستیوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن جب سے ملت اسلام نے اسلاف کے طریقہ کار یعنی غور خوض، باریک بینی اور تجسس سے کنارہ کشی کی ہے، مسلمان روز بہ روز زوال اور تاریکیوں کے شکار ہونے لگے؛ چنانچہ اسی لیے علامہ اقبالؔ نے شاہینی نگاہ، جو آسمان میں پرواز کرتے ہوئے بھی ہری گھاس پر ہرے رنگ کی ٹڈی کو دیکھ سکتا ہے؛ علامت باریک بینی بنا کر دعوت فکر دی ہے۔ چند اشعار اس ضمن میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے، غلامی نے نگاہ خفاش
افسوس! صد افسوس!! کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات
ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تیری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے لیکن
تیری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے
چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش فرنگ

علامہ اقبالؔ نے مرد کامل، مرد مجاہد، مرد مومن، مرد فقیر اور مرد قلندر کے فلسفہ میں شجاعت اور دلیری کو مرکزی حیثیت دی ہے اسی لیے تو افغانستان کے سفر پر ظاہر شاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

می شناسی معنی کرار چیست
ایں مقامی از مقامات علیؓ است

(جانتے ہو کرار کے معنی کیا ہیں؟ یہ ایک مقام حضرت علیؓ کے مقامات (فضیلت) میں سے ہے۔)

مسلم ہندی چرامیداں گذاشت
ہمت او بوی کراری نداشت

ہندوستان کا مسلمان کیوں میدان سے بھاگا؟ اس لیے کہ اس کی ہمت میں علیؓ

کی شجاعت کی بو نہ تھی۔

علامہ نے پرندوں میں شاہین کو اسی لیے انتخاب کیا کہ شاہین جسور اور دلیر ہوتا ہے۔ اگر چہ شاہین کا وزن چار پانچ پونڈ سے کم ہوتا ہے اور اس کے بدن کی لمبائی ڈیڑھ سے دو فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے' لیکن پرندہ شناسوں کے محققین کے حوالوں کی روشنی میں جوان غزال' بکروں اور بھیڑیوں کا بھی شکار کرتا ہے۔ مشہور پرندہ شناس محقق براؤن (۱۹۷۰ء) نے بیان کیا ہے کہ اس نے شاہین کو ایک سو پونڈ کے بھیڑیے کا شکار کرتے ہوئے دیکھا ہے (بروس انسائیکلو پیڈیا)۔

اس شجاعت اور دلیری کو مسلمانوں کے خون میں تازہ کرنے کے لیے علامہ نے جو اشعار نظم کیے ہیں ان میں سے چند اشعار یہاں بیان کیے جا رہے ہیں:

نوا پیرا ہو اے بلبل! کہ ہو ترے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک سے شاہیں کا جگر پیدا

جھپٹنا' پلٹنا' پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے یہ بہانہ
(نظم ''شاہین'')

بازوی شاہین گشا خون تدروان بریز
مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

(ترجمہ: شاہین اپنے بازوؤں کو کھول اور تدروان پر حملہ آور ہو' کیونکہ آشیانے میں خاموشی کی زندگی ترے لیے موت ہے)

می فتد مرگ آں مرد تمام
مثل شاہین کے افتد بر حمام

(ترجمہ: وہ مرد کامل' موت پر اس طرح لپکتا ہے' جس طرح سے ایک شاہین' کبوتر پر)

سینہ ای داری اگر در خورد تیر
در جہان شاہین بزی شاہین بمیر

(اگر شجاعت سے بھرا سینہ تیر کے قابل رکھتے ہو تو شاہین کی طرح زندگی کرو اور شاہین کی طرح مر جاؤ)

نکو شیوۂ پختہ تدبیر باش

جسور وغیور و کلان گیر باش

(نیک کام، پختہ تدبیر رہو اور دلیر و غیور اور اہمیت کے حامل رہو)

تنگ دار خود را او خورسند ذی

دلیر و درشت و تنومند ذی

(خوشی اور خود داری کے ساتھ زندگی بسر کرو: طاقتور، دلیر اور شجاع بنو! ("پند باز بہ بچہ خویش: پیام مشرق")

شاہین: چالاک اور ہوشیار پرندہ ہے، اسی لیے اس کو تربیت دے کر جانوروں کے شکار اور جنگوں میں نامہ بر کبوتروں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پرندہ شناسی کا محقق زینوفر (۱۹۶۳) لکھتا ہے کہ شکار اور جنگوں میں سب سے پہلے چار ہزار سال قبل شاہین کو استعمال کیا گیا اور پھر اس کے بعد عرب، ایران، افریقہ اور یورپ میں اس پرندے سے استفادہ کیا گیا۔ گوڈون ۱۹۳۵ء میں مارکوپولو کے حوالے سے لکھتا ہے کہ شہنشاہ تاتار و چین خان اعظم اپنے قصر چانگ نور میں ۲ سو شاہین تربیت یافتہ شکار جنگی مہمات کے طور پر رکھتا تھا۔

علامہ نے ملت اسلامیہ کو ہوشیار اور بیدار زندگی گزارنے کی تاکید کی۔ علامہ فرماتے ہیں جس طرح شاہین دوسرے پرندوں کا شہباز ہے اسی طرح مسلمان کو چاہیے کہ دوسری اقوام کے سردار کی طرح زندگی بسر کرے۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جان پدر نہیں ہے ممکن

شاہیں سے تدرو کی غلامی

برہنہ ہے تو عزم بلند پیدا کر

یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس

پر شہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس

توان گرفت زچشم ستارہ مردم را

خرد بدست تو شاہین تند چالاک است

کرگساں را رسم و آئیں دیگر است
سطوت پرواز شاہین دیگر است

شاہین تیز رفتار اور اس کی ضرب کاری ہوتی ہے۔ ماہرین پرندہ شناسی نے بتلایا ہے کہ شاہین جب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو وہ اوپر سے ایک تیر کے مانند اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ایک ضرب میں شکار کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ شاہین کے حملے کی رفتار تقریباً ۱۲۵ میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ ملت اسلامیہ کو تیز رفتاری اور آسمان خراشی کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

بچہ شاہیں سے یہ کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
وای آں شاہین کہ شاہی نکرد
مرغکی از چنگ او نامد بدرد

جس طرح شاہین کے پر سرداروں کی دستار اور بادشاہوں کے تاج کی زینت رہتے ہیں اسی طرح اقبالؒ چاہتے تھے کہ مسلمان دنیا میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور وہ اس وقت ممکن ہے جب مسلمان خرافات کو چھوڑ کر حقیقت کو اپنا مسلک بنائیں اسی لیے تو علامہ نے فرمایا:

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

کوے اور زغن کے پروں کی کسی کو ضرورت نہیں اس لیے کوئی ان کو شکار نہیں کرتا لیکن شکاریوں کی نگاہیں شاہین اور شہباز کے پروں پر جمی ہوئی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں کئی مقامات پر ملت اسلامیہ کی حمیت کو للکارتے ہوئے بتلایا کہ اسلامی علوم اسلامی اصول اور اسلامی حکمت و دانش سے فائدہ اٹھا کر دوسری اقوام ترقی کر رہی ہیں اور مسلمان ان سے کنارہ کشی کر کے روز بہ روز گرتے جا رہے ہیں۔

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ

کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار
دراج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہین
حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز
میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام
فاختہ شاہین شود از تپش زیر دام

علامہ اقبال نے خود فرمایا تھا کہ میں شاعر فردا (میں کل کا شاعر ہوں)۔ وہ اپنی تمام توانائی نئی نسل کی تعمیر اور تربیت پر صرف کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ دکھ تھا کہ نئی نسل' جو شاہینی صفات رکھتی ہے : اسے مکتب' مدرسے' خانقاہ اور گھریلو ماحول : کبوتر صفت' دراج مزاج اور کبک خرام بنا رہے ہیں' چنانچہ اس پر شدت سے احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا
شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندان مکتب سے
سبق' شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ
ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل
شاہیں گدائے دانہ عصفور ہو گیا
خشت را معمار ما کج می نہد
خوی بط با بچہ ای شاہین دہد
تو اے شاہین! در چمن کردی از آں ترسم
ہوای او بہال تو دہد پرواز کوتاہی

اے شاہین! کیونکہ تو نے چمن میں آشیانہ بنایا ہے میں ڈرتا ہوں کہ اس کی آب و ہوا تری پرواز کو کم نہ کر دے۔ علامہ اقبال نے اس طلسم بدبختی کو توڑنے اور ملت کو جگانے کے لیے شاہین صفت اشعار قلمبند کیے جن میں صرف چند یہاں پیش کیے جا رہے ہیں

از مقام خویش دور افتادہ ئی
کرگسی کم کن کہ شاہین زادہ ئی

(ترجمہ: تو اپنے مقام سے گر چکا ہے کرگس مت بن: کیونکہ تو اولاد شاہین ہے)

جوانوں کو مری آہ و سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

علامہ اقبال نے اپنے آپ کو شاہین کافوری کہا ہے۔ فرماتے ہیں

فقیران حرم کے ہاتھ اقبال آ گیا کیوں کر
میسر میر و سلطان کو نہیں شاہین کافوری

اس گفتگو سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال کا فلسفہ شاہین بھی دوسرے نظریات کی طرح مستند اور محکم ہے۔ اگرچہ اس تحریر میں علامہ کے صرف ۲۱ اشعار کو رقم کیا گیا ہے لیکن تمام ۱۰۲ اشعار سے استفادہ کیا گیا جو اس موضوع پر اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ مسلمانوں کے لیے شاہین وار زندگی علامہ اقبال کی آرزو اور تمنا تھی:

نہیں اقبال ناامید اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆......☆......☆

واقعہ نگاری کا تاجدارِ سخن...... میر انیسؔ

تو میری اردو زباں کا بولتا قرآن ہے (جوشؔ)

علمائے ادب نے واقعہ نگاری کی دو قسمیں بتلائی ہیں: پہلی قسم' جس میں شاعر ایک مورخ کی طرح کسی واقعے کو' بغیر کسی کمی یا زیادتی کے' منظوم کرتا ہے- اس کام کے لیے کچھ زبان پر عبور اور کچھ فن پر گرفت کافی ہوتی ہے اور اس میں شاعری کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی- واقعہ نگاری کی دوسری قسم' جو شاعر کا کمال تصور کی جاتی ہے' جس میں شاعر واقعات کے تمام جزئیات اور حالات اپنی طبیعت میں پیدا کرتا ہے' واقعہ کی نوعیت کو دیکھتا اور اسے فطرت کی میزان پر پرکھتا ہے' پھر اسے اس طرح ادا کرتا ہے کہ تمام واقعات واقعی معلوم ہونے لگتے ہیں اور شک کا احتمال بھی پیدا ہونے نہیں پاتا- اس قسم کی واقعہ نگاری ہر شاعر کے بس کی بات نہیں- یہاں صرف زبان وفن پر کامل قدرت کافی ہوتی ہے' بلکہ شاعر کو فطرت اور احساس کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہوتا ہے' چنانچہ اس قسم کی واقعہ نگاری جب اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو اسے مرقع نگاری کہتے ہیں- اردو ادب کی مشہور اصنافِ سخن میں غزل' قصیدہ' رباعی اور مثنوی کو واقعہ نگاری سے کوئی تعلق نہ تھا- غزل' عاشقانہ خیالات سے' قصیدہ' مدح اور تہنیت کے بیانات سے' رباعی' اخلاقی' سماجی اور مذہبی نکات سے اور مثنوی' عشقی اور مورخانہ روایات سے بھری تھیں' چنانچہ بقول مولانا عبدالسلام ندوی' یہ بالکل سچ ہے کہ اردو زبان میں واقعہ نگاری کی بنیاد صرف مرثیہ گویوں نے ڈالی اور میر انیسؔ نے واقعہ نگاری کو معراجِ کمال تک پہنچایا' جس کی مثال اردو کیا' فارسی ادب میں بھی مشکل ہی سے مل سکے گی- میر انیسؔ چونکہ عظیم شاعر ہوتے ہوئے فطرت اور معاشرتِ انسانی کے بھی بڑے رازداں تھے' اس لیے کسی واقعہ کا چھوٹے سے چھوٹا نکتہ ان کی نظر سے بچ نہیں سکتا تھا- وہ کسی واقعے کی جزئیات ایسے بیان کرتے کہ

سامعین کی نظروں کے سامنے اس کی تصویر بن جاتی اور سامع، واقعہ نگاری کے طلسم میں گم ہو جاتا- میر انیس کو واقعہ نگاری میں ہر قسم کے واقعات، معاملات، مقامات اور حالات نظم کرنے پڑے، اس لیے اگر ان کے مراثی کو بغور دیکھا جائے تو واقعہ نگاری کی کوئی صفت ایسی نہیں جو ان کے کلام میں بدرجہ اُتم نہیں پائی جاتی ہو- اس عظیم مرقع نگاری کے لیے میر انیس لفظوں کے چناؤ، زبان کے بہاؤ اور فطرت کے رچاؤ کا خاص خیال رکھتے تھے- مثلاً حضرت عباسؑ کا گھوڑا کئی دن کا پیاسا ہے- جب نہر پر پہنچا تو پانی دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے، لیکن جانتا ہے کہ حضرت عباسؑ اس کا پانی پینا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ابھی آل رسولؐ پیاسے ہیں- جانور کے اس اضطراب اور کش مکش کی حالت دیکھیے-

دو دن سے، بے زباں پہ، جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا، سنتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرتِ عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شورِ آبشار کا
گردن پھرا کہ دیکھتا تھا منہ سوار کا

شام کے تاریک زنداں میں امام حسینؑ کی بیٹی سکینہؑ قید کی سختیاں جھیل رہی ہے- جب دل گھبراتا تو دربانوں کو اپنا دکھڑا سنانا چاہتی ہے- انیس کی مرقع نگاری ملاحظہ کیجیے- دل اشعار سن کر ہل جاتا ہے:

بولا نہ جب کوئی، تو ہوا غم زیادہ تر
دیوار پکڑے پکڑے گئی، وہ قریب در
پٹ کو ہلا ہلا کہ پکاری، وہ نوحہ گر
دربانو! جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر
بیکس ہوں، تشنہ لب ہوں، فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

خاندانی عورتوں کا عموماً یہ معمول ہوتا ہے کہ اپنے چھوٹے بچے کا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ کر کہتے ہیں: یہ سلام کرتے ہیں- جب بانوؑ حضرت صغراؑ سے رخصت ہوتی ہیں تو فرماتی ہیں:

بانو نے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھ کر
لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغرؑ!

عصرِ عاشورہ امامِ مظلوم تنہا ہو گئے - تمام اصحاب انصار عزا اور فرزندان شربتِ شہادت نوش کر چکے- ایسے وقت آپ کی بیٹی صغرا کا خط لے کر نامہ بر آتا ہے جس کے دل میں امامؑ کی عظمت بلندی سطوت و شوکت ایسی تھی کہ وہ امامؑ کو کسمپرسی کے عالم میں دیکھ کر پہچان نہ سکا اور جب امام حسینؑ سے سوال کیا کہ امام حسینؑ کون ہیں تو انیس نے اس جواب کو بڑے اعجاز سے ایک شعر میں ایسا بیان کیا کہ خود ایک مکمل داستان بن کر رہ گیا- فرماتے ہیں:

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولاؑ نے سر جھکا کہ کہا میں حسینؑ ہوں

میر انیس اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ ان ہستیوں کے واقعات ہیں جو صاحبِ اعجاز ہیں جن کی نظریں زمین کی تہوں اور آسمانوں کے پردوں کو چیر سکتی ہیں- اس اعجاز بیانی کے لیے میر انیس نے بے حساب لفظی اور معنوی صنعتوں سے کام لیا مخصوص صنعت حسن تعلیل کے وہ فرمانروا تھے- زمین کربلا پر ورود ملاحظہ کیجیے:

اترا یہ کہ کے کشتی امت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر
زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے
تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال
پھولوں سے کھیلنے لگے زینبؑ کے نونہال
اچھلیں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

واقعہ نگاری کا ایک خاص کمال یہ ہے کہ ہر شخص کے مقام و منزلت اور مرتبے کو
پیش نظر رکھ کر کلام کیا جائے- چھوٹی بچی سے انداز گفتگو ملاحظہ کیجیے:

امام فرماتے ہیں:

راحت کے دن گذر گئے' یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو کہ یتیمی کا دور ہے

بچی لفظ یتیم پہلی بار سنتی ہے:

ننھے سے ہاتھ جوڑ کر بولی' وہ تشنہ کام:
بابا! بتایئے کہ یتیمی ہے کس کا نام؟

امام کہتے ہیں:

بچی! نہ پوچھ کچھ' یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ' وہ بچہ یتیم ہے

دوسرا رخ ایک دشمن کے سراپا کی نگارش ہے' جو قاسم ابن حسن کے مقابلے کے لیے آیا ہے:

لال آنکھیں وہ' ظالم کی' وہ منہ قبر کا سا کالا
شب ایک طرف' دن کو ڈرے' دیکھنے والا
قد' دیو کی قامت سے بلندی میں دوبالا
دانتوں کی کبودی' دہن مار کا چھالا
شیر اس کی صدا سن کے لرز جاتے تھے بن میں
فاسد تھی ہوا ان کی' وہ بدبو تھی دہن میں
مرحب تھا کفر و شرک میں' طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی' کہ پہاڑی پہ دیو تھا

میر انیس نے اپنے شاہکار مرثیے جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے- جو ۵۹ سال کی عمر میں لکھا اور جس میں ۱۹۶ بند ہیں- صبح کی منظر کشی' روز عاشور دکھاتے ہیں:

گذری شب فراق' دن آیا وصال کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے' زہراؑ کے لال کا

تھا چرخِ اخضر پہ یہ رنگ، آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں، گلاب کا
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں
کھا کھا کے اوس، اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
روکے ہوئے تھی نہر کو امت رسولؐ کی
سبزا ہرا تھا، خشک تھی کھیتی، بتولؑ کی
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا، تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں، موجیں فرات کی
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

حر ابن ریاحی، امام حسینؑ سے شرمندہ ہے۔ شبِ عاشور اضطراب میں گزار کر صبحِ عاشور امامؑ کی خدمت میں آیا ہے اور اجازتِ جنگ لے کر اسلام پر قربان ہوتا ہے۔ آخری وقت اس کا سر امامؑ کے زانو پر ہے۔ حر پوچھتا ہے: مولاؑ! کیا آپ مجھ سے راضی ہوئے؟ امامؑ فرماتے ہیں: میں، میرے بابا، میرے نانا اور میرا خدا: سب تجھ سے راضی ہیں۔ حر کا اضطراب سکون میں بدل جاتا ہے۔ اس منظر کو میر انیس نے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا۔ یہاں پر صرف دو بندوں کے ٹیپ کے اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

بات بھی اب تو، زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اوڑھا دیجیے مولاؑ! مجھے نیند آتی ہے
طائرِ روح نے پرواز کی، طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

روزِ عاشور کی قیامت خیز گرمی کی منظر کشی دیکھیے:

اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے، پانی فرات کا

سرخی اڑی تھی پھول سے' سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا' سائے کی چاہ سے
گر چشم سے نکل کر ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے' پائے نگاہ میں
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ' زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ' زمین پر
پانی تھا آگ' گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی' کباب تھی

شمر لعین' امام عالی مقام کے پاس آ کر کہتا ہے کہ بیعت یزید کر لیجیے تا کہ تمام مسائل حل ہو جائیں- اس جملے کو حضرت عباسؑ سن کر غیظ میں آ جاتے ہیں- اب انیس کے قلم سے سنیے تو پتا ہو گا کہ انیس کا کلام الہامی تھا- وہ وہی لکھتے تھے جو ان کو لکھایا جاتا تھا:

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول
بیعت انھیں' تو صلح ہمیں بھی نہیں قبول
غازی پکارا' او نجس و مرتد و مجہول!
لیجو نہ منہ سے نام جگر گوشہ رسولؐ
سمجھا ہے کیا' امامؑ عراق و حجاز کو
گدی سے کھینچ لوں گا' زبانِ دراز کو
تو کیا ہے اور کیا ہے ترا وہ امیر شام
کرتے ہیں بادشاہ جنھیں بیعت غلام
تو بھی نمک حرام ہے' وہ بھی نمک حرام
او بے ادب' یزید کجا' اور کجا امامؑ
دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا' نہیں آگے کنشت کے

شہنشاہوں کے نام اور ان کی تخت و تاج پوشی کی تاریخیں' جو سونے کے حروف

سے لکھی گئیں تھیں، آج تاریخ میں نظر نہیں آتیں، لیکن میر انیسؔ کی ہر چھوٹی بات بھی اس لیے دنیا کو یاد ہے کہ بڑے منہ کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ انیسیات کا طالب علم جانتا ہے کہ میر انیسؔ نے پہلی مجلس لکھنو میں ۱۸۲۷ء میں اکرام اللہ خان کے امام باڑے میں پڑھی، جس میں مرثیے کا مطلع تھا: ''جب حرم مقتلِ سرور سے وطن میں آئے'' میر انیس کی آخری مجلس مرثیہ، بقول مولانا اشعری: ۱۸۷۴ء میں شیش محل میں برپا ہوئی، جس میں میر انیسؔ نے اپنی زندگی کا آخری مرثیہ پڑھا، جس کا مطلع تھا:

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج

میر انیسؔ نے اپنی ساری زندگی مداحیِ محمدؐ و آلِ محمدؐ میں صرف کر دی اور اسی کے صدقے جاریہ سے ان کا سارا کلام زندہ جاوید ہو گیا:

مقبدی ہوں، مجھے توقیر عطا کر، یا رب!
شوقِ مداحیِ شبیرؑ عطا کر، یا رب!
جب تک کہ چمک، مہر کے پرتو سے، نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلمرو سے نہ جائے
بس، اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے، یہ چند بند
یہ فصل اور یہ بزمِ عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں، خزاں کی بہار ہے

☆......☆......☆

دیارِ محمد ﷺ

اردو اشعار کے آئینے میں

نعت کو عشق و محبت کی زبان میں حدیث دلبری بھی کہ سکتے ہیں' جو عشق حقیقی محبوب الٰہی ﷺ سے تعلق رکھتی ہے' کیوں کہ ربّ اللعالمین نے رحمت اللعالمین کے ذکر کو اپنا ہی ذکر' اور محبوب سبحانی کی محبت کو اپنی ہی محبت قرار دے کر اس مودت کو لازم قرار دیا' اسی لیے نعت گو شعرا نے جن میں اردو زبان کے شعرا قابل ذکر ہیں' شوقِ دیدار مدینہ اور سرزمین حجاز سے اپنی قلبی وابستگی کو بڑے ہی دلکش اور دل افروز انداز میں نظم کیا ہے' جو نعت کا ایک اہم موضوع ہے۔ عشق اور محبت کے تقاضوں کے تحت عاشق اپنے معشوق سے نسبت رکھنے والی ہر چیز سے محبت اور پیار کرتا ہے۔ معشوق کا گھر' اس کے در و دیوار' اس کی گلی کوچے' اس کے شہر کے دشت و بیابان و گلستان' بازار و کوہسار' آب و خاک' ہوا اور فضا' بہرحال ہر چیز' جو محبوب سے نسبت رکھتی ہے' خود محبوب بن جاتی ہے۔ اگر نعت کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نعت گویوں نے ابتدا ہی سے اس موضوعِ سخن کو بڑی آب و تاب سے پیش کیا' چنانچہ عربی نعتیں مکہ اور مدینہ کی تجلیل و تعریف اور منظر کشی کے مضامین سے بھری پڑی ہیں۔ علامہ بوصیری کا مشہور نعتیہ قصیدہ' جو بردہ شریف کے نام سے مشہور ہے' اس کا چہرا یا تمہید مدینے کے قریبی دیہات ذی سلم کے ذکر و بیان اور تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ امام حسینؓ کے فرزند امام زید العابدینؒ کی نعت کا چوتھا شعر اسی مضمون کی عکاسی کرتا ہے' جس کا منظوم ترجمہ اس طرح ہے:

ہے جگر زخمی' فراقِ مصطفیؐ کی تیغ سے
خوش بہا وہ شہر' جس میں ہیں رسولِ محتشم

فارسی نعت گویوں نے بھی دیارِ محمد کے دیدار کا شوق اور اس کی عظمت کے

بارے میں اشعار نظم کیے ہیں، جن کی تعداد زیادہ ہے، لیکن جس محبت اور اعتقاد سے اردو شعرا نے اس مضمون کو پیش کیا ہے، اس کی مثال عربی اور فارسی نعتوں میں نہیں مل سکتی۔ شہر مدینہ کی دوری کو محبوب سے دوری بنا کر مضطرب رہنا اور اس کے فراق میں حسرت بھرے اشعار کہنا اور زندگی کی سب سے بڑی خواہش، شہر مدینہ کا دیدار اور روضہ اقدس پر حاضری سمجھنا، تقریباً تمام اردو نعت گو شعرا کا محور خیال رہا ہے، چنانچہ فکر ہر کس بہ ہمت اوست کے مطابق ہر شاعر نے اس میداں میں طبع آزمائی کی ہے:

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

سرزمین بطحا و مدینہ کو عرش کے ہم پلہ یا اس سے بھی بلند تر تصور کرنا، کیوں کہ اس سرزمین پر سرورِ کونین نے زندگی بسر کی۔ اس خاک کو سرمہ چشم اور اکسیر یا خاکِ شفا تعبیر کرنا، کیوں کہ یہی خاک زیرِ قدم محمدؐ قرار پائی اور اسی خاک میں حضورؐ دفن ہیں۔ اس شہر کی آب و ہوا کو زم زم اور نسیم بہشت بتلانا، کیوں کہ یہ جسمِ مطہر سے مس ہو کر معطر ہوئے تھے۔ اسی خاک میں دفن ہونے کی تمنا، تاکہ جوار رحمت میں جگہ مل سکے وغیرہ ایسے جدید اور اچھوتے مضامین ہیں جو اردو شعرا نے نظم کیے۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ قدما کی نسبت جدید اور موجودہ شعرا میں یہ مضامین شدت سے بیان کیے جا رہے ہیں، جبکہ قدیم زمانے میں بطحا و یثرب کا سفر بہت مشکل تھا اور صرف چند خوش نصیبوں کو ہی یہ سعادت حاصل ہوتی تھی، اور آج کل زیارت مقامات مقدسہ آسان ہو گیا ہے۔ چونکہ تقریباً ہر نعت گو شاعر نے اس راستے پر راہ پیمائی کی ہے، اس لیے ہم صرف چیدہ چیدہ اشعار، جو خود مضمون کی تفسیر، تاویل اور تصویر بن سکتے ہیں، مختلف عنوانات اور بیانات کے تحت پیش کرتے ہیں، تاکہ اس گلستانِ ہزار رنگ سے کچھ رنگ کے پھولوں کو چن کر ایسا گلدستہ بنایا جائے، جس سے قاری کا ذہن معطر، اس کی نگاہ منور اور اس کا قلب نفس امارہ پر مظفر ہو جائے اور دیدار روضہ نبیؐ اس کا مقدر بن جائے۔

عشق مجازی کو عبث جانتے ہوئے قدیم ترین اردو نعت میں سید محمد فراقی بیجا پوری کہتے ہیں:

عبث خوباں کی گلیوں میں نہ کر تو عمر صرف اے دل!
مدینے کی زیارت کو گیا ہوتا تو کیا ہوتا

۲۵۰ سال قبل کرامت علی شہیدیؔ نے کہا تھا:

تمنا ہے' درختوں پر تیرے روضے پر جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے' طائرِ روحِ مقید کا

برصغیر کے شعرا کے لیے دیدارِ مدینہ آسان چیز نہ تھی اور نہ اب ہے۔ سفر کی صعوبتیں' مالی' قانونی' سماجی' بدنی مسائل کے ساتھ ساتھ ایک خاص عقیدتی نکتہ: حضورؐ کی طرف سے زائر کا بلوایا جانا ہے۔ اس لیے نعت گو شعرا اس قلبی واردات کو طرح طرح سے الفاظوں کی شکل میں پیش کرتے ہیں:

تمنا ہے' کروں میں صاف گلیاں' اپنی پلکوں سے
شہِ یثرب اگر پہنچائے قسمت' تیرے مسکن تک
(احقر)

رسائی ہو کہیں' یا رب شہِ یثرب کے مدفن تک
کہ گلخن سا' جدائی سے' ہوا جاتا ہے گلشن تک
(عنایت اللہ ایاغؔ)

ہمیں بھی شہرِ وفا دیکھنے کا اذن ملے
بہت دنوں سے' ادھر بے قرار ہم بھی ہیں
(سجاد مرزا)

صرف ایک لمحہ روضہ اقدس کو چوم لوں
صرف ایک لمحے کی' مرے مولا! خدائی دے
(طفیل ہوشیار پوری)

ہم سوچ رہے ہیں' کبھی طیبہ کو چلیں گے
اس نگری کو بھولے سے نہ یاد کریں گے
(ستار نیازی)

مرا جا کر سینہ لگے جالیوں سے
یہ' فرقت کے غم کی دوا' مانگتا ہوں
(محمد عیسیٰ ظہوریؔ)

مدینہ کو چلو' دربار دیکھو

رسول اللہ کی سرکار دیکھو
(مہاراجہ کشن پرشاد)

اگر مل جائے رہنے کو زمیں یثرب و بطحا میں
بناؤں سجدہ گاہ اپنی میں سنگِ درِ محمدؐ کا
(پیارے لال رونق)

مجھ کو اک بار مدینہ میں بلا لو آقا!
لوٹ آنے کی دعا میں نہیں کرنے والا
(شوکت ہاشمی)

قافلے چل دیے طیبہ کو میں روتا ہی رہا
اور کچھ نہ سہی میں گردِ سفر دیکھ تو لوں
(علیم)

دیکھ کر گنبدِ خضرا کو سکوں آئے گا
دل میں طوفان ہیں اس کے نہ جانے کیا کیا
(محمد آسی)

حضورؐ آئے بلاوا کوئی مدینہ سے
نکل رہی ہے مری جان اک صدا کے لیے
(جعفر شیرازی)

اگر ہو جانا مدینہ بہترؔ کبھی نہ آؤں وہاں سے پھر کر
جیوں وہیں اور مروں وہیں پر مجھے وہ قسمت ملے الٰہی
(خیر النسا بہتر)

سر بہ سجدہ رہتے ہیں فرشتے ہر دم
میں بھی سرکارؐ دو عالم کا وہ روضہ دیکھوں
(انجنا سیدھر)

برہنہ پا مجھے جوشِ جنوں طیبہ کو لے جائے
مزے کی سیر ہو گی راہ کے کانٹے مزا دیں گے
(خلیل)

مدینہ جانے والوں کو میں دیکھوں اور بس ترسوں
وسیم ایسا نہ ہو جینا مرا بے کار ہو جائے
(وسیم)

پھو لوٹ کے آنا ذرا اے موت! ٹھہر جا!
باقی ہے ابھی حسرت دیدار مدینہ
(سلام سندیلوی)

موت ہی نہ آ جائے کاش! ایسے جینے سے
عاشق نبیؐ ہو کر دور ہوں مدینے سے
(شکیل بدایونی)

آئے نظر جو مجھ کو مدینہ کے بام و در
سجدے تڑپ کے آئے جبیں سے نگاہ میں
(صبغت اللہ صدیقی)

اشکبار آنکھیں ہیں آقا کی زیارت کے لیے
دل ترستا ہے خدایا! اس سعادت کے لیے
(عبداللہ اشہر)

تسکیں کا ساماں مرے جینے کے لیے ہے
اب میری نظر صرف مدینہ کے لیے ہے
(اظہر بھٹی)

مانا تیری جنت تو بہت خوب ہے رضواں
حسرت ہے میں دیکھوں در سرکار مدینہ
(محمد ساغر)

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر واضح اور جلی طور پر پیغمبرؐ اکرم کی مدح اور ثنا کی گئی ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیؐ کریم پر سلام و درود بھیج رہے ہیں تو کہیں پر آپؐ کے خلق کو عظیم کہا جا رہا ہے اور کبھی آپ کے ذکر جمیل کو بلند رکھنے کا وعدہ اور آپ کے اسوہ حسنہ کو پوری انسانیت کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا جا رہا ہے یعنی خود خدائے بزرگ ثنا خوان محمدؐ ہے تو بندہ کس طرح اس محبوبؐ سبحانی کی مدح و ثنا کا حق ادا

کر سکے گا' اسی لیے تو مرزا غالبؔ نے فرمایا:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

اسی لیے تو کسی شاعر نے کہا:

ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا
تصور میں ترے رہنا' عبادت اس کو کہتے ہیں

مدینہ منورہ کی یاد دلوں کو تازگی اور نگاہوں کو روشنائی عطا کرتی ہے' اور یہی محبوبؐ کے دیار کی یاد' قلب کو تسکین عطا کرتی ہے:

یاد جب مجھ کو مدینہ کی فضا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

عزت بخاری نے کہا تھا:

ادب گاہی است زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

جب نور محمدیؐ بطحا و یثرب کی خاک پر جلوہ فگن ہوا اور اس دشت و بیابان کی فضا مشام محمدیؐ سے عطر آگیں ہوئی' تو روز قیامت تک یہ فرش کا خطہ رشکِ عرش بن گیا- بطحا' مکہ معظمہ اور یثرب' مدینہ منورہ میں تبدیل ہو گیا' چنانچہ اسی دشت و بیابان کی خاک' سرمہ چشم' اکسیر اور خاکِ شفا ہو گئی- علامہ اقبالؔ نے سچ فرمایا ہے:

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہری کہ آں جا دلبر است

پھر اقبالؔ اسی خاک کے بارے میں فرماتے ہیں:

موت آ جائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے: قم' مجھ کو
اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں دیار حجاز میں
(اقبالؔ)

خاکِ مدینہ کو آنکھوں کا سرمہ کہنا عربی اور فارسی شعرا کی تقلید ہے- اس مضمون

کو بھی قدیم، متوسطین اور جدید شعرا نے بڑے نزاکت سے باندھا ہے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے مری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
(اقبال)

غبارِ راہِ طیبہ، سرمہ چشمِ بصیرت ہے
یہی وہ خاک ہے، جس خاک کو خاکِ شفا کہیے
(ماہر القادری)

یہ خاک آستاں کو تیری، اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ، میں تصور سے، دم بدم
(شاہ ظفر)

وہ خاک، کہ اکسیر جسے کہتی ہے دنیا ہے
خاکِ کفِ پائے گدایانِ مدینہ
(خدا بخش اظہر)

اسی خاک عظمت پر ساحر کہتے ہیں:

سمجھوں گا، موت آئے جو طیبہ کی خاک پر
اک زندگی ملی ہے، دیارِ غریب میں
(ساحر)

جنت بھی بڑی چیز ہے، کوثر بھی بڑی چیز
لیکن مجھے ہلنا نہیں طیبہ کی زمیں سے
(سرور اکبر آبادی)

صد شکر کہ اپنی آنکھوں سے ہم نے بھی مدینہ دیکھ لیا
جو عرشِ بریں سے ملتا ہے، رحمت کا وہ زینہ دیکھ لیا
(سکندر لکھنوی)

سوئے گلشن کون دیکھے، دشتِ طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنت کون جائے، در تمہارا چھوڑ کر

(رضا بریلوی)

مدینہ کی گلیوں سے ہرگز نہ لوٹیں
زمانہ نے یوں تو پکارا بہت ہے
(تابش دہلوی)

اسی مدینہ کی خاک کو اپنا ابدی بچھونا بنانے کی آرزو تقریباً ہر مومن کے دل میں رہتی ہے۔

پرواز مرغ روح کرے، میری یا خدا!
جا کر نبی کے روضہ اطہر کے سامنے
(لالہ تارا چند لاہوری)

شب و روز میں یہ دعا مانگتا ہوں
مدینے میں اپنی قضا مانگتا ہوں
(محمد علی ظہوری)

جان کی طرح، یہی دل میں تمنا ہے ریاضؔ
مروں کعبہ میں تو منہ سوئے مدینہ ہو جائے
(ریاضؔ خیر آبادی)

بس، خاک کف پائے محمدؐ کی طلب ہے
اقبالؔ کا مقصود دوائیں نہ دعائیں
(اقبالؔ عظیم)

ہو آستانہ آپ کا امدادؔ کی جبیں
اور اس سے زیادہ کچھ نہیں درکار، یا رسولؐ!
(امداد مہاجر)

تمنا ہے کہ فوراً جاں بحق تسلیم ہو جاؤں
نظر جو آئے مجھ کو شیفتہؔ، روضہ محمدؐ کا
(مصطفیٰ خاں شیفتہؔ)

عاشق محمدؐ کسی مقام کا بھی ہو، وہ صدق دل سے مدینہ ہی کو اپنا اصلی وطن جانتا ہے اور مدینہ کے مقابل اپنے زادگاہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اگرچہ وطن سے محبت فطری

چیز ہے' لیکن عاشق کے لیے معشوق کے وطن کا احترام اور اس کی گلیاں کچھ اور ہی مقام رکھتی ہیں۔ علامہ اقبال نے حضور اکرم ﷺ کی حدیث کو نظم کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''ایں ہمہ روی زمیں مسجد من'' (یعنی یہ ساری زمیں میری مسجد ہے) لیکن پھر بھی عاشق کی گلی کی بات کچھ اور ہے' جیسے عاشق اور معشوق کے درمیاں عشق کے رشتے ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے:

میں وہ ہوں جسے ایک مدینہ کے علاوہ
ہر گوشہ دنیا میں غریب الوطنی ہے
(صہبا اختر)

جمالِ طیبہ و بطحا' دل و دماغ میں ہے
یہ روشنی ابھی قائم' مرے چراغ میں ہے
(تابؔ)

اے خاک مدینہ' تیری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے تو جنت' سلطان مدینہ
(جگر مراد آبادی)

نیاز اس کا' جبین اس کی' افتخار اس کا
وہ خوش نصیب' جسے تیرا آستانہ ملا
(حفیظ ہوشیار پوری)

آئی نسیم کوے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کھینچنے لگا دل سوے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(بیدم وارثی)

آپؐ کے در پہ جو پہنچا' وہ خدا تک پہنچا
کوئی' طیبہ سے ہے فردوس کا رستہ سیدھا
(عبدالرحمٰن عبد)

یوں دور ہوں تابؔ' میں حریم نبویؐ سے
صحرا میں ہو جس طرح کوئی شاخ بریدہ
(تابؔ)

سر میں، آنکھوں میں ٹھنڈک ہے، دل میں کیف
جب سے ہوا دیارِ نبیؐ کی ہوا سے عشق
دیوانہ رسولؐ و علیؑ و حسینؑ کو
طیبہ کی دھن، نجف کی لگن، کربلا سے عشق
(سلیم فرید)

زمیں جس کے قدم چومتی ہے چاہت سے
نثار ہوتے ہیں افلاک، جس پہ الفت سے
(مامون ایمن)

ہر ذرہ ان کے شہر کا مسجد ہے، اے قمر!
کوئی مجھے بتائے کہ سجدہ کہاں کروں
(سید قمر زیدی)

جن کی آنکھوں میں سما جائے سوادِ طیبہ
کم بہا ان کے لیے خلد بریں ہو جائے
(طاہر شادانی)

صاحب خانہ سے ہوتا ہے مکاں کا احترام
وہی جنت ہے، جہاں میں ہوں، جہاں تیرا قیام
آب ہر چشمہ کرے کوثر و تسنیم کا کام
نخل بنا مدینہ ز تو سر سبز و مدام
(مومن)

تیرے غلام کو جنت میں چین کیسے ملے
کہاں بہشت کہاں جلوہ ہائے کوئے رسولؐ
(احمد قادری)

شاعر رہے سرمستیِ صہبائے مدینہ
پی پی کے مری طبعِ رسا جھوم رہی ہے
(شاعر لکھنوی)

ہر گام پہ ملتے ہیں وہاں ساغرِ رحمت

ہے ذکر مدینے میں کہاں تشنہ لبی کا
(غلام زبیر نازش)

ہم کہاں جائیں بھلا شہر مدینہ چھوڑ کر
مچھلیاں دیکھا ہے مر جاتی ہیں دریا چھوڑ کر
(شہاب کاظمی)

بہتر ہے از طور سینا شہر مدینہ
دنیا خاتم اور نگینہ شہر مدینہ
(غلام مصطفیٰ قمر)

قربان میں جاؤں گا طیبہ کی فضاؤں کے
آئے گا مزہ ہم کو جب نعت سنائیں گے
(عاشق حسین ملک)

فضائے دشت وورِ صلی علی کی دھوم ہے ہمدم!
سراپا خلد کی آب و ہوا معلوم ہوتی ہے
(نور محمد ہمدم)

حضورؐ کا روضہ مقدس، گنبد خضرا، صحن حرم، مسجد، ضریح مبارک کی جالی، آستانہ، سنگ در وغیرہ الفاظ بڑے والہانہ عقیدت سے اشعار میں اس طرح ترتیب دیے گئے ہیں کہ وہ تسبیح ثنا و معرفتِ حضورؐ اکرم کا عکس بن جاتے ہیں:

حاجیو! آؤ! شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبہ کا کعبہ دیکھو
(منصور آفاق)

روضہ سرکار کا دیکھے ساقی
اور کچھ دل میں تمنا ہی نہیں
(ساقی)

فرشتے کیوں نہ چومیں گنبد خضرا کی چوکھٹ کو
جبین نور کا سجدہ ہے نوری آستانے پر

(صابری)

فردوس بڑی چیز ہے' یہ بات بجا ہے
دل گنبد محبوب کے سبزے پہ فدا ہے

(محمد آسی)

کھلا دل کا گلستان' گنبد خضرا کے سائے میں
نظر بھی ہے فروزاں گنبد خضرا کے سائے میں

(خالد بزمی)

نگاہیں روضہ شہ سے نہیں آئیں' میں آیا ہوں
الجھ کر جالیوں سے رہ گیا' تار نظر میرا

(آزاد)

جو ہے روضہ پیغمبر کا' وہ ہے خلد سے بھی بڑھ کر
وہی ایک ایسی جا ہے جہاں خلد بھی فدا ہے

(عبداللطیف)

مرے حبیب کے روضے کی چوم کر جالی
گزر کے آئی ہے ٹھنڈی ہوا' مدینے سے

جبین شوق جھکی جا رہی ہے
نبی کا سنگ در ہے اور میں ہوں

(ناظم بزمی)

اس گفتگو کے آخر میں ہم شاعر کی قلبی واردات' جو آرزو' تمنا' دعا کے ساتھ ساتھ نیاز اور ناز سے لبریز ہوتی ہے' پیش کر رہے ہیں' کیونکہ بہرحال عاشق معشوق پر اپنے احساسات کو بیکیے کیا ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح اپنی حد اور حدود کو سمجھتا بھی ہے۔''با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار۔''

نبیؐ کی یاد سے روشن' میرے دل کا نگینہ ہے
وہ میرے دل میں رہتے ہیں' مرا دل ہی مدینہ ہے

(ستار نیازی)

کبھی یہاں سے مدینہ کبھی وہاں سے یہاں
میرا خیال مسلسل سفر میں رہتا ہے
(راجا رشید محمود)

کاسۂ جسم کو انوار سے اپنے بھر دے
میں کہ ہوں شہرِ مدینہ کے گدا کی صورت
(انور سدید)

آنکھوں کے لیے اور چمک مانگ رہا ہے
دل گنبدِ خضرا کی جھلک مانگ رہا ہے
(اختر شمار)

مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینے پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے
(حفیظ اظہر)

☆……☆……☆

انیس کے سلام ...... اعلیٰ تغزلانہ کلام

تاریخ اردو ادب شاہد ہے کہ مرثیہ گوئی کی طرح سلام نگاری کی ابتدا بھی دکن سے ہی ہوئی' چنانچہ یہ روایت تقریباً چار پانچ سو سال سے جاری ہے۔ صنفِ سلام' عربی اور فارسی میں موجود نہیں ہے۔ فارسی ادب میں کچھ اشعار جو اس موضوع پر ملتے ہیں' وہ ترکیب بند اور ترجیع بند میں کہے گئے ہیں۔ سلام کا تصور قرآن مجید میں سورہ الاحزاب کی آیت سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ اردو ادب نے سلام بر خواں کی روایت کو ایسا اپنایا کہ اردو شاعری میں سلاموں کا ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہو گیا ہے' لیکن وہ بھی دوسری رثائی اور مذہبی اصناف کے ساتھ ساتھ طاقِ نسیاں کی زینت بنا رہا اور اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ میر تقی میر' سودا اور ضاحک کے دور تک سلام کی ہیت بشکل غزل تقریباً مسلم ہو چکی تھی۔ سلام کی ابتدا سے انیسویں صدی کے اواخر تک مطلع میں لفظ سلام' سلامی' مجرئی اور سلام علیک جیسے الفاظ کو لازم قرار دیا جاتا تھا' لیکن اس رسم کو بیسویں صدی کے شعرا نے ترک کر دیا۔ سلام گوئی کا تیسرا یا سنہرا دور' جو میر انیس اور مرزا دبیر کا عہد شاعری ہے' مرثیہ کی طرح سلام بھی اپنے عروج کمال پر پہنچا۔ سلاموں میں تغزل کا رنگ' منقبت کی چھاپ' مصائب کی شدت کے علاوہ عقیدت' محبت اور تصوف کی بلند کاریاں نظر آنے لگیں۔ میر انیس کے مرثیوں کی طرح ان کے سلاموں کی تعداد بھی آج تک صحیح طور پر ہمیں معلوم نہ ہو سکی۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں' میر انیس مرحوم نے کم از کم دس ہزار مرثیہ کہا ہو گا اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے' رباعیاں تو باتیں تھیں۔ شاد عظیم آبادی' میر انیس کی خصوصیاتِ شعری کے ذیل میں فرماتے ہیں: میر انیس نے ایک ہزار سے زیادہ مرثیے نظم کیے اور اسی قدر یا اس سے کچھ کم سلام اور رباعیات لکھیں۔ میر انیس کے سلام ان کے مرثیوں کی مختلف جلدوں' مطبوعہ نولکشور' نظامی پریس بدایوں' غلام علی لاہور' دبدبہ احمدی لکھنؤ' بک لینڈ کراچی اور ''روح انیس'' مرتبہ پروفیسر مسعود حسن ادیب

میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر علی جواد زیدی کی مرتب کردہ کتاب ''انیسؔ کے سلام'' میں سب سے زیادہ سلام ہیں، جن کی تعداد ۱۰۶ ہے۔ میر انیسؔ نے جس شاعری کے ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں اگرچہ میر ضمیرؔ، میر خلیقؔ، مرزا فصیحؔ اور میاں دلگیرؔ مرثیے میں تازہ روح پھونک رہے تھے، لیکن ساری حکومت غزل ہی کی تھی اور غزل کا ہی سکہ چل رہا تھا۔ لکھنو میں مصحفیؔ، آتشؔ اور ناسخؔ کی دھوم تھی، دہلی میں شاہ نصیرؔ، مومنؔ، غالبؔ کی شناخت غزل ہی سے ہو رہی تھی، چنانچہ گھر کی فضا رثائی ہونے کے باوجود میر انیسؔ نے پہلے غزل ہی کی طرف رخ کیا اور چند ہی دنوں میں غزل کی بدولت معروف ہونے لگے۔ شفیق باپ میر خلیقؔ نے بیٹے کو یہ کہ کر کہ غزل کو سلام کہو، سلام اور سلامتی کی طرف ایسا موڑا کہ آج ان کے کلام کو سن کر ان پر درود اور سلام جاری ہو جاتا ہے۔ میر انیسؔ کی غزلوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ میر صاحب نے خود ان کو تلف کر دیا، یا اس کی جمع آوری کی چنداں فکر نہ کی۔ میر صاحب کی غزلوں کی تعداد، غزلوں کا رنگ اور غزل گوئی کے متعلق کئی سوالات کا جواب موجود نہیں۔ آج ہمارے درمیان اس وقت جو میر صاحب کی تین غزلیں اور چند مفرد اشعار، جو بعض تحریروں اور بیاضوں سے حاصل ہوئے ہیں اور جیسا کہ بعض علمائے ادب نے فرمایا ہے: اگر میر انیسؔ غزل کہتے تو اس صنف میں بھی عظیم شاعر ہی قرار دیے جاتے۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے تین غزلوں اور چند مفرد اشعار، جن کی مجموعی تعداد ۲۶ ہے، ان میں سے چند پیش کیے جاتے ہیں:

شہید عشق ہوئے قیس نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح
تمام خلق ہے خوبان آبرو یا رب
چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح
کسی کا دل کیا نہ ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے
ملا جنہیں، انہیں افتادگی سے اوج ملا
انھی نے کھائی ہے ٹھوکر، جو سر اٹھا کے چلے
مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے

انیس دم کا بھروسا نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے
کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے
شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتشِ دل کہیں کم ہوتی ہے، چار آنسو سے
ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے
پر اک تو ہی نہیں، افسوس! ہے ہے!!
عاشق کو دیکھتی ہو دوپٹے کو تان کے
دیتی ہو ہم کو شربتِ دیدار چھان کے

سلام، عروضی ساخت پر غزل کی ہیئت رکھتا ہے۔ غزل کا مطلع، مقطع، ردیف اور قافیہ رکھتا ہے۔ سلام کی بحریں بھی عموماً غزل کی بحریں ہوتی ہیں۔ چونکہ انیس بچپن سے غزل کی طرف مائل تھے اور ان کی فطرتی شاعری میں غضب کا تغزل تھا، اس لیے جب انھوں نے غزل کو سلام کہا تو سلام کو بھی غزل کیا، اور عشق حقیقی کے رنگ سے رنگینی پیدا کی، جو میر انیس کے ایجادات تصور کی جاتی ہیں۔ ان کا سلام شعوری اور لاشعوری طور پر غزل سے اتنا قریب ہو گیا کہ اگر اکثر ان کے سلام کے اشعار کو جدا کیا جائے تو وہ شگفتگی بیان، پرکاری، سادگی اور سوز و گداز کی بدولت غزل کے ٹکڑے معلوم ہونے لگتے ہیں، اس لیے مولانا شبلی کو ''موازنہ'' میں یہ کہنا پڑا کہ میر انیس کے سلاموں میں غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

مولوی امداد اثر امام ''کاشف الحقائق'' جلد دوم میں لکھتے ہیں میر انیس کے بہت سے ایسے اشعار سلام میں ہیں کہ اگر غزل میں داخل کر دیے جائیں تو غزلوں کا وقار ترقی کر سکتا ہے۔ اس جگہ اثر امام غزلوں کی گرتی ہوئی سطح اور نیچی رومانی کیفیت کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ عشق مجازی، گل و بلبل، وصل و فراق سے فرضی افسانوں میں گھری ہوئی غزل کو نکالنے کے لیے حالی بھی کوشاں نظر آتے ہیں:

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

لیکن بہر حال انیسؔ نے اعلیٰ قسم کی سماجی' اخلاقی قدروں کو پہلے ہی اپنے سلاموں میں داخل کر کے سلام کو آفاقی غزل بنا دیا' جس میں تمام مذہبی' سماجی' اخلاقی' انسانی اور ادبی قدریں موجزن ہیں۔ سلاموں کے چند منتخب اشعار اس ادعا کی وضاحت کے لیے کافی ہیں:

یہ جھریاں نہیں' ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے' جامۂ اصلی کی آستینوں کو

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر
آج نخوت سے زمیں پہ جو قدم رکھتے نہیں

کسی کی اک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

مثلِ بوئے گل' سفر ہو گا میرا
وہ نہیں میں جو کسی پہ بار ہوں

غمِ زلفِ شبیرؑ کیا دل سے نکلے
وہ لیلیٰ نہیں جو یہ محمل سے نکلے

شبیہِ امامِ زماں کھنچتے ہیں
تصور میں تصویرِ جاں کھنچتے ہیں

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

انساں کو چاہیے کہ خیالِ قضا رہے
ہم کیا رہیں گے جب نہ رسولؐ خدا رہے

عالمِ پیری میں آئے کون پاس
اے عصا! گرتی ہوئی دیوار ہوں

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں' یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

خود نویدِ زندگی لائی' قضا میرے لیے
شمعِ کشتہ ہوں' فنا میں ہے بقا میرے لیے

کوئی انیسؔ کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس، بغیر از خدا نہیں رکھتے

بحرِ جہاں میں قطروں نے بھی سر اٹھائے ہیں
دیکھو تو ان حبابوں میں کب تک ہوا رہے

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

ہر اک کے ساتھ ہے، روشن دلو! طلوع و غروب
سحر کو چاند نہ تھا، شب کو آفتاب نہ تھا

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں، آخر
جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ تھا

اگرچہ سلام اردو شاعری میں ابتدا سے موجود تھے، لیکن پھیکے تھے اور بقول خود میر انیسؔ پھیکے کھانے میں نمک ملا دیا:

اللہ کیا نمک ہے کلامِ انیسؔ میں
دشمن بھی گر پڑے تو زباں پہ مزار ہے

اس گفتگو کے آخر میں ہم انیسؔ کے ایک آفاقی مشہور و معروف سلام کی داستان، جو لکھنؤ کی فضا میں زبان زدِ عام ہوئی، بیان کرتے ہیں۔ میر انیسؔ نے دشوار قافیے میں ایک شاہکار سلام لکھا، جس کا مطلع اور دو شعر ملاحظہ کیجیے:

سدا فکرِ ترقی، بلند بینوں کو
ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ، ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس زمین میں مرزا دبیرؔ اور یہاں تک کہ تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ نے بھی لکھا:

جہادِ نفس عبادت میں مجھ کو ہے منظور
وضو کے وقت پلٹتا ہوں آستینوں کو

مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج نے بھی سلام کہا، جس کے دو شعر یہ ہیں:

الٹ گیا درِ خیبر سے پہلے قلعہ چرخ
خدا کے ہاتھ نے الٹا جو آستینوں کو
یہ دست بردِ خزاں کا بہار میں ڈر ہے
کہ غنچے تھامے ہیں مٹھی میں آستینوں کو

انیس کے چھوٹے بھائی مونس نے طنزیہ کہا:

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
نیا مزا ہے کہ مضموں تو دستیاب نہیں
مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

میر مونس کے اشعار سے دبیر کے شاگردوں میں شور مچ گیا اور دبیر کے مشہور شاگرد مشیر نے کہا:

جلی کٹی مرے استاد سے کرے کوئی
تو پھونک دوں مع خرمن میں خوشہ چینوں کو
ہزار بار سراہا کہ منہ پہ چڑھتے ہیں
مشیر! کیا کہوں ان احمق الذینوں کو
اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر
نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

بہرحال ادھر میر انیس، مونس پر اور ادھر مرزا دبیر، مشیر پر خفا ہوئے اور معافی اور معذرت کے لیے وادار کیا۔ میر انیس نے اس قصے کو یہ کہہ کر تمام کر دیا:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس! ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

☆......☆......☆

مرزا غالبؔ کا سلام اور مرثیہ

نجم الدولہ' دبیر الملک' نظام جنگ اسد اللہ خان غالبؔ کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ ندرت خیال کے مرکز' رنگینی بیان کے محور اور غزل کے غالبؔ کے لیے مولانا ابو الکلام آزادؔ نے سچ ہی کہا تھا کہ میر انیسؔ کے مراثی اور غالبؔ کی غزلیات' اردو ادب کی جانب سے دنیائے ادب کو تحفہ تصور کی جائیں۔ جس طرح مرثیہ گوئی کے آفتاب میر انیسؔ کی ہمارے پاس صرف تین غزلیں موجود ہیں' اسی طرح غزل کے شہنشاہ غالبؔ کا صرف ایک تین بند کا مرثیہ اور ایک سلام ہمارے اردو رثائی ادب کا جزو ہے' جس سے بہت سے لوگ بے خبر ہیں' اگرچہ غالبؔ کے فارسی اور اردو دیوان میں متفرق اشعار' اہل بیت اکرام اور اماموں کی شان میں موجود ہیں اور ان کے فارسی اور اردو دواوین میں شامل ہیں' جو ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔

مولانا حالیؔ نے ''یادگار غالبؔ'' میں لکھا ہے کہ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اردو میں جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں' چونکہ مرزا ان کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ان کے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے' ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حدِ کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے' اور یہ کہ کر رک گئے کہ یہ مرزا دبیر کا میدان ہے' ہم سے تو اس میں چلا نہ گیا' بس تین بند ہی کہ سکے۔

مرزا غالبؔ کا یہ واحد اردو مرثیہ' جو مسدس ہیئت میں لکھا گیا ہے' صرف تین بند' یعنی ۹ اشعار پر مشتمل ہے' جو شوکتِ الفاظ' ندرتِ خیال اور آہنگ غم و اندوہ کے ترجمان ہیں' ملاحظہ کیجیے:

مرثیہ

ہاں! اے نفس بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو

اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اس گھر کو بجز آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکتے ہیں اپنے، محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خیمہ نہ پایہ جو مدت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا
کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے جہاں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہو گا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اسے، کہ اگر بادشا کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ، نہ سلطان، یہ کیا ستایش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو

فروغِ جوہرِ ایمان، حسین ابنِ علی
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو

کفیلِ بخششِ امت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے، کشتۂ تیغِ قضا کہیں اس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس، ملک سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسین بلند
بقدرِ فہم ہے، گر، کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک، ہر ایک ذرۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی، یا رب! کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں، اس کے حسنِ صبر کی داد
مگر نبی، و علی، مرحبا کہیں اس کو

زمامِ ناقہ، کفِ اس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حسین، علی پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا، رہنما کہیں اس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علی سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ مانیے گر ہم برا کہیں اس کو
علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو
بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

مشہور فارسی محاورہ ہے کہ دل بہ دل راہ دارد۔ انیسؔ اور غالبؔ کے درمیان اگرچہ تحریری اور تقریری یادداشتیں نظر نہیں آتیں، لیکن یہ بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو عظیم شخصیتیں ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوں۔ محققین نے بتلایا ہے کہ انیسؔ اور غالبؔ بخوبی ایک دوسرے کے کلام سے واقف تھے اور دونوں اپنے اپنے میدان کے شہسوار تھے، چنانچہ اسی لیے جب مرزا غالبؔ کے انتقال کی اطلاع میر انیسؔ کو پہنچی، تو آپ نے اپنے جذبات کی عکاسی ان اشعار میں کی:

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداحِ علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے

یہ اشعار غالبؔ کے عقائد کو سمجھنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے چار عظیم شعرا: میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ عشقِ محمدؐ، عشقِ علیؑ اور عشقِ اہلبیتؑ اکرام میں سرمست تھے، اور یہی احساسات اور جذبات ان کے اشعار کی مینا سے مے تند کی طرح ابل رہے تھے، اسی لیے تو مرزا غالبؔ نے نوجوانی کے عالم میں کسی غزل میں فرمایا تھا:

غالبؔ! ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوترابؑ میں

کسی اور موقع پر کہتے ہیں:

قمِ شیشہ سے سینۂ ہو یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

اس گفتگو کے اختتام پر چند غالب کے اشعار جو عشق از خرمن ہیں پیش کیے جا رہے ہیں:

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جاں
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

کسی کتاب کی تاریخ میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
بامید سعادت افزائی

غرض اس سے ہیں چہار دہ معصوم
جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ
جن سے ایماں کو ہے توانائی
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولائی

خدا کرے کہ ہر سال تمام مسلمین جہان کے لیے اچھا رہے۔

☆......☆......☆

عرفان عبد ''صنم کدہ'' میں

یقیناً یہ لمحات میرے لیے غرور آفرین اور خوشحالی کا باعث ہیں کہ اپنے دوست گرامی جناب ڈاکٹر عبدالرحمن عبد کی دوسری تخلیق ''سخن کدہ ہے جہاں'' ہمارے درمیان رونما ہے۔ مجھے اس شعری مجموعے پر اپنے تاثرات بیان کرنے کا حکم دیا گیا' جس پر بہر حال ماہرین فن و ادب کے خیالات اور بیانات پہلے سے ہی موجود ہیں۔ رسم رونمائی اردو شاعری کی جدید ترین روایات میں شامل ہے اور کوئی تیس چالیس سال کے مختصر سے عرصے میں اس رسم رونمائی نے شعرا کی جلوہ نمائی' حوصلہ افزائی' کلام کی تشہیر کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے شعرا' جس کی مکمل تصویر خود ڈاکٹر عبد ہیں' کو مختلف لوگوں کے مذاق سخن سے متعارف کروایا' تاکہ شعرا کو اپنے تخلیقی رجحان اور طرز بیان کے بارے میں لوگوں کی آرا معلوم ہو سکے۔ ہماری اس محفل میں اردو شعر و ادب کی معروف شخصیتیں' جن میں جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور جناب سید ضمیر جعفری شامل ہیں' باعث مسرت و افتخار ہے' چنانچہ میری گفتگو بھی بیشتر مستند ہو گی' چونکہ بقول حالیؔ ''یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا است'' کے مصداق ہے۔ ڈاکٹر عبد کی ان دونوں تخلیقوں سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنی گفتگو کا عنوان: ''عرفان عبد صنم کدہ میں'' رکھا ہے' چونکہ اس نئی کتاب کی اسم گزاری علامہ اقبالؔ کے مصرع پر کی گئی ہے اور ڈاکٹر عبد کا فکری رجحان بھی علامہ اقبال کے نظریات سے متاثر نظر آتا ہے' اسی لیے میری گفتگو کا عنوان ''عرفان عبد ''صنم کدہ'' میں'' مناسب ہی ہو گا۔علامہ نے سچ کہا کہ:

کافری بیدار دل پیش صنم
بہ ز دینداری کہ خفتہ در حرم

یعنی: ایک بیدار دل کافر' جو صنم کدے میں ہو' وہ مردہ دل مسلمان سے بہتر ہے'

اگرچہ وہ کعبہ ہی میں کیوں نہ ہو۔

بیداری دل' عرفان کا دوسرا نام ہے' اور یہ شعرا آج کل مسلمانوں کی سماجی و سیاسی کیفیت پر کامل طور سے منطبق ہوتا ہے۔

عرفان عبد سے ''صنم کدہ ہے جہاں'' کا فاصلہ ڈاکٹر عبد نے لگ بھگ دس برس میں طے کیا' لیکن کیوں کہ میرے لیے اس دریا کے پانی کو پوری طرح سینچنا ممکن نہ تھا اس لیے میں نے تھوڑا سا یہ خوشگوار پانی اپنے احباب کے لیے کوزے میں جمع کیا' تاکہ کسی حد تک پیاس بجھ سکے' چنانچہ بہت کم وقت میں کہیں میں سحاب بن کر گزر جاؤں گا یا کہیں شہاب بن کر بکھر جاؤں گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری کا پیمانہ مقدار نہیں معیار ہے اور معیار خود کو منوا کر رہتا ہے' اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آج غالب اور حافظ کے مختصر دیوان' دوسرے شعرا کے ضخیم کلیات میں کب کے گم ہو گئے ہوتے۔ ڈاکٹر عبد کی ۲۴۰ صفحات کی یہ مختصر کتاب' جو ۹۵ غزلیات' ۳۸ نظموں اور ایک حمد و نعت پر مشتمل ہے' خیالات کی فراوانی کی دلچسپ اور دلکش مثال ہے' جس کے مطالعے سے قاری کو روح کی تازگی اور فکر و خیال کی فراوانی نصیب ہوتی ہے۔ میں بعض جدید' کم تجربہ' نام نہاد مبصرین اور نقادین کے طرز عمل' جس میں صرف تنقید کے خار سے پھول کی پنکھڑیوں کو تار تار کر دیا جائے یا صرف عیوب اور نقائص کے مجموعے کو کسی شاعر کی کل کاوشوں کا نتیجہ قلم بند کیا جائے۔ مخالف ہوں' اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شاعر کی فنی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے محاسن شعری' جس میں صنائع معنوی' صنائع لفظی' تخیل و تخیل بیان اور آمد کے نکات پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر عبد نے ''صنم کدہ ہے جہاں'' میں آورد سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور آمد کا غلبہ شدید اور مسلسل نظر آتا ہے' جو قاری کو اپنی غیبی کشش سے اپنی طرف جذب کرتا ہے۔ وقت کی کمی مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ چیدہ چیدہ اشعار میں خفی اور جلی صنعتوں کو واضح کر سکوں' لیکن موصوف کے کلام میں صنائع معنوی میں تضاد' ابہام' رجوع' لف و نشر' توجیہ' تشبیہات' استعارات' محاورات کے علاوہ صنائع لفظی میں تجنیس' اشتقاق و ترصیع وغیرہ بکثرت نظر آتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

ہر چہرہ چاند سا لگتا ہے، ہر آنکھ کنول ہو جاتی ہے
جب سوچ میں وہ آ جاتے ہیں، ہر بات غزل ہو جاتی ہے
مل جائے جہاں میں پیار جسے، کیا اس کو تمنا جنت کی
بے دل کے لیے دلبر کی گلی، جنت کا بدل ہو جاتی ہے
کسے کہتے ہیں چہرے کی تلاوت، تم نہ سمجھو گے
محبت کرنے والوں کی شریعت تم نہ سمجھو گے
استعاروں سے بات کرتے ہیں
آسمانوں پہ رات کرتے ہیں
اچھے شاعر تو ایک مصرعے میں
بند، اک کائنات، کرتے ہیں
ہم بناتے جو حور کی تصویر
آپ جیسی وہ ہو بہو ہوتی ہے

چھوٹی بحر میں بڑے مطالب بیان کرنا، دریا کو کوزے میں بھرنے کے برابر ہے، جو ہمارے اساتذہ کی سنت رہی ہے۔ موصوف کی اس کتاب میں اغلب غزلیات چھوٹی بحروں میں ہیں، جو بڑے خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہیں۔ سلیس اردو کے چھوٹے الفاظ، جو اپنے دامن میں معنی و مفہوم کے بڑے سمندر چھپائے ہوئے ہیں، جا بہ جا ایسے اچھے مقام پر رکھے گئے ہیں جیسے کوئی جوہری زیورات میں مختلف رنگ کے نگینوں کو جڑ دیتا ہے۔ کچھ چھوٹی بحر کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

بجلیاں، پوچھ کر نہیں گرتیں
حادثے کب بتا کے ہوتے ہیں
عار ملنے میں کچھ نہیں لیکن
مسئلے کچھ انا کے ہوتے ہیں
چشم بددور! گفتگو ان کی
بات کرتے ہیں، پھول جھڑتے ہیں
پیار دشمن سے کیا کرتے ہو، کیا کرتے ہو

جان کر زہر پیا کرتے ہو، کیا کرتے ہو
تم کو جس نام نے بدنام کیا ہے ہر سو
پھر وہی نام لیا کرتے ہو، کیا کرتے ہو

میرا مقصد اس مختصر سے وقت میں شاعر کے ہر شعر یا شعری گلستان کے ہر پھول کی بناوٹ، اس کے رنگوں کی ترکیب، اس کی خوشبو کی حکایتیں وغیرہ بیان کرنا نہیں، بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ گلشن عہد سے صرف چند پھول چن کر بشکل گلدستہ آپ کے سامنے تحفہ پیش کروں، تاکہ اس کو آپ اپنے مذاق خیال اور شوق جمال سے وصال کر سکیں- کچھ چیدہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ناقص سہی وجود میرا، کائنات میں
مجھ میں ہے کائنات، سمجھنے کی بات ہے

بڑھتی رہے گی حسن تصور کے ساتھ ساتھ
دنیائے ممکنات سمجھنے کی بات ہے

بچوں کا پیٹ پالنا، چیتے کا فرض تھا
پکڑا گیا غزال تو میں سوچتا رہا

ملنے کو اب کی بار، وہ آیا کچھ اس طرح
جیسے قریب سے کوئی سایا گزر گیا

تخریب کار آپ ہی تھا آدمی، مگر
الزام حادثات کا قدرت کے سر گیا

میری طرح آپ نے بھی مختلف نام نہاد ماہرین فن سے منفرد لہجہ، منفرد فکر و خیال، منفرد اسلوب کا شاعر جیسے الفاظ کا تکرار سنا ہوگا- یہ الفاظ اگر لغوی معنی میں لیے جائیں تو اس سے کوئی خاص، شاعر کی خوبی، بیان نہیں ہوتی، جیسا میں کہوں کہ آپ ایک منفرد چہرے کے حامی ہیں، اور تمام، دنیا کے افراد، ایک منفرد چہرے کے ہی حامل ہوتے ہیں، اور اگر ان الفاظ کے معنی ادب کا رجحانی انقلاب ہو تو پھر یہ اعزاز کسی بھی شاعر کے لیے مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے، کیونکہ اردو ادب میں اگر کوئی شاعر ان اقدار پر کامل اترتا ہے تو وہ یا میر تقی میر و سودا ہو سکتے ہیں، جنھوں نے اردو ادب کی شاہراہ تعمیر کی، یا مرزا غالب

ہیں' جن کی غزلیات فارسی اساتذہ کی غزلیات کی ہمکنار ہوئیں' یا میر انیس ہیں جنھوں نے بگڑے شاعر مرثیہ گو کو بڑھیا شاعر مرثیہ گو کیا' یا پھر علامہ اقبال ہیں جنھوں نے ادب کو برائے بیداری ملت استفادہ کیا اور کامیاب رہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے اذہان میں کچھ اور نام بھی ابھر رہے ہیں' لیکن علما ادب نے انھی شعرا کو بنیاد گزار' انقلابی اور عظیم الشان شعرا کا عنوان عطا کیا ہے' اور پھر ان سے دوسرے اساتذہ نے استفادہ کیا' یا بقول معروف: چراغ سے چراغ جلانے کی حکایت' یا خیال سے خیال بنانے کی روایت چلی اور شعر ادب میں ایک سے ایک اعلیٰ رتبے پر پہنچے' لیکن پھر بھی اپنے لاشعوری استاد کے دائرہ اثر سے باہر نکل نہ سکے۔ احمد ندیم قاسمی نے صحیح کہا ہے کہ:

اپنا نعرہ بھی انا الحق ہے' مگر فرق کے ساتھ
ہم وہی بات' بہ انداز دگر' کہتے ہیں
شیخ نے جس کو دیا نامہ اعمال کا نام
ہم گنہگار اسے دامن تر کہتے ہیں

ایران کی مشہور ادبی شخصیت ڈاکٹر سروش جنھوں نے اقبالیات پر بہت کام کیا ہے' کہتے ہیں کہ شعریت' سخنور اور سخن شناس' دونوں میں موجود ہوتی ہے۔ سخنور یا شاعر شعر کہہ کر اس کا اظہار کرتا ہے اور سخن شناس شعر سمجھ کر اس کا ثبوت دیتا ہے' لیکن جو چیز شاعر کو سخن شناس سے جدا کرتی ہے' وہ اس کی خداداد قوت شعر گوئی ہے:

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یعنی: جب فکر کے آسمان میں کوئی نیا خیال نظر آتا ہے' تو شاعر اور سخن شناس دونوں اس کو فوراً اپنی شعریت کی قدرت سے اپنے ذہن میں جذب کرتے ہیں' لیکن شاعر اس خیال کو اپنی خداداد استطاعت' لفظوں کا استعمال کر کے' طائر خیال بنا کر اپنے ذہن سے آزاد کرتا ہے' جو سخن شناس کے بس کی بات نہیں' اور یہی ہنر' یعنی خیال کو الفاظ کی مدد سے طائر خیال بنا کر ذہن سے آزاد کرنے کا نام' شاعری ہے۔

''عرفان عبد'' کے بعد ''صنم کدہ ہے جہاں'' کے مشاہدات سے ہمیں یہ مکمل انکشاف ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر عبد اس میدان کے کامیاب شہسوار اور واقعاً ایک کامیاب شاعر ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر عبد کے خیالات کی دنیا میں یہ کتابیں صرف اوقیانوس سے ایک

قطرے کے مماثل ہیں، کیونکہ خیالات لامحدود ہوتے ہیں اور اظہار بیان محدود، جس کا انکشاف حتیٰ خدائے سخن میر تقی میرؔ نے بھی کیا ہے، پھر بھی ڈاکٹر عبد کے خیالات کے طائر جو صنم کدہ اور اس کے اطراف اور اکناف میں پرواز کر رہے ہیں، ہم کو ان کی اعلیٰ ذہنی سطح کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ خود ڈاکٹر عبد کہتے ہیں:

ڈھونڈتے ہیں منزلوں کو نت نئے انداز سے
فکر کے شاہیں کبھی تھکتے نہیں پرواز سے
اچھی کسی کی بات ہو، سارے جہاں سے کر
اپنے ہنر کی بات نہ اپنی زباں سے کر
بے شک خوشی سے دیکھ عمارات دوسری
ہر حال میں وفا مگر اپنے مکاں سے کر
میں ڈھونڈتا ہوں ستاروں پہ منزلیں اپنی
یہ اور بات کہ قدرت میرے اثر میں نہیں
وہی ہمیشہ زمانے میں سرفراز رہے
جو لوگ شہرتِ دنیا سے بے نیاز رہے
اسی کو عبدؔ مجاہد کا ہے لقب موزوں
دیارِ کفر میں رہ کر جو پاک باز رہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری پیغمبری بھی ہے اور مجاہدات بھی۔ غم جاناں ہو کہ غم دوراں، شاعر ان حالات کو اشعار میں اپنے وقت اور فکر و خیال کے خون سے آبیاری کرتا ہے۔ گلشن میں بیٹھ کر پھولوں کی تعریف کرنا یا کسی شعری ماحول میں رہ کر شعر کہنا نسبتاً مشغلہ دل پذیر اور آسان کام ہے، لیکن صرف سوچ کے ذریعے خیالی گلستان بنانا اور پھر خارجی ماحول میں داخلی اثرات کا رنگ دینا مشکل ہی نہیں بلکہ جہاد ہے اور آج کل شرقی، اور بالخصوص غربی دنیا میں رہنے والے شعرا کو مجاہد کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اسی بیان کو کس خوب انداز میں خود ڈاکٹر عبد نے یوں کہاں ہے:

خدا گواہ کہ ہو آدمی کمال کے، عبدؔ!
بتوں کے شہر میں تم کو خدا کی سوجھی ہے
وقت فرصت میسر، نہ ماحول ہی

عابدؔ کا شعر کہنا بڑی بات ہے
دبائے دب نہیں سکتا' محبت ایسا جذبہ ہے
محبت خالق و مخلوق میں اک پاک رشتہ ہے

دانستہ طور پر میں نے ڈاکٹر عابدؔ کی زندگی کے مختلف پہلو' جن میں ان کی شخصی زندگی' خانوادگی' فیملی ہسٹری' سماجی خدمات' حکمت و طبابت' ان کی گزری ہوئی اور موجودہ زندگی شامل ہے' روشنی نہیں ڈالی' کیونکہ گزری ہوئی یادوں کے تو وہ خود مالک ہیں اور بقول خود:

آئینہ ماضی کا لے کر دیکھتا ہوں غور سے
کاش ہو جائے اسی سے خوش شناسائی ذرا

موجودہ حالات سے آپ خود واقف ہیں اور آیندہ کا اللہ عالم ہے' لیکن صرف اس قدر کہ سکتا ہوں کہ وہ فوارے کے پانی کی طرح اوپر پھینکے نہیں گئے: ''فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود'' بلکہ اپنی قدرت سے اڑان کی' اس لیے نیچے نہیں آ سکتے' اور کیونکہ زمین سے ابتدائی پرواز ہی مشکل ہوتی ہے' جس میں وہ کامیاب رہے' اس لیے اب آسمانوں کی سیر ان کے لیے آسان ہونے لگی ہے اور انشاء اللہ ہم شاہد رہیں گے کہ ان کا مقام شاعری ہر روز افزوں اور ترقی پذیر ہوگا اور یقیناً اس ترقی میں ان کی شریک حیات ڈاکٹر رضیہ ارحمٰن کا بڑا دخل ہے' جن کی ہمکاری' ہمدردی اور ہمسری کے بغیر یہ کام مشکل تھا۔ آخر میں' میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن عابدؔ کو اور ان کی اہلیہ کو تہ دل سے ان کی نئی تخلیق ''صنم کدہ ہے جہاں'' کی مبارک باد دیتے ہوئے اپنے سخن کو انھی کے شعر پر تمام کرتا ہوں:

ابھی جہاد کی باقی ہیں منزلیں کافی
قلم کی دھار کو کچھ اور تیز کرنا ہے

☆......☆......☆

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

جعفر زٹلی سے جعفر رضوی تک

یونہی مذاق میں

محترم سامعین! آج جو کچھ بھی گفتگو جناب جعفر رضوی اور ان کے مجموعہ کلام کے بارے میں ہو گی' وہ بس یونہی مذاق میں ہو گی۔ اردو ادب کا پہلا مشہور مزاحیہ شاعر جعفر زٹلی سترھویں صدی عیسوی کا ایسا بے باک شاعر تھا' جو ہمیشہ اپنے اشعار میں ظالم حکمرانوں' شہزادوں اور روساے مملکت کو اپنے طنز و مذاق کا نشانہ بناتا' چنانچہ جب ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر مغلیہ سلطنت کا حکمران ہوا اور اپنے ظلم و ستم سے قتل و غارت کا بازار گرم کر کے اپنے نام کا سکہ جاری کیا' جس پر لکھا تھا:

سکہ زد فضلِ حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

تو جعفر زٹلی نے اس کی طنزیہ پیروڈی میں لکھا: سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر بادشاہ تسمہ کش فرخ سیر۔ چونکہ جعفر زٹلی کا شعر عوام کے جذبات کا ترجمان تھا' اس لیے زبان زد عام ہو گیا اور فرخ سیر نے اسی جرم میں اس عظیم شاعر کو قتل کروا دیا۔ فنی لحاظ سے جعفر زٹلی کا شعر غلط تھا' چونکہ اس نے اردو اور فارسی الفاظ مٹر اور موٹھ کے میان واؤ عطف استعمال کیا' لیکن کیونکہ یہ شعر لوگوں کے دل کی پکار تھا' اس لیے اس خامی کے باوجود یہ شعر سینہ بہ سینہ تاریخ کے بدن میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچا اور آج اسی توانائی سے زندہ ہے۔ سنتے ہیں کہ جعفر رضوی کا شجرہ نسب ٹیپو سلطان شہید سے ملتا ہے اور آپ کا شجرہ کسب شاعری شہید جعفر زٹلی سے۔ ان دونوں شہیدوں کا کچھ خون لگا کر جعفر رضوی نے اپنی شاعری کی شہادت یونہی مذاق میں کی ہے۔ جعفر رضوی نے ٹیپو سلطان سے مونچھیں اور جعفر زٹلی سے مزاحیہ شاعری ورثہ میں حاصل کی اور یہ بھی عجیب مذاق ہے

کہ وہ آج بھی خون کا ہی کاروبار کرتے ہیں- خود کہتے ہیں:

جعفر کی ہوشیاری کا دیکھیں تو یہ کمال
سر پر نہیں ہیں بال تو مونچھوں کو بیچ دے

ایسا سیانا دیسی ملے گا کہاں کہ جو
گوروں کا خون نکال کر گوروں کو بیچ دے

اگرچہ مزاحیہ شاعری کی کشش اور اس کے طرف داروں کی تعداد ہر دور میں زیادہ ہی رہی' لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طنز مزاح کی شاعری کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ اہل اور حق دار تھی اور اس شاعری کو شاعری کے اصلی میدان سے علیحدہ کرنے کے لیے ہجو' ہزل' ریختی' بذلہ سنجی اور پیروڈی وغیرہ جیسے معمولی نام دیے گئے' اور مزاحیہ شاعر کو درجہ دوم شاعر تصور کیا گیا- زمین ظرافت میں اگرچہ قد آور شجر بشکل سودا' انشا' ضاحک' اکبر الہ آبادی' ظریف لکھنوی' بوم میرٹھی' احمق پھپھوندوی' فرقت کاکوری' ظریف دہلوی' سید محمد جعفری' محمود سرحدی' ضمیر جعفری' دلاور فگار' ساغر خیامی اور انعام الحق جاوید ملے جنھوں نے گلستانِ شاعری کو کشتِ زعفران میں تبدیل کر دیا' لیکن وہ بھی حاسدوں کی چشمِ سخن میں خار بنے رہے-

ادب کے محققین نے مزاحیہ شاعری پر غیر عادلانہ اعتراض کی تین وجوہات بتلائیں ہیں' جس کے ذمہ دار خود شعرا اور ناقدین ادب ہیں- یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے مشاعروں اور مبتدی شعرا نے عوام کی جلب توجہ کی خاطر اپنا منہ ہی مزاح اور طنزیہ کلام سے کھولا' چونکہ ان افراد کو علمی اور فنی صلاحیت حاصل نہ تھی' اس لیے ان مزاحیہ شعرا کو طنز کا نشانہ بنایا گیا- دوسرا سبب: جب کسی ظرافت نگار نے فن اور فکر و خیال پر عبور رکھتے ہوئے مشاعروں کو لوٹنا شروع کیا' تو یہ بات بھی خدایان سخن کو بری لگی' کیونکہ بہر حال زمانہ لٹیروں کو پسند نہیں کرتا اور یہ کوشش کی گئی کہ مزاح نگار شاعر کو مشاعرے سے دور رکھا جائے- تیسری وجہ خود ناقدین ادب تھے' جو عموماً اردو معلّیٰ کے حامی تھے اور چونکہ عموماً مزاحیہ شاعری اردو محلّہ میں لکھی جاتی ہے' جس میں لب و لہجہ اور عام بول چال کی زبان سے استفادہ کیا جاتا ہے' تو یہ عمل پسند نہیں کیا گیا' اور اس طرح مزاحیہ شاعری موردِ عتاب رہی' لیکن بہر حال یہ تمام کوششیں ناکام ہوئیں' اور چونکہ ہنستا' ہنسانا انسانی

فطرت کا جزو ہے' اس لیے جعفر زٹلی سے جعفر رضوی تک اس کاروان میں شامل ہوتے رہے اور یہ کاروان کامیابی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہا۔

مقدمہ شعر و ادب میں مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف کہا' خدائے سخن میر تقی میر نے بہت زیادہ ظریفانہ اور طنزیہ اشعار لکھے' علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں جداگانہ ظریفانہ اشعار جمع کیے اور اکبر الہ آبادی نے تو مستقل طور پر مزاح اور طنز کو شاعری کا سرچشمہ قرار دیا' اسی لیے تو آج بھی ہندو پاک میں مزاحیہ شاعری کا ایوارڈ اسی شخصیات کے نام سے موسوم ہے۔ ظرافت کے بارے میں بابائے ظرافت حضرت ضمیر جعفری فرماتے ہیں' مزاح زمین کی چیز ہے' ظرافت آسمانوں میں نہیں ہوتی' انسان اس وقت بالغ ہوتا ہے جب پہلی بار اپنے اوپر ہنستا ہے' چنانچہ آج میں پہلی بار جناب جعفر رضوی کو بالغ اور عاقل دیکھ رہا ہوں' البتہ یہ بات اعتبار کرنے کی نہیں ہے' میں یونہی مذاق میں کہ رہا ہوں۔

جعفر رضوی کے پہلے مجموعہ کلام ''یونہی مذاق میں'' جو نظموں' غزلیات اور ۷۶ قطعات پر مشتمل ہے' ان کے ذوق مذاق اور فنی استطاعت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ جناب ضمیر جعفری بنام جعفر رضوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے امریکہ میں ایک عرصے سے رہتے ہوئے بھی امریکہ کو اپنے اندر داخل ہونے نہیں دیا اور اگر ان کا بس چلے تو سارے امریکہ کو پان کی طرح چبا کر کراچی کے لالوکھیت میں پھینک دیں۔ جناب راغب مرادآبادی مجموعہ کلام پر کہتے ہیں:

بے شک ''یونہی مذاق میں'' یہ دیوان
جعفر رضوی کی بن گیا پہچان

جناب حمایت علی شاعر لکھتے ہیں۔ جعفر رضوی کی شاعری میں زبان کی بھی چاشنی ہے اور انداز بیان کی بھی۔ ان کے کلام کی ایک اور بھی خصوصیت اپنی طرف متوجہ کرتی ہے' وہ Situational Comedy ہے۔ میری نظر میں حمایت علی شاعر نے حق بات کہی' ہم نے نیویارک میں جعفر رضوی کو کئی مشاعروں میں مدعو کیا اور انھیں نیویارک کے پلوں سے گذرتے وقت Tolls اتنے دینے پڑے جو خود ان کی Situational Comeday سے ظاہر ہیں:

ہر کانگریس مین کو کشکول دیتے ہم

سب ہائی ویز اور برج کھول دیتے ہم
اچھا ہے یہ صراط نیو یارک میں نہیں
ورنہ پل صراط پر بھی ٹول دیتے ہیں

معاشرے کی Situational Comedy ملاحظہ کیجیے:

ہر بات کا یہاں تو چلن ہی نرالا ہے
پلّوں کو اپنے بچوں سے بہتر ہی پالا ہے
جعفرا یہ قدر حضرت انساں تو دیکھیے
کتے کو گھر میں رکھ لیا' شوہر نکالا ہے

ہمارے جلسے جلوس پر جو عام طور پر تاخیر سے شروع ہوتے ہیں' جعفر رضوی کہتے ہیں:

جو جلد آئے تھے' وہ لوٹ کر بھی جانے لگے
سفید بال بھی داڑھی میں جگمگانے لگے
خدا کے واسطے فنکشن کی ابتدا کیجیے
جوان ہو گئے بچے' پیام آنے لگے

جعفر رضوی نے ''یونہی مذاق میں'' اپنی بیگم شوکت زہرا کو وہ سب کچھ سنا دیا جو صاف زبان میں کہنے سے ڈرتے تھے۔ کہتے ہیں:

اچھی صورت پہ مر نہیں سکتے
دم محبت کا بھر نہیں سکتے
اپنی بیگم کا ہاتھ بھاری ہے
عاشقی ہم تو کر نہیں سکتے

☆......☆......☆

معلمِ اقبالؔ شمس العلما میر حسن

علامہ اقبالؔ کی ساٹھویں برسی کی نسبت سے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کے شفیق استاد شمس العلما سیدّ میر حسن کا تذکرہ کروں' تاکہ استاد اور شاگرد کی روحیں بھی شاد ہوں اور ہمارے درمیان ان کی یادیں بھی آباد رہیں۔ شمس العلما سیدّ میر حسن کی پہلی ملاقات علامہ اقبالؔ سے اس وقت ہوئی' جب علامہ کی عمر صرف چار سال چار مہینے تھی۔ اقبالؔ کو ان کے والد شیخ نور محمد نے صرف مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے غلام حسن کے مکتب میں روانہ کیا تھا' جو سیالکوٹ کے محلہ شوالہ کی مسجد میں واقع تھا۔ ایک دن مولوی میر حسن مکتب آئے اور جب ان کی نگاہ اس کمسن بچے پر پڑی جس کی پیشانی کشادہ' جس کے بھورے رنگ کے بال اور جس کا چہرہ معصومیت سے لبریز تھا' تو آپ نے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ اور پھر اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد کے پاس جا کر سمجھایا اور راضی کیا کہ بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدید کی تعلیم بھی ضروری ہے' چنانچہ خود مولوی میر حسن نے اقبالؔ کو اسکاچ مشن کے مدرسے میں داخل کیا' جہاں سے آپ نے میٹرک پاس کیا۔

مولوی سیدّ میر حسن ۱۸۴۴ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ نے تقریباً ۸۵ سال عمر پائی۔ علامہ اقبالؔ نے ۴۸ سال تک اس شفیق استاد سے فیض اٹھایا اور ان کی آخری عمر تک احترام کیا اور خدمت گذاری انجام دی۔

کتاب ''روزگارِ فقیر'' تالیف سیدّ وحید الدین' ''علامہ سر اقبالؔ'' تالیف شیخ آفتاب احمد کے علاوہ ''ذکرِ اقبالؔ'' اور ''نیرنگِ خیال'' میں لکھا ہے کہ مولوی میر حسن ایک راسخ الاعتقاد مسلمان اور باعمل مومن تھے۔ وہ حافظِ قرآن بھی تھے۔ مولوی صاحب علومِ اسلامی' عرفان اور تصوف میں ید طولیٰ رکھتے ہوئے علومِ جدید ادبیات' زبان اور ریاضیات

میں ماہر تھے۔ ہزاروں اشعار عربی، فارسی، اردو اور پنجابی میں زبانی یاد تھے۔ نماز صبح کے بعد ہر روز پہلے قبرستان جا کر عزیزوں اور دوستوں کے لیے فاتحہ پڑھتے، گھر پہنچ کر ناشتہ کرتے اور پھر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا۔ شاگردوں کو گھر پر تعلیم دیتے، پھر مدرسے میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے، شام کو جب بازار جاتے تو شاگرد ساتھ ساتھ رہتے، اس طرح استاد اور شاگردوں کا یہ قافلہ کسب علم میں صبح سے دیر گئے رات تک گامزن رہتا۔ مولوی میر حسن متین، قناعت پسند، متواضع خوش اخلاق اور پاک صفت انسان تھے۔ آپ کی زندگی سادہ اور لباس معمولی اور پاکیزہ ہوتا تھا۔ آپ کی تنخواہ جو مدرسہ اسکاچ مشن سے ملتی تھی، کبھی ۱۲۰ روپوں سے زیادہ نہیں رہی۔

علامہ اقبال نے بہت سی اخلاقی خصوصیات اور قلبی واردات کو اپنے استاد ہی سے حاصل کیا تھا۔ علامہ میر حسن کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں ہمیشہ شاہ صاحب کہ کر یاد فرماتے۔ احترام کا یہ حال تھا کہ پہلے پہل استاد کے سامنے کبھی شعر پڑھنے کی جرات نہیں کی، لیکن بعد میں جب مولوی نے شعری ترغیب کی اور فن شعر کی تعلیم دی تو ان سے بھرپور استفادہ کیا اور میر حسن صاحب ہی کے مشورے سے حضرت داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں رقم کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مولوی صاحب کے ساتھ اقبال، بازار گئے۔ مولوی صاحب کے کسی عزیز کا چھوٹا بچہ، جس کا نام احسان تھا، ساتھ ہو گیا۔ احسان بہت موٹا تھا، مولوی صاحب نے اقبال سے کہا کہ بچے کو گود میں اٹھا لو۔ کچھ راستہ چل کر اقبال نے اسے دوکان پر اتارا اور تھکن دور کرنے لگے۔ مولوی صاحب متوجہ ہوئے اور کہا: اقبال! اس چھوٹے بچے کو بھی اٹھانا تمھارے لیے مشکل ہے؟ اقبال نے فورا جواب دیا: شاہ صاحب! آپ کا احسان بہت سنگین ہے۔

علامہ اقبال کے دل میں اپنے استاد کی قدر و منزلت اور محبت کس قدر تھی، ان اشعار سے جھلکتی ہے، جو موصوف نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہوتے وقت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر نظم ''التجاے مسافر'' میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم' جس کا آستاں' مجکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں' مجکو
دعا یہ کر کے خداوندِ آسمان و زمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں' مجکو

شمس العلماء مولوی میر حسن' سرسید احمد خان کے حامیوں میں سے تھے' چنانچہ جب سرسید اپنے نواسے سر راس مسعود کے ہمراہ پنجاب آئے تو میر حسن صاحب نے اقبال کا تعارف سرسید احمد خان اور سر راس مسعود سے کرایا' چنانچہ اسی ملاقات کے بعد سے آخری عمر تک اقبال اور راس مسعود کھیمی دوست اور ہم فکر رفیق بنے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں جب سرسید کے انتقال کی خبر سیالکوٹ پہنچی تو علامہ اقبال تعطیلات گزارنے کے لیے لاہور سے سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ مولوی میر حسن نے مادہ تاریخ نکالنے کے لیے کہا تو اقبال نے چند ہی گھنٹوں میں "انی متوفیک و رافعک الی و مطھرک" مادہ تاریخ استخراج کیا' اور خود میر حسن صاحب نے "غـفـر لـہ" تاریخ نکالی۔ مولوی میر حسن کے بڑے بیٹے سید محمد تقی شاہ اور ان کے چھوٹے بیٹے سید محمد ذکی شاہ سے علامہ اقبال کا یارانہ تھا اور دن رات ان کے ساتھ بچپنے اور جوانی میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ مولوی میر حسن کے نواسے جناب سجاد حیدر بھی لاہور میں بقید حیات ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں حکومتِ برطانیہ نے علامہ اقبال کو سر کا خطاب عطا کرنے سے آگاہ کیا' تو علامہ نے پنجاب کے گورنر جنرل سے کہا کہ جب تک ان کے استاد میر حسن کی قدردانی نہیں کی جائے گی' وہ کسی قسم کا اعزاز قبول نہیں کریں گے۔ گورنر نے پوچھا' مولوی صاحب کی کوئی تصنیف بھی ہے؟ علامہ نے جواب دیا: میں خود ان کی تصنیف ہوں' چنانچہ حکومت برطانیہ نے مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دے کر علامہ کو سر کا خطاب دیا۔ علامہ اقبال چار سال سے ۵۲ سال کی عمر تک اپنے استاد

میر حسن سے وابستہ رہے۔ ہمیشہ ان سے ملتے جلتے رہتے اور اپنے ہر کام میں ان سے مشورہ حاصل کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا کہ اپنے شاگرد کی شہرت اور کامیابی دیکھ کر ایسے جذباتی ہو جاتے کہ جب کبھی اقبال کا نام بھی آ جاتا' تو خوشی کے آنسو نکل جاتے۔ کیا دنیا میں کسی اور استاد اور شاگرد کا ایسا محبتی رشتہ ہو سکتا ہے۔ صحیح کہا ہے: ''دل بہ دل راہ دارد۔''

جب ۱۹۲۹ء میں ۸۵ سال کی عمر میں شمس العلما مولوی میر حسن نے داعی اجل کو لبیک کہا تو علامہ اقبال نے مادہ تاریخ اخراج کی: "ما ارسلنک الا رحمتہ للعالمین"۔ یہ سچ ہے کہ یہ رحمت للعالمین ہی کی رحمت تھی جس نے مولوی میر حسن جیسے شفیق استاد کو علامہ کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔

☆......☆......☆

سحر آثار کی سحر نمائی

چھوٹی بحر کا بڑا شاعر

دنیائے شعر و ادب کی مشہور و معروف شخصیت جناب امجد اسلام امجدؔ جو اردو سائنس بورڈ پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہیں' ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ موصوف عہد حاضر کے ممتاز اور مقبول ڈراما نگار ہونے کے علاوہ صف اول کے اساتذہ شعرا کرام میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ امجد اسلام امجدؔ کی تیس سے زیادہ تالیفات' تصنیفات اور تخلیقات ہمارے درمیان میں موجود ہیں' لیکن اس گفتگو کی نوعیت کے اعتبار سے' جو آپ کی شعری خدمات پر منحصر ہے' ہم صرف یہاں پر آپ کے آٹھ شعری مجموعوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں' جن میں ''برزخ' ساتوں در' فشار' ذرا پھر سے کہیں' آنکھوں میں تیرے سپنے' اس پار' اتنے خواب کہاں رکھوگا'' اور ''بارش کی آواز'' قابل ذکر ہیں۔ آپ کا پہلا مجموعہ ''برزخ'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اور موجودہ تازہ ترین مجموعہ کلام ''سحر آثار'' فروری ۹۸ء میں منظر عام پر آیا جو ہماری گفتگو کا اصل اور ماحصل ہے۔

امجد اسلام امجد کا یہ تخلیقی شاہکار' جو آپ کے تدریجی ارتقا کا ضامن ہے' صرف چالیس دنوں کی فصل کاری کا ثمر ہے۔ چونکہ موصوف کی زمین طبع سخن' گونا گوں اداری اور سماجی مصروفیات کی وجہ سے چند مدت کے لیے خشک رہی' چنانچہ جیسے ہی خیال وفکر کی گھٹائیں چھائیں' طبع موزوں موسلا دھار بارش کی طرح زمین سخن پر ایسی برسی کہ چند ہفتوں میں ایک پر بار فصل ندرت خیال آمادہ ہوگئی اور بازار شعر کی تزئین اور توقیر ثابت ہوئی۔

''سحر آثار'' جو امجد اسلام امجدؔ کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے' ۱۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کلام میں دو حمدیں' دو نعتیں' اکیس نظمیں اور ستائیس غزلیں شامل ہیں۔

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

میرے لیے اس مختصر سے مضمون میں یہ بات تو ممکن نہیں کہ اس مجموعہ کلام کے محاسن' ندرت خیال کے مطالب' صنائع لفظی' صنائع معنوی' اسلوب بیان' سادہ زبان اور تصورات امکان کے بارے میں تمام حقائق پر روشنی ڈالوں' البتہ میری کوشش یہ ہو گی کہ اس دریائے فکر و خیال میں غوطہ زن ہو کر چند گہر آبدار اور دُرّ بے بہا کو قارئین کے سامنے پیش کروں' تاکہ ''ہر کس بقدر ہمت خود'' اس گنجینۂ فکر و خیال سے' جو موتیوں کے ہار کی طرح نظم کیا گیا ہے' اپنی عروس فکر کی آرائش کر سکے۔

مشہور ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا بڑے شاعر کا ادبی کرشمہ ہے' لیکن اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ قطرے کو وسعت دے کر دریائے بیکراں کرنا عظیم المرتبت شاعر کا عظیم ترین معجزہ ہے۔ چونکہ شاعری خداداد قدرت ہے اور بقول۔

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

اس لیے سچا شاعر وہی ہے' جو ایمانداری کے ساتھ اس قدرت کو استعمال کر کے اس کے ثمر سے عوام کو مستفید کرے' اور یہی پیامبری ہے۔

اس مجموعہ کلام کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چند غزلیات اردو کی' سب سے چھوٹی بحروں میں کہی گئیں ہیں اور یہ غزلیں سادہ زبان میں ہوتے ہوئے علم بدیع کی صنعتوں سے مزین ہیں' اور پھر سونے پہ سہاگہ یہ ہے کہ اس میں کم ترین اضافات کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں چھوٹی بحروں میں غزلیں موجود ہیں' لیکن اغلب اضافات سے بھری پڑی ہیں۔ ''سحر آثار'' کی ایک غزل ۳۱ اشعار رکھتے ہوئے بھی صرف ایک اضافت کی حامل ہے۔ ۲۰۳ الفاظ سے بنی ہوئی اس چھوٹی بحر کی غزل میں صرف ۲۴ فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں۔ خیال کی فراوانی کو مکمل طریقے سے ہر شعر میں ادا کیا گیا ہے اور الفاظوں کو اس طرح سے جمایا گیا ہے' جس طرح ایک کہنہ مشق جوہری قیمتی پتھروں کو انگوٹھی میں جوڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعہ کلام میں ایک اور غزل' جو ۲۳ اشعار پر مشتمل ہے اور ۵۰ الفاظ سے بنی ہے' صرف ۱۳ عربی اور فارسی کے الفاظ رکھتی ہے' اور اس میں بھی صرف ایک اضافت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ غزلوں کے جملہ ۳۳۳ اشعار میں صرف ۱۹۶ اضافتیں نظر آتی ہیں' جو امجد اسلام امجد کی شاعرانہ انفرادیت کی سند ہے۔ فوق الذکر غزلیات کے کچھ چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سب کی ایک اوقات
عشق نے پوچھے ذات
بالکل بھول گئے
کرنی تھی جو بات
اب سے تیرے ہیں
میرے دن اور رات
کٹ ہی جاتی ہے
کیسی بھی ہو رات
غم کے دھاگوں سے
امجد خوشیاں کات
کہتا ہے درپن
میرے جیسا بن
بات نہ کرنے سے
بڑھتی ہے الجھن
دھوکا دیتے ہیں
اجلے پیراہن
دونوں جھوٹے ہیں
ساجن اور ساون
اتنی خواہش کر
جتنا ہے دامن

ایک قطعہ بند میں تسلسلِ خیال، تصویرِ جمال اور لفظوں کا کمال دیکھیے:

آؤ ہم اور تم
ایسا کرتے جائیں
آنکھوں آنکھوں میں
باتیں کرتے جائیں

باتوں باتوں میں
غنچے کھلتے جائیں
رنگوں میں نکلیں
خوشبو ہوتے جائیں

منظوم کلام کی تقسیم بندی میں نظم کی تعریف کو خیال کا تسلسل بتایا گیا ہے' یعنی مکمل نظم وہ منظوم کلام ہے' جو ایک لڑی کی طرح سلسلہ رکھتے ہوئے خیال کی تکمیل کرے۔ نظم میں اشعار کی تعداد معین نہیں ہوتی۔ ''سحر آثار'' میں امجد اسلام امجد نے ایک مفرد شعر کو ایک لچکدار مقام پر توڑ کر ایسی مکمل نظم میں تبدیل کیا ہے' جو کوزے میں سمندر کو بھرنے کے برابر ہے۔ ۱۸ الفاظ میں ہمارے معاشرے کی دردناک جہیز کی داستان کو محاوروں سے آراستہ کر کے کہتے ہیں:

آندھیوں کی بے ٹھکانہ منزلوں میں
ریت' نیلے ہو گئے
بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے
آپ نیلے ہو گئے

سچ تو یہ ہے شاعر نے اس نظم میں ایک چھوٹے سے نشتر سے شمشیر آبدار کا کام لیا ہے اور یہی آفاقی شاعری ہے۔ ''سحر آثار'' میں نظموں کا رنگ انوکھا ہے' شاعر نے کسی مقام پر معاشرے سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کیا اور کہیں پر واعظ و ناصح کی طرح آدرش کا درس نہیں دیا' بلکہ ہر جگہ ظلم و جور و استبداد کی نقاب کشائی کی ہے۔ غم دوراں ہو کہ غم جاناں' عشق حقیقی ہو کہ عشق مجازی' اشعار کو آئینے کا جوہر بخشا تا کہ ہر قاری اور ہر سامع اس میں صاف طور پر اپنا عکس دیکھ سکے اور پھر خود ہی مسند انصاف پر بیٹھ کر فیصلہ کر سکے۔ میرا مدعا چند منتخب اشعار سے کسی حد تک ظاہر ہو جائے گا۔ غم دوراں کی نسبت سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شمار گردش لیل و نہار کرتے ہوئے
گزر چلی ہے تیرا انتظار کرتے ہوئے
تمام اہل سفر ایک سے نہیں ہوتے
کھلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا
کچھ دن تو مرا عکس رہا آئینہ پر نقش
پھر یوں ہوا کہ خود میرا چہرا بدل گیا
کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا، مکان کا نقشہ بدل گیا
درد دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے، سماج نہیں
حرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں
بستیوں کو نہ پستوں میں رکھ
التجا ہے یہ احتجاج نہیں
در تھا کھلا پہ بیٹھے رہے پر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی
دیکھ تو کتنے چمن نے کس درجہ مطمئن
بیٹھے ہیں ارض پاک کو ادھا کیے ہوئے

اب غم جاناں کے متعلق اشعار کا آپ خود فیصلہ فرمائیں:

بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں، کئی لفظ جو دل میں
دنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن
خوشبو سے بھری شام میں، جگنو کے قلم سے
اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن
سارے دھنک کے رنگ تھے، اس کے لباس میں
خوشبو کے سارے انگ اسے سوچنے میں تھے
وصل، فراق، دونوں میں اک جیسے ناگزیر
کچھ لطف اس کے قرب میں، کچھ فاصلے میں تھے

جگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کسی سلسلے میں تھے
امجد کتابِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح
لکھنے تھے جتنے لفظ ابھی حافظے میں تھے

آخر میں اپنی گفتگو کو موصوف کی نظم ''ہم لوگ'' کے چند بندوں پر تمام کرتا ہوں:

دائروں میں چلتے ہیں
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے
گرد اڑتی رہتی ہے
درد بڑھتا جاتا ہے
راستے نہیں گھٹتے
دم ستاروں کی تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں
اک کرن جو ملتی ہے آفتاب کہتے ہیں
دائرہ بدلنے کو انقلاب کہتے ہیں

اور اسی شاعری کے ذہنی انقلاب کا دوسرا نام امجد اسلام امجد ہے۔

☆......☆......☆

یہی تو حرف معتبر ہے

اعتبار کامل ذات خداوندی ہے اور اس اعتبار کامل کا حبیب، معتبر ترین فرد کائنات ہے، اور ہر حرف، جو اس معتبر کی توصیف میں بیان کیا جائے، خود حرف معتبر ہے، چنانچہ اسی لیے حضرت ستار شاہ وارثی کا یہ تیسرا نعتیہ مجموعہ کلام، سارا کا سارا "حرف معتبر" ہے۔ چونکہ صاحب بیان نور ہے اور اس کا ذکر نورانی، اس لیے میں نے سوچا کہ اختصار کے ساتھ اس کاروان نعت گوئی کا ذکر کیا جائے، جس سے شاعری کی جبین آج تک منور ہے۔

نعت: یہ سہ حرفی لفظ دنیائے ادب کے معتبر ترین لفظوں میں شمار کیا جاتا ہے جس کو "حرف معتبر" کے وارث حضرت ستار وارثی کے فرزند ارجمند جناب مظفر وارثی نے ابدائے میں بالکل صحیح رقم کیا ہے کہ نعت کا لفظ پہلی بار حضرت علیؓ نے استعمال کیا، چنانچہ یہ لفظ اتنا ہی قدیم ہے، جتنی تاریخ اسلام۔ تاریخ گواہ ہے کہ سب سے پہلے نعتیہ اشعار حضرت ابو طالب علیہ السلام نے کہے اور سب سے پہلے مکمل نعت حضرت حسانؓ بن ثابت نے خود دربار رسالت مآبؐ میں پیش کی، جس کے ایک مشہور شعر کا ترجمہ اس طرح ہے۔

ما ان مدحت محمدً بمعالتی
لکن مدحت مقالتی بہ محمدً

یعنی: میں نے اپنے کلام سے حضرت محمد ﷺ کی تعریف نہیں کی بلکہ ان کے ذکر سے اپنے کلام کو قابلِ تعریف بنایا ہے۔ صدرِ اسلام کے نعت خوانوں میں حضرت علیؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، کعب بن رہبر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک مشہور نعت گوؒ جسے شاعرِ چادرِ رحمت کا خطاب دیا گیا، جناب امام بوصیری ہیں۔

فارسی زبان میں شیخ مصلح الدین سعدیؔ، امیر خسروؔ، ملا عبدالرحمٰن جامیؔ، عرفیؔ،

قدسی اور نظیری کی نعتیں بہت مشہور ہیں۔ تقریباً ۷۵۰ سال گزرنے پر بھی سعدی کا نعتیہ کلام "بلغ علی بکمالہ" زبان زد عام ہے' جس پر قدیم اور جدید اردو شعرا نے نعتیں تضمین کیں ہیں۔ آج سے کوئی ڈھائی سو سال قبل لکھنو کے مشہور مرثیہ گو شاعر پناہ علی بیگ افسردہ جو بہو بیگم کے وکیل تھے اور جن کے ۲۴۰ سے زیادہ مراثی ریاست محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہیں' سعدی کے مشہور نعتیہ قطعہ کی تضمین پر مسدس کی ہیئت میں فرماتے ہیں:

وہ پادشاہ انبیا' جس العلیٰ اجلالہ
وہ شمع نور کبریا' نجم الھدیٰ افضالہ
وہ سرور شاہ و گدا' الفقر فخری قالہ
وہ دلق بخش اولیا و الفقر منی حالہ
بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع و خصالہ
صلو علیہ وآلہ

دوسری مشہور تضمین سعدی کے اشعار پر ملاحظہ کیجیے:

ثنا خوان ہے جس کا غفور الرحیم
وہ ہے کون' یعنی رسولؐ کریم
مکاں جس کا ہے یارو! عرش عظیم
وہ ہے ذات ایسی خدائے علیم
شفیع مطاع نبیؐ کریم
قسیم جسیم نسیم وسیم

امیر خسرو نعتیہ شاعری سے ابھی تک زندہ ہیں اور سات سو سال کا عرصہ گذرنے پر بھی امیر خسرو کے اشعار ہمارے درمیان اسی تازگی سے موجود ہیں' جس میں وہ فرماتے ہیں:

نمی دونم چہ منزل بود شب جای کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جای کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ!
محمدؐ شمع محفل بود شب جای کہ من بودم

ملا عبدالرحمن جامیؔ کی نعت کا ایک شعر آج تک ہمارے سینوں میں محفوظ ہے جس پر کئی اردو اور فارسی کے شعرا نے نعتیں تضمین کی ہیں:

لا یمکن الثنا کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حاجی محمد جان قدسیؔ جو شاہ جہاں کے عہد کا درباری شاعر تھا اس کی عشقِ محمدیؐ میں ڈوبی ہوئی نعت ابھی بھی زبان زدِ عام ہے۔ اور جس پر مومنؔ اور غالبؔ جیسے شعرا نے نعتیہ اشعار رقم کیے ہیں:

مرحبا سیّد مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

نعت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ نعت کہنا بہت آسان ہے اور بہت مشکل بھی۔ بے شک جو شخص عشقِ محمدیؐ کی دولت سے مالا مال ہو اور شاعری کے فن سے آشنا تو پھر وہ اپنی دلی کیفیت کو شعری ہیت میں بیان کر سکتا ہے جس کی مثال خود مرحوم ستار شاہ وارثی ہیں جن کے نعتیہ کلام کے تیسرے مجموعے پر ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ نعت کہنا مشکل اس لیے ہے کہ اس کی سرحدیں حمد کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہیں اور اگر شاعر کا کوئی قدم اپنی حد سے تجاوز کر کے دوسری طرف چلا جائے تو آئینِ شریعت میں ثواب کے بجائے عتاب نازل ہوتا ہے یعنی ذرا سی لغزش ایمان کو کفر میں بدل سکتی ہے۔ عبد اور معبود کے اس باریک رشتے کو الفاظ کے تاروں سے سجانے کے لیے علمِ عشق اور زبان کی یکجا ضرورت ہوتی ہے اس لیے تو دربار اکبری کے مشہور فارسی زبان شاعر عرفیؔ شیرازی نے اپنی نعت میں لکھا:

عرفیؔ! مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدحِ کے وجم را

ترجمہ: اے عرفیؔ! جلدی نہ کر کہ یہ نعت کا راستہ ہے کوئی صحرا نہیں۔ آہستہ قدم اٹھا

کیونکہ یہ راستہ تلوار کی دھار کی طرح تیز بنا ہوا ہے۔ تو خبردار رہ! کہ ایک ہی ساز میں سلطانِ کائنات کی نعت اور سلاطین زمین کے قصائد نہیں بجا سکتا۔

مضمون کی طوالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت فریدالدین شکر گنجؒ، فرید الدین عطارؒ شمس تبریزیؒ جلال الدین رومیؒ شہاب الدین بدایونیؒ بوعلی قلندرؒ نظامی گنجویؒ خواجہ نظام الدین اولیا اور محمد حسین نظیریؔ کے نعتیہ مشہور اشعار پیش نہیں کر سکتا' جو خود نعتیہ کلام کے در بے بہا اور لعل بدخشاں ہیں۔

اگرچہ اردو زبان کی عمر فارسی اور عربی کے مقابلے میں کچھ نہیں' لیکن اس کا افقی کینوس بہت وسیع ہے' اس لیے چار سو برس کے قلیل عرصے میں اتنی نعتیں لکھی گئیں کہ ان کی تعداد عربی فارسی سے بڑھ گئی۔ اردو کی سب سے پہلی نعت' جو آج ہمارے درمیان موجود ہے' جسے سید محمد فراقیؔ نے لکھا اور جس میں صرف پانچ شعر ہیں۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

مدینہ میں اگر پیدا ہوا ہوتا' تو کیا ہوتا
محمد کی گلی فرتا' فنا ہوتا' تو کیا ہوتا
ارے مجنوں ہوا بدنام تو لیلٰی کو دل دے کر
اگر مرے نبیؐ کو دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا

دوسرا اردو کا مستند نعت گو صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ معانیؔ ہے:

اسم محمدؐ تے اہے جگ میں سو خاقانی مجھے
بندہ نبیؐ کا جسم رہے بخشی ہے سلطانی مجھے

اس کے علاوہ ولیؔ دکھنیؒ ملا وجہیؔ جو محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک شعرا تھا' نعت گو شعرا کے صف میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ نعتیں پہلے اردو ادب میں ہر شکل و ہیت میں لکھی گئیں' یعنی رباعی' مربع' مخمس' مسدس' مثنوی اور غزل کی ترکیبوں پر' لیکن گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے عام طور سے غزل ہی کے رنگ پر بیشتر نعتیں لکھی جا رہی ہیں۔ عشق محمدیؐ میں ڈوب کر سلیس زبان میں نعتیں لکھنے میں جناب احمد رضا بریلویؒ جن کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا' کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آج تک داغؔ دہلوی کا وہ جملہ رضا بریلوی کی فنی دسترس پر سند ہے جو داغؔ نے برسرِ محفل کہہ دیا کہ مولوی ہو کر بھی ایسے اچھے شعر کہتا ہے'

چنانچہ اسی نعت گوئی نے حضرت ہی نہیں، انھیں اعلیٰ کر دیا۔ رضا بریلوی کی مشہور نعت:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

کس نے نہیں سنی۔

جناب محسن کاکوری، جن کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا اور جو امیر مینائی کے شاگرد تھے، ان کا مشہور نعتیہ قصیدہ سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل قبول عام حاصل کر چکا ہے:

مدینہ کی طرف جائیں کہ لیں کعبہ کا رستہ
نظر آتا ہے ان دونوں گھروں میں ایک ہی جلوہ
کہاں اب جبہ سائی کیجیے، کچھ بن نہیں پڑتا
احد کو کیجیے یا احمد بے میم کو سجدہ

علامہ اقبال نے عشقِ رسول کو اپنے پیام کا محور بنایا اور مخصوص عنوان سے نعتیں بہت کم کہیں، لیکن ہر مقام پر نعتیہ اشعار ایسے رکھے جیسی انگوٹھی میں نگینہ۔ بہرحال، یہ ایک طولانی بحث ہے، جس کو ہم علیحدہ بیان کریں گے۔ ۱۹۳۶ء سے ترقی پسند مصنفین کا دور شروع ہوا اور تقریباً ۵۰ سال تک نعت گوئی پر منفی اثر ڈالتا رہا، چنانچہ اچھے اچھے شعرا نے مذہب کو ادب سے جدا کر کے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی اور یہ نعت گوئی کا سیلاب کچھ عرصے کے لیے محدود ہوتا ہوا نظر آنے لگا، جبکہ ۱۹۲۴ء میں محمد نظامی نے ان نعتوں کا مجموعہ شائع کیا تھا، جو غیر مسلم اور ہندوؤں شاعروں نے حضورِ اکرم کی خدمت میں پیش کیا تھا اور جس کی تعداد ۴۰ شعرا کے اوپر تھی۔

بہرحال، کیونکہ عشق، جذبات کے طوفان سے ہوتا ہے اور طوفان کو زنجیروں میں جکڑا نہیں جا سکتا، اس لیے اس سیلاب نے ان بندشوں کو توڑا اور آج پھر نعتیہ مشاعرے، نعت گوئی کی محافل اور نعت کی کتابیں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا کے ہر حصے میں نمایاں ہو رہی ہیں۔ ہر سال کئی جدید نعتیہ مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک لاہور کے پرچے "شام و سحر" نے نعت کی جمع آوری کے آٹھ ضخیم رسالے نکالے۔ ۱۹۹۳ء میں دو بڑی جلدیں پاکستان سے نعت کی جمع آوری پر شائع

ہوئیں- چند سال قبل شمالی امریکہ سے نعت کا پہلا مجموعہ ''عرفانِ عبدؔ'' جو ڈاکٹر عبدالرحمن عبدؔ کا کلام ہے' منظرِ عام پر آیا' اور بہرحال' یہ آج کی تقریبِ رونمائی درحقیقت اسی کاروانِ نعت گوئی کی راہ نوردی کی دلیل ہے-

حضرت ستارؔ وارثی کا یہ تیسرا مجموعہ نعت ''حرفِ معتبر''' جو ایک حمد' ایک مناجات اور ۹۹ نعتوں پر مشتمل ہے' مرحوم کے والہانہ عشقِ محمدیؐ اور فنی دسترس کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے- حضورؐ اکرم کے ۹۹ اسمائے صفات کو عنوان بنا کر بڑے اعتقاد اور احتیاط کے ساتھ' قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں' سلیس زبان میں نعت کہنا خود ایک معرکہ آرا کام تھا' جس کو حضرت شاہ وارثی کا شاہکار کہا جائے تو غلط نہ ہو گا- ایک ہزار کے لگ بھگ اشعار کا یہ مجموعہ ایسا گلدستۂ عقیدت ہے' جس کے ہر پھول سے عشقِ رسولؐ کی خوشبو آتی ہے- یہ عندلیبِ ریاضِ رسولؐ جس نے اپنی تمام زندگی نعت گوئی' عرفان اور تصوف کی راہ میں صرف کر دی اور جس کی گیارہ سے زیادہ تصانیف ثوابِ جاریہ بن کر ہمارے درمیان موجود ہیں- مرحوم نے ہزاروں اشعار عشقِ محمدیؐ میں لکھے جب کہ صرف ایک ہی شعر بخشش کے لیے کافی تھا- خود فرماتے ہیں:

ملے گر مسندِ شاہی بھی تو' ستارؔ ٹھکرا دوں
کہ ان کی بھیک سے بڑھ کر نہیں یہ خسروی مجھ کو
گر زاہدوں کو مژدہ باغِ جناں ملا
شکرِ خدا کہ مجھ کو ترا آستاں ملا
کعبہ ہو یا کہ طور' نجف ہو کہ کربلا
ہر جلوہ گاہ میں وہی جلوہ فشاں ملا
دیوانہ گم ہوا جو محبت کی راہ میں
سنگِ درِ حضورؐ پہ سجدہ کناں ملا
یقیں تیرے کرم پر ہے' اس قدر' مولا!
ہے حرف حرف مرا حرفِ معتبر مولا!
کرن کرن سے جھلکتا ہے آفتاب کا عکس

ہر اک شیشہ میں تصویر شیشہ گر مولا!
بس اب تو چشم تمنا کو معتبر کر دے
رگ گلو سے بھی نزدیک ہے اگر مولا!

''حرف معتبر'' کے مطالعہ سے قاری کو صاحب کلام کے بارے میں تین چیزوں کا اچھی طرح سے علم ہو جاتا ہے: پہلی چیز جو قاری کو خیرہ نگاہ کر دیتی ہے' وہ مرحوم کا قرآن' احادیث اور اسلامی کتب کا وسیع مطالعہ ہے' کیونکہ کئی آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ اور واقعات اسلامی کو بڑے ہی دلکش انداز میں نظم کیا ہے۔ دوسری چیز' جس سے پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے' وہ مرحوم شاہ صاحب کی شاعری پر گرفت ہے۔ فن شاعری سے یہ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ کہنہ مشق شاعر عربی' فارسی اور اردو سے مجہز ہو کر علم عروض سے بالکل باخبر تھا اور سلیس زبان برتنے کے جوہر سے مکمل آراستہ تھا' چنانچہ گسترده فنی استطاعت کی وجہ سے جس مضمون پر بھی قلم اٹھایا' اسے ایسا نظم کیا کہ اس میں کوئی تشنگی باقی نہیں رہی۔ تیسری چیز' جس کو محنت یا مشقت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور جو خون میں وراثتاً حاصل ہوتا ہے' وہ مرحوم شاہ صاحب کا عشق رسولؐ اتم تھا' جو سورج کی کرن کی طرح ہر لفظ شعر سے پھوٹ رہا ہے۔ یہ جذبہ عشق محمد و آل محمدؐ سے والہانہ محبت' یہ خواجہ کی غلامی کا غرور اور یہ ابدی سرور ہی اس امر کا باعث ہوا کہ ہزاروں اشعار' مختلف عنادین کے تحت' دفتر عشق رسول ﷺ میں ثبت ہوئے۔ یقیناً:

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
ایں سعادت بزور بازو نیست

جب تک کہ خدا عطا نہ کرے' یہ دولت زور بازو سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے تو شاہ صاحب فرماتے ہیں:

عشق سرکارؐ دو عالم ہے وراثت میری
مرے مولا! تو مجھے دولت آبائی دے
آنکھ کے خشک سمندر کو روانی مل جائے
قلب کے تشنہ صدف کو در یکتائی دے

وارثی سلسلہ کا یہ فرزند' جو حضرت وارث علی شاہ سے منسوب ہے' اسی لیے تو

وارثی ہے اور سلسلہ صوفیہ میں حضرت امام حسینؑ کی اولاد میں شامل ہے' اور اسی لیے تو اس مجموعہ نعت میں سوائے محمدؐ علیؑ اور اولاد علیؑ' کسی اور کا تذکرہ ہی نہیں ملتا' بقول خود:

علی ستار وارث کی غلام
مجھے نسبت ہے شاہ بحر و بر سے

نعتیہ اشعار میں شوکت الفاظ ملاحظہ کیجیے:

سید مرسلؐ' کعبہ عرفاں' قبلہ ایماں' جانِ محبت
ارفع و اعلیٰ' سید والا' چشمہ رحمت' بحر عنایت
مظہر کامل' حسن سراپا' جلوہ نمائی نور حقیقت
نازشِ دوراں' سایہ یزداں' نازِ مشیت' مالکِ جنت
رونقِ محفل' فیضِ مسلسل' موجِ تبسم' پیکر تاباں
سرورؐ عالم' نازشِ دوراں' روحِ سعادت' مظہر قدرت

سراپا' نعت کا اہم موضوع ہوتا ہے' جس میں شاعر حضور اکرم ﷺ کے نورِ اقدس کو قلم بند کرنے کی کوشش ہی کر سکتا ہے- سراپا پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جمالِ ذاتِ الٰہی کا آئینہ تم ہو
سراپا معنیِ والشمس والضحیٰ تم ہو
ہیں شرح آیہ واللیل گیسوے مشکیں
سحاب لطف و کرم شاہِ دوسرا! تم ہو

آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سو نعتوں کا مجموعہ ''حرف معتبر'' حضرت شاہ وارثی کی جانب سے ہمیں سو دانوں کی ایک ایسی تسبیح کا تحفہ ہے' جس کا ہر دانہ اسماے محمدی کا گراں بہا موتی' جو عشقِ رسول کے دھاگے میں پرویا گیا ہے' اور چنانچہ تاابد یہ تسبیح کا ورد ہماری زبان پر جاری رہے گا اور مرحوم شاہ وارثی خلد آشیانی' جنت مکانی کے درجات کو بلند تر کرتا رہے گا- اپنی گفتگو کو مرحوم کے چند نعتیہ اشعار پر ختم کرتا ہوں:

ہر دم مری زباں پہ ثنائے رسولؐ ہے
عرشِ بریں سے رحمتِ حق کا نزول ہے
لایا ہوں میں جو ہارؔ درود و سلام کے

نعت نبیؐ کا اس میں ہر اک لفظ پھول ہے
دل میں گر ان کا عشق نہیں ہے تو کچھ نہیں
تقویٰ ہو یا کہ زہد و ورع سب فضول ہے
مدحت سرا تھا میں کہ یہ ہاتف نے دی صدا
ستارؔ تیری عرض تمنا قبول ہے

☆......☆......☆

اقبال کیسے علامہ سے سر ہو گئے

حکومتِ انگلستان نے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبال کی علمی اور فرہنگی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں سر کا خطاب دیا' چنانچہ ۱۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو شام کے چار بجے مقبرہ جہانگیر' شاہ باغ' لاہور میں پرشکوہ محفل ضیافت برگزار ہوئی- اس محفل کی صدارت پنجاب کے گورنر Sir E. Mclagen نے کی- اس محفل میں ملٹری کمانڈروں کے علاوہ سر جان مینارڈ' میاں فضل حسین وزیر تعلیم و آموزش' لالہ ہرکشن لال وزیر انڈسٹرز' نواب میر فتح علی خان' میاں احمد یار خان' سر ذوالفقار علی خان' راجا نریندر ناتھ اور چودھری شہاب الدین شامل تھے- یونیورسٹیوں اور مدارس کے مختلف اساتذہ اور طالب علموں کے ساتھ ساتھ خاصی تعداد میں ہندوستانی یورپائی خواتین بھی اس بزم میں شریک تھیں- اس محفل میں شرکت دعوت نامہ پر منحصر تھی- ضیافتِ شام کے بعد طالب علموں نے علامہ اقبال کی نظم ''ترانہ ہندی'' پڑھی-

سر ذوالفقار علی خان نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کی علمی' ادبی' سماجی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر میں رابندر ناتھ ٹیگور کے نوبل پرائز کے بعد دوسری شخصیت' جس کی خدمات کا صحیح اعتراف کیا گیا ہے' وہ علامہ اقبال ہیں- علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مغربی حکومتیں اس دور میں علوم مشرقیہ پر توجہ کر رہی ہیں' چنانچہ مجھے یہ خطاب دے کر حکومت انگلستان نے اردو اور فارسی کے ادیبوں کی قدردانی اور ان کا احترام کیا ہے- علامہ اقبال نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۳ء کو مہاراجا کشن پرشاد کو خط میں لکھا تھا کہ سر کا خطاب مجھے ''اسرارِ خودی'' کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا گیا ہے- ان اشعار کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے اور یورپ اور امریکہ میں ان اشعار پر تفسیریں اور تبصرے کیے گئے ہیں- اگرچہ پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے کچھ مہینے قبل علامہ اقبال سے کہا تھا کہ میں آپ کو سر کے خطاب کے لائق سمجھتا ہوں

اور اس کے لیے حکومت انگلستان سے پیش نہاد کرنا چاہتا ہوں' تو علامہ اقبالؔ نے فوری جواب دیا تھا کہ مجھے اس خطاب کی آرزو نہیں ہے' اور خاص طور پر اس ضمن میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا- تاریخی دستاویز سے یہ بات ظاہر ہے کہ جسٹس شادی لال کو علامہ اقبالؔ سے خصومت تھی اور وہ علامہ کی بڑھتی ہوئی شہرت کے حاسد تھے' چنانچہ جب شادی لال کو معلوم ہوا کہ حکومت انگلستان نے علامہ اقبالؔ کو سر کے خطاب کے لیے انتخاب کر لیا ہے' تو وہ اپنی چابک فکری اور منافقانہ رویے سے اس کام کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے تھے' جس کو علامہ نے فوری رد کر دیا' لیکن بعد میں گورنر پنجاب Sir Mclagen کے اصرار پر اس خطاب کو اس لیے قبول کیا کہ یہ خطاب صرف علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا تھا- علامہ اقبالؔ نے اس خطاب کو قبول کرنے سے قبل یہ شرط بھی رکھی کہ پہلے ان کے استاد و محسن مولوی سید میر حسن کی خدمات کی قدر دانی' شمس العلما کا خطاب دے کر' کی جائے- گورنر پنجاب کے سوال پر کہ مولوی میر حسن کی کتنی تصانیف ہیں' علامہ نے کہا کہ مولوی میر حسن نے ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی' لیکن میں مولوی میر حسن کی زندہ تصنیف و تالیف ہوں- علامہ اقبالؔ نے مزید کہا کہ اس خطاب کو عطا کرتے وقت انھیں لاہور آنے کی زحمت نہ دیں' کیونکہ وہ ضعیف ہیں اور سفر میں زحمت ہو سکتی ہے' چنانچہ شمس العلما کا خطاب مولوی میر حسن کے فرزند کے سپرد کیا گیا-

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کو یہ خطاب اس وقت دیا گیا جب کہ خاص و عام ان خطابات کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے' علامہ کے بعض دوست بھی اسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے' چنانچہ لوگ اپنی فکر و ہمت کے پیمانوں پر علامہ کو تولنے لگے کہ اب اقبالؔ وہ نہیں رہیں گے- عبدالمجید سالک' مصنف ''ذکر اقبالؔ'' لکھتے ہیں اس خطاب پر احتجاج کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے کچھ معترضانہ اشعار لکھے اور مجلہ ''زمیندار'' میں شائع کیے جو زبان زد عام ہو گئے:

لو! مدرسہ علم ہوا قصر حکومت
افسوس! کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبالؔ
پہلے تو سر ملت بیضا کے تھے وہ تاج
اب اور سنو! تاج کے سر ہو گئے اقبالؔ
کہتا تھا یہ کل' ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ

سرکار کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبال

اقبال کے دوست جناب عبدالقادر گرامی حیدر آبادی جنھوں نے اقبال کے فارسی اشعار پر اصلاح دی' وہ بھی پہلے ناراض ہو گئے اور کہا:

کرد اقبال را حکومت سرد

عقل علامہ سوخت سوختہ بہ

لیکن چند سال بعد مطمئن ہو کر یہ اشعار لکھے اور اقبال کو سراہا:

ہر نکتہ علامہ وفا آہنگ است

ہر حرف کلید و حکمت فرہنگ است

اقبال کہ اقبال شد از جوہر علم

حاسد او او کند علاجش سنگ است

علامہ اپنے قدیم دوست میر غلام نیرنگ کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ قسم اللہ کی! جس کے ہاتھ میری جان اور آبرو ہے اور اس کے اس رسول اکرمﷺ کی' جس کے ارشادات سے میں خدا پر ایمان لایا اور مسلمان ہوا' دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر اقبال کی ظاہری زندگی مومنانہ نہیں' مگر اس کا قلب تو ہمیشہ کی طرح مومن رہے گا۔ اقبالیات کے محققین نے بھی یہ بات دلائل سے ثابت کر دی ہے کہ علامہ کے خطاب کو قبول کرنے کی مصلحت دفاعی عمل تھا' کیوں اس زمانے میں مسلمان عجیب افسردگی اور عقب ماندگی کا شکار ہو چکے تھے اور دوسری قومیں انگریز دوستی اور تعلیم کی تحصیل میں ترقی کر کے بہت آگے بڑھ چکی تھیں۔ حقیقت میں علامہ اقبال ان مسائل سے بہت دور رہتے تھے چنانچہ جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کو خط میں لکھا کہ آپ دانش گاہ ملی کی سرپرستی کو قبول کر کے اسے اپنی صحیح رہنمائی سے ترقی دیں' تو اقبال نے جواب میں لکھا کہ اگرچہ میں مسلمان قوم کی تعلیم کی شدت سے حمایت کرتا ہوں' لیکن میں ان رقابتوں اور فضول کشمکشوں میں کام انجام نہیں دے سکتا۔

اس موقعے پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض افراد غلط فہمی کا شکار ہو کر نوبل پرائز کے بارے میں ٹیگور اور اقبال کو ایک دوسرے کا حریف قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اقبال کو مسترد کر کے ٹیگور کو نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا نام کبھی رسمی طور پر نوبل کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ ٹیگور' اقبال سے ۱۸ سال

بڑے تھے اور ۱۴ نومبر ۱۹۱۳ء کو ٹیگور کو نوبل انعام مبلغ ایک لاکھ دس ہزار سکہ ہند عطا کیا گیا' جو ٹیگور کی کتاب ''گیتا نجلی'' کے انگریزی ترجمے اور ان کی سماجی خدمات کو پیش نظر رکھ کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کے مقام میں' نوبل انعام نہ ملنے سے' کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اگر ٹیگور کے پاس ذات اور انسانیت کے بارے میں گفتگو ہونے کی وجہ سے انھیں نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے' تو علامہ اقبالؔ کا کلام' جو کائنات اور رہنمائی انسانیت کے بیانات سے لبریز ہے' اس سے بھی اعلیٰ انعام کا حق دار ہو سکتا ہے۔ شمالی امریکہ کے مشہور شاعر' محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر عروج زیدی کے تین شعر' جو موصوف کی نظم ''اقبالؔ'' سے ہیں' ہم یہاں پیش کر کے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہیں:

''گیتا نجلی'' کی بزم کہاں اور تو کہاں
برگ حنا کا رنگ کہاں اور لہو کہاں
میخانہ رموز میں یہ ہائے ہو کہاں
انعام خسروی کی یہاں آبرو کہاں
ٹیگور کے پیام کی جو کائنات ہے
وہ ترے فکر و فن میں فقط اک بات ہے

☆......☆......☆

محسنِ شعر و ادب...... محسنؔ بھوپالی

گذشتہ چند دہائیوں میں اردو شعر و ادب میں، فکر و فن کی جو نئی صورتیں سامنے آئیں اور طرزِ بیان کے جو نئے زاویے پیدا ہوئے اور جن کا نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں نے اثر قبول کیا ہے، ان نئی صورتوں میں ایک جانی پہچانی صورت محسنؔ بھوپالی کی ہے- کہتے ہیں: فن کا منتہائے کمال، حیرت زائی ہے اور یہی حیرت زائی اور فکر و خیال کا ارتعاش، محسنؔ بھوپالی کے کلام کا کمال بنا- شاعری، شخصیت کا منہ بولتا روپ ہوتا ہے، چنانچہ شخصیت جتنی متین، سنجیدہ اور نفیس ہو گی، اس کا بولتا روپ بھی اسی قدر نفیس، متین اور سنجیدہ ہو گا- یعنی آئینہ شاعری، شاعر کی شخصیت کا بڑی حد تک انعکاس ہوتا ہے-

جناب عبدالرحمٰن محسنؔ بھوپالی کا جسمانی سفر بھوپال ہند سے شروع ہو کر، حیدر آباد سندھ سے ہوتا ہوا کراچی پہنچا ہے اور فکری ارتقائی سفر، مجموعہ کلام کی صورت میں ''شکستِ شب'' سے ''روشنی تو دیے کے اندر ہے'' تک پھیلا ہوا ہے، جس میں حرکت کے ساتھ ساتھ سفر بھی تیز تر ہے- ''شکست شب'' پہلا غزلوں اور مختصر نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں جناب محسنؔ بھوپالی نے فارسی ضرب المثل کے بموجب ''گربہ کشتن روزِ اول'' پہلے ہی دن تاریکیوں، ظلمتوں اور اندھیروں کو شکست دے کر اپنی نئی سحر کا اعلان کیا- دوسرا مشہور مجموعہ کلام ''جستہ جستہ'' چار مصرعوں کے قطعات پر مشتمل ہے، جو بذاتِ خود ایک شاہکار ہے- ''نظمانے'' چھوٹی چھوٹی نظموں پر مشتمل مجموعہ کلام ہے، جس میں کوئی بھی نظم گیارہ بارہ مصرعوں سے زیادہ نہیں ہے- اس کے علاوہ موصوف کی کئی مختلف تصانیف، مسافر نامے اور شعری کتابیں ہیں- تازہ ترین مجموعہ کلام ''روشنی تو دیے کے اندر ہے'' ہے-

ہر شاعر کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اشعار زبان زدِ عام ہوں، یعنی اس کے اشعار عوام کی زبان ہوں، لیکن یہ آرزو بڑے شعراء کی بھی پوری نہیں ہوتی، لیکن

بقول ڈاکٹر عروج زیدی' جو کینڈا کے مشہور ادیب و شاعر اور حلقہ ارباب قلم کے صدر ہیں:
جناب محسن بھوپالی وہ واحد شاعر دوراں ہیں' جن کے کئی اشعار لوگوں کا تکیہ کلام بن چکے ہیں' جس کی گواہی میں خود دے سکتا ہوں کہ میں جناب محسن بھوپالی سے آشنا ہونے سے پہلے موصوف کے اشعار سے مانوس تھا اور ہمیشہ فکری یادداشت میں محفوظ کیے ہوئے تھا۔
موجودہ معاشرہ پر چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

تلقین اعتماد' وہ فرما رہے ہیں آج
راہ طلب میں خود' جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

ایک اور مقام پر کس خوبصورتی سے اور کن خاص لفظوں میں سوال کرتے ہوئے' حادثہ وقت کے انجام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثہ وقت کو کیا نام دیا جائے
میخانہ کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

کیونکہ شاعری بعض مراحل پر پیغمبری بن جاتی ہے اور اپنی سنتی اقدار کو زندہ رکھتے ہوئے خیال سے خیال بنانے اور چراغ سے چراغ جلانے کی روایات کو باقی رکھتی ہے' چنانچہ اسی لیے اس شاہراہ کے رہگزار شعرا انھی قدیم راستوں پر فکر و خیال کے گلزار سجاتے ہوئے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں جنھیں بعض ناقدین ادب پتھر کی لکیر اور بعضے لکیر کے فقیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہرحال' دنیا کا مشاہدہ یہ ہے کہ جب بہتا ہوا پانی پہاڑوں کی عظمت سے گھبرا کر اسی کے دامن میں اپنا گھر بنا لیتا ہے' تو وہ خوشنما جھیل بن جاتا ہے' اور بقول غالب: دل کے بہلانے کا حسین خیال ہو جاتا ہے' لیکن جب پانی کا زور کسی مقام پر دریا کے دھارے کی صورت اختیار کر کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو روندتا ہوا آبشار کی صورت میں گر پڑتا ہے' تو اس کے زور و شور سے نہ صرف آنکھیں چکا چوند بلکہ اس کی طاقت سے شہر روشن اور بنجر زمین گلزار ہو جاتی ہے' اور دنیا پانی کی اس بغاوت کو ایک جرات مندانہ اقدام اور انقلاب کا نام دیتی ہے۔ بالکل اسی

طرح دنیائے ادب و شعر میں ہر دور نے چند ایسے شاعر پیدا کیے جنھوں نے ادب میں انقلاب کا پرچم علم کیا اور جن کی وجہ سے اصناف شاعری میں اضافہ ہوا اور گلشن شاعری میں نئے نئے رنگ کے پھول کھلے- ہمارا دور بھی ایسے نامور شعرا سے مزین ہے- جیسا کہ آپ جانتے ہیں' اردو شاعری میں پنّوں حضرت ضمیر جعفری کی ایجاد ہے' دوھا نگاری جمیل الدین عالی اور ثلاثی جناب حمایت علی شاعر کی اردو ادب کو دین ہے- اسی طرح صاحب جشن جناب محسؔن بھوپالی ''نظمانے'' کے موجد ہیں- میں ہمارے دور کے مشہور و معروف ادیب و ناقد جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے الفاظ جو انھوں نے اپنی کتاب ''اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' میں قلم بند کیے ہیں' پیش کر رہا ہوں' فرماتے ہیں: ''شعر و ادب کی دنیا میں ایجاد و احسان کا سلسلہ یک طرفہ نہیں ہوتا- مانا کہ محسؔن بھوپالی نظمانے کے موجد ہونے کے سبب ہمارے شعری عہد کے محسؔن ہیں- یقیناً انھوں نے نظمانے کے ذریعے اصناف سخن کے دامن کو وسیع تر کیا ہے' اس میں ایک نیا ستارہ ٹانکا ہے اور اس کی سج دھج میں اضافہ کیا ہے' لیکن محسؔن پر ہمارے عہد کا احسان یہ ہے کہ اس نے محسؔن کو پیدا کیا' اس لیے اگر وہ اپنا احسان ہمارے عہد پر جتانا بھی چاہیں تو ساحر کے لفظوں میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے' وہ لوٹا رہا ہوں میں

اور بے شک محسؔن بھوپالی نے ''شکستِ شب'' سے روشنی تو دیے کے اندر ہے' تک امانت داری سے یہ جواہر تجربات حوادث' اپنے زمانے کو لوٹایا ہے-

شغل و کسب کے لحاظ سے جناب محسؔن بھوپالی فیلڈ انجینئر ہے- ہمیشہ نئی نئی فکریں کبھی کینوس پر بکھیریں اور کبھی صفحۂ قرطاس پر- اب ''نظمانے'' کے موجد کا کرشمہ ملاحظہ کیجئے' کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا بڑے شاعر کا ادنیٰ کرشمہ ہے- ایک نظم بعنوان ''سات آسمان'' ملاحظہ کیجیے: قبل ازیں کہ میں نظم پیش کروں' مختصراً یہ کہ دوں کہ فارسی اور اردو شاعری میں آسمان کا موضوع اتنا ہی قدیم اور وسیع ہے' جتنا خود چرخِ پیر' اور انگریزی ادب میں اس کا مشابہ تصور موجود نہیں ہے' عربی شاعری میں ہوگا' مجھے عربی شاعری کا علم نہیں- بہرحال' شاعری کی دنیا میں آسماں کبھی سر پر رہا تو بقولِ اقبالؔ ''اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں'' تو کبھی معشوق کے پیروں کے نیچے بقولِ غالب ''کیا

آسماں کے بھی برابر نہیں ہوں میں"۔ بہرحال' آسماں کا موضوع ازل سے نہ حل ہوا ہے اور نہ جلد ہی حل ہو گا۔

جناب محسن بھوپالی کی نظم "سات آسمان" بحر متقارب فعولن فعولن فعولن میں کہی گئی ہے۔ یہ نظم سات مصرعوں پر مشتمل ہے اور سب مصرعے ایک رکنی ہیں' یعنی ہر مصرع صرف ایک لفظ' یعنی تمام نظم سات لفظوں پر مشتمل ہے' یا ہر لفظ ایک آسمان کی نیابت کرتا نظر آتا ہے' جیسے: تحیر' توہم' تخیل' تصور' تجسس' تیقن اور خدا۔ تمام الفاظ فعولن کے وزن پر ہیں اور خدا فعل پر ہے۔ ہر لفظ ایک کوزہ ہے' جس میں سمندر کو سمو دیا گیا ہے۔ تحیر یعنی حیرت سے تیقن یعنی یقین تک بندہ کی منزل ہے اور یقین کی منزل پر پہنچنے والا نفس مطمئنہ ہے' جس کے لیے قرآن نے یاَ نفسِ مطمئنہ کہ کر صدا دی' جو حضور اکرم ﷺ محمد عربی کی ذات ہے اور اس کے بعد ذاتِ اقدسِ خداوندی ہے۔

حضرات! ہر لفظ یا ہر آسمان پر بڑی دیر تک بات چیت ہو سکتی ہے' لیکن میں صرف یہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حیات و کائنات پر ایک فکر انگیز نظم' جو سات لفظوں پر لکھی جائے' اس کا سہرا جناب محسن بھوپالی کے سر ہے' اگرچہ کہ دوسری نظمیں' جس میں "ندامت' تیز حا سوال' دعوت ولیمہ' فرض شناس' پچھتاوا' دوسرا شکار" وغیرہ دل پسند نظمیں ہیں' جن کے مطالعے سے قارئین کو موصوف کی بلندیٔ فکر و فن کا احساس ہوتا ہے۔

اگرچہ دنیا کا ہر شخص مسافر و مہاجر ہوتا ہے' لیکن نہ جانے کیوں یہ نام صرف ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان کے معاشرے نے عطا کیا۔ بہرحال' اس عنوان کو نہ صرف جناب محسن بھوپالی نے پسند' کیا بلکہ اس کو اپنا شناختی کارڈ بنا لیا' چنانچہ آج بہت کم لوگ جناب عبدالرحمٰن سے اور بیشتر لوگ محسن بھوپالی سے واقف ہیں' اس بارے میں ایک نظم میں فرماتے ہیں:

تم محسن ہو
یہ تو ٹھیک ہے
لیکن تم یہ بھوپالی کیوں لکھتے ہو
اگر نہ لکھتا؟
آپ پوچھتے کہاں کے رہنے والے ہو
میں کہتا لڑھکانے کا

تم پھر کہتے
پاکستان میں آنے سے پہلے کون سے شہر میں رہتے تھے
میں کہتا
بھوپال
گھوما پھرا کر' مجھ کو جو بتلانا پڑتا
محسن کے ساتھ ہی لکھ رکھتا ہوں

میں اپنی تقریر کو محسن کے اس شعر پر تمام کرتا ہوں' جس میں انھوں نے زندگی کی مکمل عکاسی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

زیست' ہمسایہ سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

☆......☆......☆

پیروڈی کو بڑی ترقی ہوئی' کیوں کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی ترقی کرتی رہی تھی' چنانچہ آج کل مزاحیہ شعرا کسی خاص شخصیت یا کسی خاص معذوریت کو اپنا نشانہ نہیں بناتے' اگرچہ چند شعرا اس رکیک کام کو انجام دیتے ہوں تو ان کی تعداد بہت کم ہو گی۔

خالد نے اپنے متعدد قطعوں میں بعض مشہور جملوں' محاوروں اور مصرعوں پر تضمین کی ہیں' یا اسی بحر میں کہ کر اس کی پیروڈی کی ہے۔ تضمین صنعتِ لفظی میں شمار کی جاتی ہے۔ مشہور جملوں یا مصرعوں پر تضمین کرنا بڑے دل و جگر کی بات ہوتی ہے۔ اگر تضمین کا اچھوتا خیال محکم اور قوی نہ ہو تو پیروڈی بالکل ناکام ہو جاتی ہے اور شاعر کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے معروف مزاح اور طنز نگار شاعر سید محمد جعفری کو ان کے اصلاح مقصد' جاندار اسلوب اور رنگا رنگ موضوعات کی بنا پر اپنے عہد کا اکبر الہٰ آبادی قرار دیا ہے' اسی طرح خالد عرفان اور مرحوم دلاور فگار کے افکار' موضوعات' زبان کا رچاؤ اور مزاح و طنز کا امتزاج اتنا گھلا ملا ہے کہ ہم خالد عرفان کو اس اور آیندہ عہد کا دلاور فگار کہ سکتے ہیں۔ دلاور فگار ہی کی طرح خالد نے بھی مشہور چٹکلوں' محاوروں' طنزیہ فقروں اور دوسرے شعرا کے مصرعوں پر تضمین کی ہیں اور بڑے کامیاب نتائج برآمد کیے ہیں۔ ذیل کے قطعے میں علامہ اقبال کے نصف مشہور مصرع سے بڑے پر معانی اور طنزیہ طور پر استفادہ کیا گیا ہے:

کلام شاعرِ مشرق پولس والوں نے سمجھا ہے
جنھیں یہ بھی نہیں معلوم' مجرم کا پتا کیا ہے
پکڑ کر ایک ڈاکو کو پولس والوں نے یہ پوچھا
مرے حصے کے بارے میں بتا تیری رضا کیا ہے

اکبر الہٰ آبادی اردو ادب کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری میں انگریزی الفاظ' انگریزی اصطلاحات اس خوبی سے نظم کیے کہ وہ اردو ہی کے الفاظ بن کر رہ گئے۔ اکبر کی اس سنت کو ان کے مقلدوں نے بیسویں صدی میں نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کو پروان چڑھایا' چنانچہ بیسویں صدی کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو گا' جس نے یہ کام نہ کیا ہو۔ موجودہ دور کے مشہور مزاح نگار شاعر مرحوم دلاور فگار نے اس سنت پر عمل کیا اور اب ان کے رشید شاگرد خالد عرفان اس میدان میں ریاضت کرتے ہوئے نظر

آتے ہیں- ذیل کے قطعات میں صرف ایک حرف کی تبدیلی یعنی لیگ سے لیک، ملک سے مسلک اور ایڈز سے ایڈ کر کے جو خوبصورت مزاح اور تیز طنز پیدا کیا ہے، وہ قابل تحسین و آفرین ہے:

سیاسی کارکن بھی شامل تحریک ہوتے ہیں
الیکشن جب بھی اپنے ملک میں نزدیک ہوتے ہیں
نہ جانے کیوں وہ مسلم لیگ میں جا کر نکل آئے
یہ کیسی لیگ ہے جس میں سے مسلم، لیک ہوتے ہیں

بحری مشاعرے کا ہوا ہے جو انعقاد
یہ رسم یہ رواج کسی شہر میں نہیں
مسلک میں جو عروض کی مسلیک ہو گئی
شاعر تو بحر میں ہے، غزل بحر میں نہیں

گوروں کی دوستی نہ کبھی کام آ سکی
دیکھا ہے اپنی قوم نے کردار اوکلی
اپنے وجود پر جو کیا، ہم نے انحصار
ظالم نے ایڈز بھیج دیا، ایڈ روک لی

خالد کی مزاحیہ شاعری کا ایک اہم پہلو معاشرے کی گرتی ہوئی حالت اور حکمرانوں کی بددیانتی اور خود غرضی کو ظاہر کرتا ہے- خالد درباری مزاج یا سلطانی گنبد کا کبوتر نہیں- خالد کی شاعری آنسوؤں اور درد کی شاعری ہے، کیوں کہ بقول بابائے ظرافت حضرت ضمیر جعفری: ''مزاحیہ اشعار درحقیقت مسکراتے ہوئے آنسو ہیں''-

مضمون کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم صرف چند اشعار کو اس ذیل میں رقم کر کے اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں:

گھوڑا یہ کہہ رہا تھا انسان رہنما ہے
اے رہبر سیاست! راہ عمل میں آ جا
گر منتخب حکومت، تجھ سے نہ چل رہی ہو
میں کیبنٹ میں آؤں، تو اصطبل میں آ جا

نہ جانے کون سے لیڈر کے اختیار میں ہے

ابھی ہے جانب منزل کے رہ گزار میں ہے
کسی کا عقد رکا ہے، کسی کی سالگرہ
تمام قوم دھماکے کے انتظار میں ہے
سیاست آج کل مضبوط قلعہ ہے، حفاظت کا
جہاں ہر حال میں کچھ رہنما محفوظ رہتے ہیں
کبھی ڈاکو بھی ہو جاتے ہیں داخل اس احاطے میں
مگر ان کے حقوق داخلہ محفوظ ہوتے ہیں

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

☆......☆......☆

صداقتوں کا شاعر...... قتیلؔ شفائی

خواتین و حضرات! السلام علیکم! یقیناً لانگ آئی لینڈ کی یہ رنگین شام یادگار رہے گی جو بیادِ علامہ اقبالؔ سجائی گئی ہے اور جس میں اردو ادب کے عظیم شاعر جناب قتیلؔ شفائی کی علمی، ادبی، شعری اور سماجی خدمات کو کسی حد تک پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کسی بھی شخصیت کا اعتراف اور اس کے محاسن کا احتساب، جو چند دہائیوں کی محبت، محنت اور مشقت پر مشتمل ہوا سے چند ثانیوں میں بیان کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، لیکن بہرحال اگر دریا کا خوشگوار پانی پورا کھینچا ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سجانا چاہیے جس سے کسی حد تک رفعِ تشنگی ہو سکے۔ زندہ قوموں کی ایک شناخت اس قوم کے فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کی خدمات سے وابستگی اور شناسائی ہے، چنانچہ شعر و سخن کی حکایات، جس میں خیال سے خیال بنانے اور چراغ سے چراغ جلانے کی روایات شامل ہیں، ہمیں جشنِ قتیلؔ شفائی منانے کی مبارکباد پیش کر رہی ہیں۔ حضرت ضمیر جعفری، جناب راغب مراد آبادی، جناب حمایت علی شاعر اور دیگر عظیم شعرا کی موجودگی میں گفتگو "یاں جنبشِ لب خارج از آہنگِ خطا است" کا مصداق بن جاتی ہے۔ صوبہ سرحد میں پیدا ہونے والے اس سپوت کو ماں باپ نے اورنگ زیب خان کے نام سے منسوب کیا، جو بہت جلد ہی اورنگِ شاعری کی پازیب بن گیا اور جس کے نغموں کی جھنکار معاشرے میں ہونے والے قتل و سازش کی آواز بن گئی اور خود شاہدِ قتل قتیلؔ شفائی ہو گئے۔

جناب قتیلؔ شفائی کی شاعری ایک ایسے گلدستے کی مانند ہے جس میں ہر صنف کا پھول ایک خاص انداز سے سجایا گیا ہے اور جو شخص جس زاویہ سے دیکھے، اسے اسی رنگ کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے کسی نے انھیں گیتوں کا، کسی نے غزلوں کا اور کسی نے رومانی جذبوں کا شاعر قلمبند کیا، لیکن میری حقیر نظر میں جناب قتیلؔ شفائی کا ایک بڑا کارنامہ، پُر تلاطم طوفان میں اردو شاعری کی کشتی کو غرق ہونے سے بچانا تھا، جس میں وہ

بالکل کامیاب رہے۔ موصوف نے فلمی گیتوں کو رومانی احساس کے ساتھ ساتھ شعر وسخن کے زیور سے سجایا اور فلمی گیت کا معیار مختص کیا' کیونکہ یہی ایک ایسا عمومی اور عوامی پلیٹ فارم تھا جس پر نوجوان نسل کو شعر وسخن کی گراں قدروں سے روشناس کیا جا سکتا تھا۔

میرا سخن شناس' سخن فہم' سخن نواز اور سخن داں مجمع قتیل شفائی سے واقف ہے' اگر چہ ہمارے سامعین سب شاعر نہیں' لیکن شعریت سے متاثر ہیں اور یہی اثر کی کشش سے یہاں پر موجود ہیں' کیونکہ جناب قتیل شفائی کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور جو ہماری دسترس میں ہیں اور سب پر تبصرہ ممکن نہیں' اس لیے میں صرف موصوف کے اس زاویہ فکر وخیال پر چند لمحے صرف کرنا چاہتا ہوں' جو تمام شعرا نے محسوس کیا' لیکن بہت کم سخنوروں نے صفحۂ تحریر پر رقم کیا۔ خواتین وحضرات! کسی بھی شخصیت میں عیبوں کا ڈھونڈنا خود عیب بزرگ اور معیوبی ہے اور ہم شاعروں کے مسلک حافظ شیرازی میں کافری ہے' لیکن جب عیب ہنر بن جائے اور سماج اسے ہنر اور افتخار سمجھ کر دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا جائز سمجھے اور اس طلسمِ باطل کو کوئی شاعر قلم کی قدرت سے توڑ دے' تو وہ شاعری بقولِ اقبالؔ: پیغمبری بن جاتی ہے۔ جناب قتیل شفائی نے آمریت' زمینداری' جبر و استبداد کی تنگی رسومات' جن میں سکوں کی جھنکار سے غریب بدنوں کی خریداری' مفلس لوگوں کی عزت کی رسوائی' امیروں کی چوکھٹ پر فنکاروں کی جبیں سائی' دہقاں کی ناموس کی ہرجائی کے خلاف جب طائرِ خیال کو آسمان برصغیر میں آزاد کیا تو اس نقاب کشائی کے عوض انھیں اپنے اس مجموعہ خیال ''مطربہ'' پر آدم جی انعام عطا کیا گیا' جو دوسرے امتیازات کے ساتھ آئینۂ فکر بنا۔

اس فکرِ سخن میں طوائف کے موضوع پر نئی نوعیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر چہ مختلف نظمیں مختلف عنوان کے تحت لکھی گئی ہیں' لیکن یہ ایک سیل رواں ہے' جو صرف ایک ہی ہدف کی طرف گامزن ہے۔ صرف چند اشعار اس مجموعے سے پیش کر کے زحمت تمام کروں گا:

اس بازار کا جو کوٹھا ہے
اس کی ریت نرالی ہے
یہاں تو ماں کو ماں کہہ دینا
سب سے گندی گالی ہے

ممتا کے ہونٹوں پر جب چاندی کی مہریں لگتی ہیں
ماں خود اپنی بیٹی کو کر دیتی ہے قربان یہاں
جھلمل کرتی پوشاکوں سے چاہے بدبو آتی ہے
خود جل کر محفل کو خوشبو دیتا ہے لوبان
دیکھ بیٹا! یہ تیرے ہی فائدے کی بات ہے
اس طرح محدود ہو جانے سے تو انکار کر
جو بھی اپنی جیب کھنکائے' اسی سے پیار کر
تیری پرنانی' خدا بخشے! بڑی ہوشیار تھیں
ایک دو کیا' وہ تو سارے شہر کی دلدار تھیں
تیرے دل میں ہے اگر کچھ اپنے بچوں کا خیال
اپنے پیشے کو وفاداری کے جھنجٹ میں نہ ڈال
میں اک ایسی دلہن کو جانتا ہوں
کوئی بابل نہ جس کی ساس' نند
جس کا غیروں کے ساتھ جی بہلے
بن چکی ہے جو ماں تیموں کی
رخصتی کی سوم سے پہلے
میں اک ایسی دلہن کو جانتا ہوں

معصوم آواز-

امی! پیاری پیاری امی! یہ تو مجھے بتلا دو نا
تم مری کیا لگتی ہو؟
ماں ہوتیں تو مجھ کو تنہا چھوڑ کر لمبی راتوں میں
دیر دیر تک' مجھ سے دور نہ تم رہتیں
پھر تم کیا ہو امی! اتنا تو سمجھا دو نا
باپ کا نام تو پھر مجھ کو بتلا دینا

وہ عجیب عورت ہے

اس کے دلربا نغمے چار سو بکھرتے ہیں
لوگ اس کے نغموں کی دلکشی پہ مرتے ہیں
بیویوں سے چھپ چھپ کر عرض شوق کرتے ہیں
پیار بھی جتاتے ہیں، پھبتیں لگاتے ہیں
منزلوں پہ سب جس کا انتظار کرتے ہیں
وہ عجیب عورت ہے

اے مری جان طرب
مجھے خبر ہے کہ ہر شام تیرے ہونٹوں نے
ہزار گیت بکھیرے ہیں اہل زر کے لیے
مجھے خبر ہے کہ مہکا ہوا بدن ترا
بنا ہے دعوتِ نظارہ ہر نظر کے لیے
برا نہ مانے تو کہ دوں، خدا کے گھر کی طرح
کھلا رہا ہے ترا در بھی ہر بشر کے لیے
سانولی سی اک عورت
ابھرے ابھرے ہونٹ ہیں اس کے، کھلتے سرخ گلاب
اس کی رنگت مستقبل کا دھندلا دھندلا خواب
اس کے نغموں کی لے پر بہتا ہے مست چناب
اس کی چال چکوروں جیسی، اس کا بدن کمخواب
اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے، وہ میرا انجام
سانولی سی اک عورت ہے، جس کا مردوں جیسا نام

رقص کر

لوٹتے ہیں مال یہ جتنا، خدا کے نام پر
سب لٹا دیتے ہیں آخر گیسوؤں کی شام پر
لیکن اب یہ گیسوؤں کی شام ڈھل جانے کو ہے
اک چھری ان کے کلیجے پر بھی چل جانے کو ہے
اب یہ محفل بن رہی ہے بزمِ ماتم، رقص کر!
رقص کر! اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم، رقص کر!
تیرے چہرے پر اب تک نہ سہرا بندھا
تیرے ہاتھوں میں اب تک نہ مہندی رچی
شہر بھر کی ہے تو، بن بیاہی دلھن
بن بیاہے تیری دھوم گھر گھر مچی
تو کبھی جاہلوں کو پسند آ گئی
تو کبھی احمقوں کی نظر میں جچی

سترھواں سنگار

پیٹ پہ کھجلی، منہ پر دانہ، واہ ترا کیا کہنا ہے
کیوں شرمائے، کیوں گھبرائے، یہ دکھ ہنس کر سہنا ہے
پیاری بٹیٔ یہی مرض تو اس پیشے کا گہنا ہے

بھول

اصل میں کچھ بھی نہیں، سلسلہ نام و نسب
وہی اچھا ہے یہاں، جس کا ضمیر اچھا ہے
جو کسی کو نہیں حاصل، وہ ہے مجھ کو حاصل

بادشاہوں سے کہیں، مجھ سا فقیر اچھا ہے

لمحوں کی پرستار

میں نے چاہا تھا' اسے دل میں چھپا لوں ایسے
جسم میں جیسے لہو، سیپ میں جیسے موتی
میں اسے لے کے بہت دور نکل جاؤں، مگر
وہ مری راہ میں دیوار بنی بیٹھی ہے
میری آنکھوں نے جسے پھول سے نازک سمجھا
اب وہ چلتی ہوئی تلوار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

میں آخر میں اپنی گفتگو کو قتیل شفائی کے اس شعر پر تمام کرتا ہوں:

دنیا میں قتیل' اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے' بغاوت نہیں کرتا

☆......☆......☆

گلدستہ شہادت عظمیٰ

یعنی

اردو ادب کے عظیم اور نامور پچاس شعرا کا نذرانہ عقیدت

سید الشہدا' معنی ذبح عظیم' شہید اعظم حضرت امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ سے متاثر ہو کر بلا تفریق مذہب و ملت' شعرا نے جو منظوم کلام پیش کیا ہے' اسے دریائے بے بہا و بیکراں سے چند گہر گراں قیمت پیش کیے جا رہے ہیں۔ متقدمین' متوسطین' متاخرین اور جدید شعرا کو ترتیب زمانی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے:

محمد قلی قطب شاہ معانی

چاند سورج روشنی پایا تمھارے نور سے
آب کوثر کو شرف بخشا تمھارے پور سے

ملک الشعرا سید وجہی

حسین کا غم کرو عزیزاں
انجونین سو جھڑو عزیزاں
(آنسو) (آنکھ) (سے)
حسین پو (پہ) یاراں درود بھیجو
کہ دین کا یوں دیوا (دیا) جلایا

ولی دکنی

اس پاک پارسا پر' حیدرؑ کے دل ربا پر
اس گل بے بہا پر' بولو سلام' یاراں

یوجی ولی فدا کر، اس شاہ کربلا پ
اس لائق ثنا پ، بولو سلام یاراں

علی عادل شاہ

عاشور کا سن کر ندا، ہر شی کرے ماتم سدا
حیراں ہوئے شاہ و گدا، تج غم میں رو رو یا امام

درگاہ قلی

کہیں فریاد کر خاتونِ جنت
خداوند ہوئی ہے کیا مصیبت
تڑپتی خاک میں احمدؐ کی عترت
قیامت ہے، قیامت ہے، قیامت

شاہ عالم ثانی

شمس و قمر، زہرہ و عطارد، مشتری اور مریخ، زحل
رو رو پکارے، ہائے سما پر سارے ستارے، لیجو سلام!

غلام حسین ضاحک

غریب بے کس، شہید بے بس، ستم رسیدہ، چہ غم کشیدہ
ذبیح کی بے بسی کے اوپر، درود واجب، سلام سنت

مرزا رفیع سودا

نہیں ہے بے وجہ کچھ یہ حالت، خبر لو جلدی کہ آج کوئی
ہوا ہے، پیاسا، ستم کے خنجر سے ذبح، دریا کے جا کنارے
حسین! تجھ کو یہ عرش بریں، کرے ہے سلام
وہاں سے آن کے روح الامیں، کرے ہے سلام

میر تقی میر

اے سبط مصطفیؐ کے، تجھ کو سلام پہنچے
اے جان مرتضیٰؑ کے، تجھ کو سلام پہنچے
بیٹے، بھتیجے، پیارے، یار و رفیق سارے
ساقی کوثر آ گئے، کیا تشنہ لب سدھارے

تو تشنہ کام و تنہا، یہ رنج یہ مصیبت
اے مبتلا بلا کے! تجھ کو سلام پہنچے

غلام ہمدانی مصحفی

سلامی دیکھ امامِ زماں کے تن کی طرف
پھر اس کے بعد لہو ڈوبے پیرہن کی طرف
نہ بیٹھ جائے یہ شیعوں کے شور و شیون سے
رہے ہے دھیان مرا گنبدِ کہن کی طرف

شیخ امام بخش ناسخ

سال بھر ناسخ! غمِ شاہِ شہیداں کیجیے
ہر مہینے کے عوض ماہِ محرم چاہیے
گر نہ ہوتا سرخ رو اشکِ غمِ شبیرؑ سے
حشر میں کس منہ سے ناسخ! میں شفاعت مانگتا

خواجہ حیدر علی آتش

دشمن ہو جو حسینؑ علیہ السلام کا
آتش! نہ کم سمجھ اسے ابنِ زیاد سے

یوسف علی خان ناظم

نیزے پہ چڑھایا ہے سرِ سبطِ نبیؐ کو
یا حضرتِ عباسؑ علمدار! کہاں ہو
کیوں کر سنیں شبیرؑ ان اشعار کو ناظم!
فردوس میں داؤدؑ اگر مرثیہ خواں ہو

میاں دھنو لعل دلگیر

بھری لاش پسرِ شہ سے چھپائی نہ گئی
بانو کے روبرو کچھ بات بنائی نہ گئی
کوئی شبیرؑ سا مظلوم نہ ہوگا، نہ ہوا
قبر بھی جس کی کئی روز بنائی نہ گئی

میر مستحسن خلیق

سینوں میں قدسیوں کے جگر کانپنے لگے
جب نالۂ حسینؑ سوئے آسماں گیا
رو کر یہ بعد حضرت حرؑ کہتے تھے حسینؑ
گھر سے نبیؐ کے تشنہ دہنؑ مہماں گیا

میر جعفر فصیح

جو کرے سلام بصد ادبؑ شہ تشنہ لب کی جناب میں
تو بروز حشرؑ عجب نہیں کہ رواں ہو شہ کی رکاب میں

حکیم مومن خاں مومن

روتا ہوں حسینؑ ابن علیؑ کے غم میں
ہے عیشِ جناں کی آہؑ اس ماتم میں
حیف! آلِ نبیؐ میں کوئی باقی نہ رہا
لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

میاں ابراہیم ذوق

سبطین نبیؐ یعنی حسنؑ اور حسینؑ
زہراؑ و علیؑ کے دونوں وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لیے
اے ذوقؔ لگا آنکھوں سے ان کی نعلین

بہادر شاہ ظفر

سلام امام کا کہ پڑھ کے صبح و شام نماز
تو اے سلامی! ادا کر نہ بے سلام نماز
نہ ہووے دل میں جو حب نبیؐ و آلِ نبیؐ
تو کام آئے نہ روزہؑ نہ آئے کام نماز
جو اس امامؑ کا ہے دوستؑ ہے خدا کا دوست
قبول ہوتی ہے اس کی علی الدوام نماز

اسد اللہ خان غالب

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو

تو پھر کہیں کہ کچھ اس کے سوا کہیں اس کو
کفیل بخشش امت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علی سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ مانیے گر ہم برا کہیں اس کو

میر انیس

آفتاب فلک عزو شرافت ہے حسینؑ
در تابندہ دریائے امامت ہے حسینؑ
وارث تیغ شہنشاہ ولایت ہے حسینؑ
حامیٔ حشر ہے، مختار شفاعت ہے حسینؑ

مرزا دبیر

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
سب اک طرف، چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

Dr. SYED SHUJAUT ALI
RESEARCH GUIDE in URDU,
S.R.T. MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431606

نواب واجد علی شاہ

ہے ہے مدام بوسہ گہہ مصطفیؐ جو ہو
ایسا گلہ ہو شمر کی شمشیر کے لیے

داغ دہلوی

محب آل محمدؐ محب حق ہو گا

یہ مشتہر ہے نبی کا کلام چار طرف
رہے گا حشر تک اے داغؔ! ربع مسکوں میں
غم حسینؑ علیہ السلام چار طرف

امیرؔ مینائی

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے
کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے
کافر ہوئے کہ کعبہ دیں کو کیا خراب
مرتد ہوئے کہ قبلہ ایماں سے پھر گئے

تعشقؔ

آ جاتی ہیں زلفیں جو رخ سروِ دیں پر
دو چار گھڑی چھاؤں ہے دو چار گھڑی دھوپ

مہدی مجروحؔ

باپ جس کا ہو ساقی کوثر
اس کی اولاد پانی کو ترسے
اے فلک! تشنہ ہیں امام حسینؑ
اور نہ اک بوند پانی کی برسے

نواب محبوب علی آصفؔ

فدا ہوں اس پہ سلامیؔ ہے جس کا نام حسینؑ
مرا معین مرا آقا مرا امام حسینؑ
صبا کو بھیج کے روضہ پہ کر رہا ہوں دعا
کریں قبول الٰہی مرا سلام حسینؑ

محمد علی جوہرؔ

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کشن پرشاد شادؔ

فنا میں تھا بقا کا مرتبہ حاصل شہیدوں کو

وہاں اس پر عمل تھا' موت سے پہلے ہی مر جانا
یہاں کا زندہ رہنا موت سے بدتر سمجھتا ہوں
حیات جاوداں ہے کربلا میں جا کے مر جانا

علامہ اقبال

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ' ابتدا ہے اسماعیلؑ
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے' فقط اندوہ و دلگیری

مولانا ظفر علی خان

چڑھ جائے' کٹ کے سر ترا' نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

فیض احمد فیض

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے' آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں' وہ منکرِ دیں ہے

وشوناتھ ماتھر

اگر غم اور غم خواری نہ ہوتی
حسینؑ! اتنی تو بیداری نہ ہوتی
سمجھتا کون مفہومِ شہادت
اگر تری عزاداری نہ ہوتی

سیماب اکبر آبادی

سیماب نظر آتی ہے مجھے ہر چیز اداس اور افسردہ
فطرت غمگیں ہو جاتی ہے' جب ماہِ محرم آتا ہے

بنارس لعل ورما

لوگ اب عقل کے قائل ہیں' نہ تدبیر کے ہیں
حر کی تقدیر کے یا پھر میری تقدیر کے ہیں
آگ دوزخ کی جلائے گی مجھے کیا ورما!

میرے سینے پہ نشاں، ماتمِ شبیرؑ کے ہیں

نجم آفندی

عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

حفیظ جالندھری

حسینؑ! اس حسنِ صورت کا نشاں خوبصورت ہے
ہمیں بھی غلبہ کفار میں جس کی ضرورت ہے

میر عثمان علی خان

مے حبِ علیؑ میں رات دن ہم مست رہتے ہیں
نہ خم سے ہے غرض ہم کو، نہ شیشے سے، نہ ساغر سے
وہ ہیں اشکِ عزا اپنے، بدولت جن کی اے عثمان!
چکھایا ساقیٔ کوثر نے ہم کو جامِ کوثر سے

شہید یار جنگ

کبھی کبھی جو میں شب میں سلام لکھتا ہوں
تو لفظ لفظ بہ حکمِ امامؑ لکھتا ہوں

محشر بدایونی

اشارہ کرتے، جگر گوشۂ رسولؐ اگر
مجال تھی کہ نہ آتا سلام کو پانی
ترستے کیا شہِ عالی مقام پانی کو
ترس گیا شہِ عالی مقام کو پانی

جوش ملیح آبادی

کیا ؟؟ شاہ تھی، ارکان ایمانی کے ساتھ
دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدہ میں، پیشانی کے ساتھ
اہل بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی!
ہاں! ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ

شورش کشمیری

جن ظالموں نے ظلم کیا اہل بیت پر
قہر خدا سے ان کو بچایا نہ جائے گا
سن لیں میری طرف سے یزیدان عصر نو
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

نسیم امروہی

جو انقلاب عالم فطرت تھا، وہ حسینؑ
جو سرفروش حق و صداقت تھا، وہ حسینؑ
جو فاتح جہان شہادت تھا، وہ حسینؑ
جو محرم ضمیر مشیت تھا، وہ حسینؑ

جگن ناتھ آزاد

بے مثل، بے عدیل شہادت، یہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو اصل عبادت، یہی تو ہے

احمد ندیم قاسمی

کیا قیامت ہے کہ کلیوں سے بھی کم سن بچے
چہرے ماؤں کے تکے جاتے ہیں حیراں حیراں

امید فاضلی

نبیؐ کا علم، علیؑ کا عمل، ذبیحؑ کا خواب
سمجھ لیا تو سمجھ میں حسینؑ آئے ہیں

رادھا کرشن مغموم

دیکھتا ہوں دل کے آئینہ میں تصویر حسینؑ
روشنی بخش چراغ جاں ہے تنویر حسینؑ
اس طرف سادات غازی، مرد میداں، سرفروش
اس طرف ناحق شناس و ناسپاس و کینہ کوش

یوگیندر پال صابر

تیر و شمشیر نہیں نقش و نگار اسلام

صبر شبیرؑ میں ہے اصل وقار اسلام
دوشِ احمدؐ کی سواری کا عوض شہ نے دیا
اپنے کاندھوں پہ اٹھائے رہے بار اسلام

سید ضمیر جعفری

حسینؑ اک عشق' جو ایمان کی بنیاد ہو جائے
حسینؑ اک حسن ہے' جس سے چمن ایجاد ہو جائے
حسینؑ اک روشنی' جس کی ضیا مدھم نہیں ہوتی
حسینؑ اک زندگی' جس کی حرارت کم نہیں ہوتی

منیر نیازی

جتنا شعارِ محتسب دشوار تر ہوتا گیا
اتنا ہی ذکرِ خونِ ناحق مشتہر ہوتا گیا
خوابِ جمالِ عشق کی تعبیر ہے حسینؑ
شامِ ملالِ عشق کی تصویر ہے حسینؑ

☆......☆......☆

نائک امیر خسرو اور علم موسیقی

موسیقی ایک لطیف اور نازک فن ہے۔ یہ علم دنیا کے قدیم ترین علموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرے علوم کی طرح علم موسیقی بھی ارتقا اور تکامل کی طرف گامزن ہے۔ شہنشاہوں کے دربار ہوں کہ فقیروں کی خانقاہیں' کافروں کے بت کدے ہوں کہ مومنوں کی مسجدیں' رزم ہو کہ بزم' شادی ہو کہ غم' ولادت ہو کہ وفات' مرد ہو کہ زن' بچہ ہو کہ بڈھا' امیر ہو کہ غریب' زاہد ہو کہ رند وغیرہ' بہرحال ہر زمان و مکان میں افراد اس علم سے وابستہ رہے اور وابستہ رہیں گے۔

موسیقی دراصل شاعری کی طرح انسانی لطیف جذبات کی ترجمانی ہے۔ موسیقی کو اس جدید دور میں انسان کی روح و بدن کی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ موسیقی سے نہ صرف انسان بلکہ حیوانات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب لوگ قافلوں کی شکل میں مسافرت کرتے تھے' اس وقت کاروان میں ایک شخص خوش لحن آواز میں گیت گاتا تھا' جس کو حدی خوان کہتے تھے اور جس کی آواز سن کر کاروان کے جانور مسحور ہو جاتے تھے اور اپنی تھکن بھول جاتے تھے اور تیزی سے چلنے لگتے۔ بعض قدیم موسیقی دانوں نے ایسی راگیں بنائی تھیں کہ جن سے جانور مسحور ہو جاتے اور شکار کر لیے جاتے۔ ''مراۃ المصطلحات'' میں آنند رام نے جہانگیر کے شکار کا واقعہ بیان کیا ہے' جس میں راگوں کو سن کر حیوانات مسحور ہو گئے اور گویوں کے اطراف جمع ہو گئے' جنھیں دیکھ کر ملکہ نور جہاں کی زبان سے امیر خسرو کا شعر نکلا تھا:

ہم آہوانِ صحرا سر خود نہاد بر کف
بہ امید آں کہ روزی بشکار خواہی آمد

ہندوستانی موسیقی کی نسبت یونانی' عربی اور فارسی موسیقی معمولی اور سادہ ہے۔

عربی اور فارسی موسیقی دراصل قدیم ساسانی موسیقی سے اخذ کی گئی ہے۔ یونانی موسیقی کی طرح عربی اور فارسی موسیقی کو بھی بارہ راگوں میں تقسیم کیا گیا' جو بارہ فرضی برجوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ فارسی موسیقی میں باربد اور نکیسا آج تک موسیقی میں مشہور ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ علم موسیقی کو جتنا فروغ ہندوستان میں حاصل ہوا اور کسی جگہ پر نصیب نہ ہوا' اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندو دھرم میں موسیقی' مذہب کا جزو شمار کی جاتی ہے' اگرچہ تمام مذاہب دنیا' موسیقی کو یا اس کی راگوں اور راگنیوں کو کسی نہ کسی طرح ضرور اہمیت دیتے ہیں' خواہ وہ قرآن کی قرات ہو یا حمد یہ' نعتیہ یا مرثیہ' بہرحال ترنم اور خوش لحنی ایک قسم کی راگ ہے جو موسیقی کا جزو ہے۔ کلیسا کے گھنٹوں' پادری کے خطبوں' دیوار گریہ کے جملوں اور بتکدے کے ناقوس میں موسیقی کے راگ چھپے ہوئے ہیں اور یہی موسیقی ان کے اثر کو دوبالا کرتی ہے۔

سمندر کا زور' آبشار کا شور' ہواؤں کا دور' پرندوں کی چہچہاہٹ وغیرہ سب کچھ اس لیے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہیں کہ ان میں موسیقیت سمائی ہوئی ہے۔ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاعری بذات خود راگ اور شاعری کے الفاظ' موسیقی کے تار کے مانند ہوتے ہیں۔ اسی راگ یا Rhythm سے شاعری میں غنائیت اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ ہر حرف اور ہر لفظ کے اندر ایک خاص غنائیت پوشیدہ ہوتی ہے' جس کو Organic Rhythm کہتے ہیں' چنانچہ اس لیے بعض اشعار میں غنایت بلا کی ہوتی ہے' کیونکہ ان اشعار میں لفظوں کو خاص انداز سے شعر کی مالا میں پرویا جاتا ہے' جس کی وجہ سے اس موسیقی کا اثر دوبالا یا دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

چار سو سالہ قدیم کتاب ''تذکرہ میخانہ'' میں ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو موسیقی میں مہارت تمام رکھتے تھے۔ ملا کہتے ہیں کہ ایک دن ایک موسیقار نے یہ بحث کی کہ علم موسیقی' علم شاعری سے مشکل فن ہے اور موسیقی شاعری سے بلند ہے' اس کا جواب خسرو نے قطعے کی صورت میں یوں دیا:

مطربی میگفت با خسرو کہ ای گنج سخن

علم موسیقی ز جنس نظم نیکو تر بود
ز آنکہ آن علمیت کز وقت نیابدہ قلم
وین نہ دشوار ست کاندر کاغذ و دفتر بود
پا سخش دادم کہ من در ہر دو معنی کاملم
ہر دو را سنجیدہ بر وزنی کہ آن در خور بود
فرق من گویم میان ہر دو معقول، و درست
گر وحد انصاف آن کز ہر دو دانشور بود
نظم را علمی تصور کن بنفس خود تمام
کونہ محتاج اصول و صورت خنیا گر بود
گر کسی بی زیر و بم نظمی فرو خواند روا ست
نی بہ معنی ہیچ نقصان نی بہ نظم اندر بود
نظم را حاصل عروسی دان و نغمہ زیورشس
نیست عیبی گر عروس خوب بی زیور بود

یعنی: خسرو نے کہا کہ اے موسیقار! میں شاعری اور موسیقی: دونوں میں کامل ہوں اور جان لے کہ نظم دلہن اور موسیقی' زیور کے مانند ہے اور کوئی عیب نہیں اگر دلہن خوب بغیر زیور کے رہے۔

اسے زمانے کی ستم ظریفی کہیے یا کوتاہ نگری کہ البیرونی جیسے مورخ نے اپنی ''کتاب الہند'' میں ہندوستانی موسیقی کا ذکر تک کرنا گوارا نہیں کیا' جبکہ ہندوستانی موسیقی' یونانی' عربی اور فارسی موسیقی سے بالا و برتر تھی۔ امیر خسرو پہلے مسلمان تھے جنھوں نے یونانی' عربی اور فارسی راگوں کو ہندی راگوں سے جوڑ توڑ دے کر نئی راگیں اختراع کیں۔ ہندوستانی موسیقی میں ایک ایسی جان ڈالی کہ دنیاے موسیقی انھیں کبھی بھلا نہیں سکتی۔ امیر خسرو کو موسیقی میں وہ کمال حاصل ہو گیا تھا کہ انھیں نائک کا خطاب عطا کیا گیا تھا' جو آج سات سو سال گذرنے کے بعد بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

امیر خسروؔ کے ہم عصر ہندوستان کا مشہور موسیقار اور گویا نائک گوپال تھا جس کی شہرت کا چرچا سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا- اس کے بارہ سو سے زیادہ شاگرد تھے' جو اس کو تخت پر بیٹھا کر اپنے کاندھوں پر لے جاتے تھے-

آنند رام کی ''مراۃ المصطلحات'' اور عالمگیر دور کے سیف خان کی ''درپن'' جو قدیم موسیقی کی کتاب ''مانک سوحل'' کا فارسی ترجمہ ہے' اس میں تفصیل سے لکھا ہے کہ نائک گوپال اور امیر خسروؔ کے موسیقی کے مقابلے میں امیر خسروؔ نے نائک گوپال کو لاجواب اور مبہوت کر دیا-

عظیم شعرا نے راگوں کو اشعار میں نظم کیا ہے- مولانا نظامیؔ نے ''خسرو و شریں'' میں بار بید کے تیس راگوں کے نام دیے ہیں' جو یہ ہیں:

۱- گنج بار آورد	۲- گنج گاو	۳- گنج سوختہ	۴- شادروان مروارید
۵- تخت طاقدیسی	۶- ناقاسی	۷- اورنگی	۸- حصہ کاوس
۹- ماہ برکوہ	۱۰- مشک دانہ	۱۱- آرایش خورشید	۱۲- نیمروز
۱۳- سبز در سبز	۱۴- قفل رومی	۱۵- سروستان	۱۶- سروسہی
۱۷- نوشین باد	۱۸- رامش جاں	۱۹- ناز (ساز)	۲۰- مشکویہ
۲۱- مہرگان	۲۲- مرادی نیک	۲۳- شبدیز	۲۴- شب فرخ
۲۵- فرخ روز	۲۶- غنچہ کبک دری	۲۷- نخچیرگاں	۲۸- کین سیاوش
۲۹- کین ایرج	۳۰- باغ شریں		

نظامیؔ کے تین چار سو سال بعد شیرازیؔ نے ان راگوں کے ناموں کو منظوم کیا اور اس کے ساتھ ساتھ راگوں کی خصوصیات بھی بتلائی ہیں:

عشاق' نوا' عراق' حجاز' حسینی' زنگولہ' صفاہان' راست' رہاوہست' کوچک' بزرگ' بوسلیک-

وارث شاہ نے اپنی مثنوی ''ہیر وارث شاہ'' میں کئی راگوں کے ناموں کو نظم کیا ہے' جو اغلب ہندوستانی ہیں' بشن پت' ٹلنجا' پہاڑی' ڈھول' شدھ' تیوڑ' رکھب' پنچم' وادی'

اڑانا' سورٹھ' گن کلی' مبیں' سوہنی' تنک' سارنگ' سوہلے' شاہانہ' للت' بہرو دیپک' کھرج' زیل' ٹودی' میگھ' ملہار' ماسرا' مالوی' کدارا' بھیم' جنگلہ' نٹ' جھنوئی' ہوری' بہرویں' دھتری' مالکونس' جوگیا' آساوری' مارو' سدرج' گنڈھار' دھیو' نکھاد' مدھم' سر' کومل' شنپو ز بسنت' توڑی' لپ' ترانہ' پلاس۔

چونکہ امیر خسرو فارسی راگوں کے ساتھ ساتھ ہندی راگوں سے واقف تھے' اس لیے دونوں موسیقی کی راگوں کو ترکیب دے کر نئی راگوں کو اختراع کیا اور دنیائے موسیقی میں ہیجان پیدا کر دیا۔ عالمگیر دور کے امیر فقیر اللہ سیف خان نے ''راگ درپن'' میں لکھا ہے کہ ساز گری' باخرز' عشاق اور موافق راگوں میں خسرو نے موسیقی کا کمال دکھایا ہے اور دیگر راگوں میں کچھ ادل بدل کر کے ان کے نئے نام رکھ دیے ہیں چنانچہ قول' ترانہ' خیال' نقش' نگار' بسیط' تلانہ اور سوہلہ: سب امیر خسرو کی ایجادیں ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' میں لکھا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں امیر خسرو جیسے مجتہد فن کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے کہ ہندوستانی موسیقی اب ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی۔ ساز گری' ایمن اور خیال تو خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستان کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے' دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ قول' ترانہ اور سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گویے کی زبان پر ہیں۔ کتاب ''مآثر الامرا'' جلد دوم' مطبوعہ کلکتہ میں امیر خسرو کی ایجاد کردہ راگوں' اور یہ راگیں کن راگوں کی ترکیب سے بنی ہیں' مفصل طور پر بیان کی گئی ہیں' جن سے کچھ اشارے یہاں پر پیش کیے جاتے ہیں:

امیر خسرو کی ایجاد کردہ راگیں	کن راگوں سے بنائی گئی ہیں
۱۔ مجیر	غار + ایک فارسی راگ
۲۔ ساز گری	پوربی + گورا + گنکلی + ایک اور فارسی راگ
۳۔ ایمن	ہنڈول + نیریز
۴۔ عشاق	سارنگ + بسنت + نوا

Dr. SYED S.HUJAUT ALI
RESEARCH GUID. n URDU,
S.R.T MARATHWADA UNIVERSITY
NANDED-431602

۵- موافق	توڑی + مالثری + دوگاہ + حسینی
۶- غنم	پوربی میں تھوڑا تصرف کیا گیا ہے
۷- زیلف	کھٹ + شہ ناز
۸- فرغنہ	گنکلی + گورا + فرخانہ
۹- سرپردہ	سارنگ + بلاول + بسنت
۱۰- باخرز	دیسکار + ایک فارسی راگ
۱۱- پھر دوست	کانڑا + گوری + پوربی + ایک فارسی راگ

یہی نہیں بلکہ امیر خسرو نے ستار کو اختراع کیا اور آج ستار دنیا کے عظیم آلات موسیقی میں شمار کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو نے مردنگ کو ڈھولک کی شکل میں تبدیل کیا جسے تمام ایشیا میں مقبولیت حاصل ہے۔ ایرانی باجے تنبور کے بجائے بینا ایجاد کی۔ اس کے علاوہ برصغیر میں جو قوالی مشہور ہے وہ قوالی بھی امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے۔

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا نے امیر خسرو کی موسیقی میں مہارت دیکھ کر آپ کو "مفتاح السماع" کا خطاب دیا۔

☆......☆......☆

''نغمہ زنجیر'' کی تاثیر

عبدالرحمٰن صدیقی کے مجموعہ کلام پر تبصرہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ کمال کو صرف صاحب کمال ہی احساس کر سکتا ہے' اور یہ احساس ہر شخص میں اس کی ذہنی' فکری اور علمی استطاعتوں پر منحصر ہوتا ہے' چنانچہ اسی لیے ہر شاعر کا ایک خاص مقام اور ہر شعر کا ایک خاص دام ہوتا ہے' لیکن چونکہ ہر شعر کی تخلیق میں پوشیدہ ایک ہی نظام ہوتا ہے' اگرچہ اس کی وجہ تخلیق کا اہتمام اور انتظام جداگانہ ہی کیوں نہ ہو' اس لیے ہر شخص شاعر نہیں بن سکتا اور ہر شخص شاعر نہیں بنایا جا سکتا:

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

شاعری کے لیے طبع کی موزونی' خیالات کی فراوانی' جذبات اور احساسات کی شعلہ فشانی اور الفاظ کی روانی درکار ہوتی ہے' چنانچہ ان امور میں بعض امر وہبی اور بعض اکتسابی ہوتے ہیں' اس لیے بعض افراد' جو اکتسابی ضروریات کو پورا کرنے پر توجہ نہیں دیتے' شاعری کی وہبی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی عمر بھر شاعر نہیں بنتے اور بعض افراد وہبی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے بھی اکتسابی ذرائع سے شاعری کے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ عام لوگ انھیں شاعر تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں' لیکن پھر بھی وہ شاعری کے معیار پر پوری طرح نہیں اترتے ہیں۔

جدید تحقیق اور علمائے ادب کے اکابرین نے اس بات کو غلط ثابت کیا ہے کہ اصلی' فطری یا وہبی شاعری کا آغاز انسان کے شعور کو سنبھالنے یا زندگی کے اول حصے میں ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شاعری کا تخم' انسانی پیکر میں موجود ہو' تو وہ' جب بھی نمو کے حالات سازگار ہوں گے' شجر شاعری میں تبدیل ہو گا۔ اگر یہ حالات دس سال کی

عمر میں سازگار ہوں تو شعر کی تخلیق دس سال کی عمر میں شروع ہو جائے گی' اور اگر ان کے لیے ساٹھ سال کی عمر درکار ہو تو اس وقت شاعری کا آغاز ہوگا' یعنی شاعری کی طرح ہے' اگر زمین نرم اور راستہ سازگار ہو تو بہت جلد شاعری کا ظہور ہوگا اور اگر راستہ سخت ہو تو بڑی دیر بعد اس کا پتا چلے گا' یا ہمیشہ کے لیے نظروں سے معدوم رہے گا- اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ عمر کے ہر حصے میں' معاش کے ہر طبقے میں' دنیا کے ہر خطے میں' ہر آن اور ہر زمان' نئے نئے شاعر پیدا ہوتے ہیں اور شاعری کے کاروان میں شریک ہوتے ہیں- عالمی ادب میں سب سے پہلے شعر کی حقیقت اور اس کی ماہیت پر ارسطو نے اپنی کتاب ''بوطیقا'' (پوئٹری) میں بحث کرتے ہوئے کہا کہ شعر ایک قسم کی مصوری ہے- فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے' اس کے برخلاف شاعر ہر قسم کے خیالات' جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے- مولوی حمید الدین نے ''جمرۃ البلاغت'' میں شعر کی تعریف کرتے ہوئے بتلایا کہ شاعر کو صاحب شعور اور صاحب احساس کہنا چاہیے' جو احساس کو الفاظ کے جامے میں ظاہر کرتا ہے' چنانچہ وہ چیزیں' جو احساسات اور جذبات کو برانگیختہ کرسکیں' وہی شاعری ہیں- ان خیالات کے تحت جب ہم جناب عبدالرحمٰن صدیقی کی تخلیق ''نغمہ زنجیر'' کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ موصوف نے قطعات اور غزل کے روپ میں اپنے احساسات اور جذبات کے رنگ کو ایسا پیش کیا' جو ان کی وجدانی کیفیت کی شناخت بن گیا- شعر کو پرکھنے اور شاعری کو تولنے کا کوئی خاص معیار ابھی تک نہیں بن سکا- ہر شخص کی قلبی واردات جس شعر میں مخفی ہوتی ہے' وہ اس کا پسندیدہ شعر' اور جو شاعر اس قسم کے اشعار زیادہ بیان کرتا ہے' اس کا پسندیدہ شاعر بن جاتا ہے' اسی لیے ''نغمہ بلبل'' سے ''نغمہ زنجیر'' تک ہر صوت صدا اپنا خاص مقام اور اپنا خاص دام رکھتی ہے' اس لیے تو شاعر کو ادب کا انعام کہا گیا ہے' چنانچہ انھی انعامات میں ایک انعام یہ کلام ''نغمہ زنجیر'' ہے' جو سادگی' لطافت' پاکیزگی اور صداقت کا پیغام ہے- جس طرح ایک آم کی ٹپک سے تمام درخت کے آموں کی رسیدگی کی اطلاع ہو جاتی ہے' جس طرح بریانی کے ایک دانے کو دبا کر تمام بریانی کی کیفیت حاصل کی جا سکتی ہے' اسی طرح شاعر کے صرف چند اشعار' بلکہ بعض اوقات صرف ایک ہی مصرعے سے ذہن کی پختگی اور مزاج کی سانچگی کو پرکھا جا سکتا ہے- صدیقی صاحب کی آج سے ۴۵ سال قبل کی غزل کا مصرع ''مصرف تو کچھ بتائے آخر نقاب کا'' ان کے تغزلانہ رنگ

کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ شعر گوئی کا یہ سفر اول جوانی سے شروع ہو کر ارتقا کے زینے طے کرتا ہوا کبھی رکتا، کبھی بڑھتا، کبھی آہستہ، کبھی تیز مگر ہمیشہ جاری رہا۔ صدیقی صاحب نے علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد مرحوم چونکہ عربی، فارسی اور اردو کے استاد اور شاعر تھے، اس لیے ماحول سازگار ہونے کی وجہ سے آغاز جوانی سے ہی غم جاناں کی کیفیت اشعار کے سانچے میں ڈھل کر نمایاں ہونے لگی، لیکن جیسے جیسے غم روزگار سے آشنائی ہوتی گئی، غم دوراں بھی اس میں شامل ہو گیا، چنانچہ اس مجموعہ کلام، جس میں کل ۱۸۱۹ اشعار ہیں اور جو ۹۹ غزلیات، ۱۳۵ قطعات، دو حمدوں، ایک نعت اور ایک نظم پر مشتمل ہے، غم جاناں اور غم دوراں کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ صدیقی صاحب کی ۹۹ غزلیات کے ۵۲۲ اشعار کو شاعری کی شوخ زبان میں تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: غم جاناں، غم دوراں اور تجربات زمانہ۔ آپ کی زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحر میں، آسان قوافی اور سہل عام فہم ردیف سے مجز ہیں۔ عموماً غزلوں میں کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ نو اشعار نظر آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اضافت کا ہونا یا نہ ہونا شاعری کے محاسن میں شمار نہیں ہوتا، البتہ اضافت طولی، یعنی تین سے زیادہ اضافات سے بھی بھری ہوتی ہیں، لیکن اگر چھوٹی بحر کی غزلوں میں اضافات کم یا بالکل ہی نہ ہوں، تو وہ ایک زبان کا کمال اور حسن سمجھا جاتا ہے۔ صدیقی صاحب کے ۵۲۲ غزل کے اشعار میں صرف ۵۸ اضافتیں نظر آتی ہیں، یہاں تک کہ ۲۶ غزلوں میں کوئی اضافت موجود نہیں اور ۲۹ غزلوں میں صرف ایک ہی اضافت کا استعمال ہوا ہے، یعنی چھوٹی بحر میں بغیر اضافت کے بڑی بات کہنا صدیقی صاحب کے کلام کا خاص حسن ہے اور یہ ان کا شاہکار تصور کیا جا سکتا ہے، جس سے وہ بھی شاید زیادہ واقف نہ ہوں، کیونکہ یہ عموماً ایک لاشعوری اسلوب زبان ہوتا ہے۔ تمام غزلوں میں غیر فصیح الفاظ، مشکل، ادق اور غیر مانوس بندش اور اضافی الفاظ برائے ضرورت شعر بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگرچہ کلام میں مختلف مقامات پر محاورے، استعارے، تشبیہات کے علاوہ چیدہ چیدہ محاسن صنائع معنوی و لفظی نظر آتے ہیں، لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں، کیونکہ شاعر نے شعوری طور پر صنعتوں کے استعمال پر زور نہیں دیا۔ بعض اشعار میں الفاظ کی بندشیں جدید اور اچھوتی طرز پر قائم کی گئی ہیں۔ ایک پانچ اشعار پر مشتمل غزل میں آنکھیں ردیف رکھ کر بوجھل، جل تھل، آنچل اور بادل آنکھیں کی ترتیب جدید اور خوبصورت ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کبھی حیراں، کبھی بے کل آنکھیں
پیار کے بوجھ سے بوجھل آنکھیں
زندہ رہنے کی تمنا جاگی
ہائے! وہ اشک سے جل تھل آنکھیں
چھا گئی روح و بدن پر گویا
دل پہ لہرا گئیں آنچل آنکھیں
دھوپ ہی دھوپ تھی، صحرا تھا مگر
تھیں مرے ساتھ وہ بادل آنکھیں

صدیقی صاحب کا کلام برصغیر کے اصل تغزلیانہ تخیل کا نچوڑ ہے۔ آپ دراصل غزل، اور وہ بھی حدیثِ دلبری کے شاعر ہیں۔ کچھ غمِ جاناں کے متعلق اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ بھی کیا لوگ تھے، رخسار کے تل کی خاطر
تھا بہت سہل جنھیں نذر بخارا کرنا
گفتگو غیر سے، مخاطب ہم
آپ کی ہر ادا نرالی ہے
پھر وہی انتظار ہونے لگا
لمحہ لمحہ شمار ہونے لگا
گھپ اندھیرے میں یوں خیال آیا
روشنی جیسے طور سے آئی
وہ مرے دل کا ایک گوشہ ہے
تم جسے کائنات کہتے ہو
ایک ہی کاروبار کرتے ہیں
خوبرووں سے پیار کرتے ہیں
ہزاروں پھول گلشن میں کھلے ہیں
مگر سب زخمِ دل کے سلسلے ہیں
وہ نہیں آئے، آ گئے آنسو
ختم اب انتظار ہے گویا

قیمت دید ہو گئی حاصل
یوں کسی شوخ نے سلام کیا

ایک اور خاص بات، جو موصوف کے کلام میں ہے، وہ عجز و انکساری اور خاکساری ہے، یعنی شاعرانہ تعلّی اشعار میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ موجودہ دور میں اغلب شعرا تعلّی کی حد میں اس درجہ آگے بڑھ جاتے ہیں کہ غالب و میر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ کسی عظیم شخصیت نے کہا ہے کہ سب سے اچھا شاعر وہ ہے، جو سچا ہو۔ دیکھیے کیا اس سے سچا شعر ممکن ہے، جو صدیقی صاحب نے کہ دیا:

جو دل میں آیا، کہا، شعر ہو گیا شاید
نہ ہم نے آج تلک شاعری کا فن جانا

شعر اچھا لگے تو داد بھی دے
ورنہ بے وجہ واہ واہ نہ کر

رقیق القلب ہونا چاہتا ہوں
کہ لمحہ لمحہ رونا چاہتا ہوں

عجیب ہجرت، مقدر میں لکھی تھی
کئی شہروں میں آ کر بٹ گئے ہم

بچہ تو سچ بول رہا تھا
اس کو کیوں ماں باپ نے ڈانٹا

یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ صدیقی صاحب آدرش اور نصیحتیں نہیں کرتے، بلکہ اصلاحی مفاہیم میں خود کو بھی شریک کر لیتے ہیں:

جس کو ہم نے بنایا خوں دے کر
اس نگر میں ہمارا گھر ہی نہیں

جھوٹ کو جھوٹ ہی کہا بے شک
یہ خطا بار بار کرتے ہیں

ہے اجالوں پہ حق ہمارا بھی
ہم نے خوں کے دیے جلائے ہیں

کوئی ملتا نہیں ہے حرف شناس
فکر محکوم ہے' نظر بھی تنگ

چونکہ شاعر کی احساسی قوت دوسرے افراد کی نسبت زیادہ ہوتی ہے' جو زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ غم جاناں' غم دوراں اور تجربات زمانہ کی آمیزش سے انوکھے تاثرات پیدا کرتی ہے' جو بعض اوقات شاعر کی شناخت بھی تصور کی جاتی ہے' شاعری کا ایک خاص موضوع ہے۔ آخر میں صدیقی صاحب کے صرف چند اشعار' جو اس راہ کے نقیب بن کر نمایاں ہوئے ہیں' پیش کر رہا ہوں:

وہ خود ہی پوچھ رہے ہیں سبب تباہی کا
فقیہ شہر کے انداز کا جواب ہے' کیا
ہمیں تو یاد نہیں کتنے لوگ قتل ہوئے
رئیس شہر! ترے پاس کچھ حساب بھی ہے
ہر شخص لیے پھرتا ہے بت' اپنی انا کا
کب ذات کے مندر سے نکلتے ہیں یہاں لوگ

لمحہ لمحہ بدل رہی ہے حیات
یاں کسی چیز کو ثبات نہیں
نشان راہ نہ منزل' نہ رہنما کوئی
فقط خیال سفر سے بہل گئے ہیں لوگ
کوئی قاتل کا نام بھی پوچھے
زخم سب دیکھتے ہیں کھل کے

☆ ☆ ☆

رسم رونمائیِ مجموعہ کلام

ادبی بدعت، جو ادبی سنت بن گئی

اردو اور فارسی ادب میں لفظ ''رونمائی'' ایک لطیف اور حسین کیفیت کا حامل ہے۔ صدیوں سے یہ لفظ ہماری تہذیب میں دلہن کے چہرے کی جلوہ گری کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے، چنانچہ اسی نسبت سے شادی کی زنانہ رسومات کو جلوہ کہتے ہیں، جس میں دلہا کو آئینے میں پہلی بار دلہن کا چہرہ دکھایا جاتا ہے اور پھر کئی دن تک یہ رسم رونمائی دلہا کے محرم رشتہ داروں میں جاری رہتی ہے، جس میں دلہن کو نقدی اور تحفے دیے جاتے ہیں۔ چونکہ ادب اور تہذیب کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا اور معاشرے کی ترقی میں دونوں عناصر کی شرکت شامل حال رہی، اس لیے جب ادبی مشاعرہ ہماری تہذیب کا حصہ بن گیا تو ہماری رسومات اور روایات کی اصطلاحیں، جو ادب ہی سے قرض لی گئیں تھیں، مشاعرے میں استعمال ہونے لگیں، چنانچہ پھولوں کے ہار، کھانوں کی بہار، سولہ سنگھار اور مہمان خصوصی کے لیے تقریب کے دلہا یا دلہن کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اجرائی کے لیے رونمائی جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے۔

کتاب کی رسم رونمائی نے جس طرح اردو زبان میں رواج پیدا کیا ہے، اس کی مثال کسی اور مشرقی زبان میں موجود نہیں ہے۔ یہ رسم لگ بھگ پینتیس چھتیس سال سے ہمارے ادبی معاشرے میں جاری ہے۔ میری محدود کاوش اور تحقیق کے مطابق ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کراچی میں ایک مجموعہ کلام کی رسمی تقریب رونمائی انجام دی۔ اس سے پہلے اردو ادب میں کسی کے جدید منظوم یا نثری کلام پر مختلف افراد نے یکجا اپنی رائے کا اظہار کیا، کتاب کا تعارف اور کلام شاعر بہ زبان شاعر ایک ہی نشست میں انجام نہیں ہوا تھا۔ یہ ادب کا پہلا کامیاب تجربہ تھا، چنانچہ اس کے بعد یہ پروگرام اس

طرح عام ہوا کہ ہر مقام پر، ہر شام میں، ہر نام کی نسبت سے اس کام کو بطور انعام جاری رکھا گیا اور آج شاید کوئی ایسا مقام یا کوئی ایسی شام نہ ہو گی جس میں کہیں کسی کتاب کی رسم رونمائی انجام نہ ہو رہی ہو اور اس طرح دیکھتے دیکھتے یہ ادبی بدعت، ادبی سنت میں تبدیل ہو گئی۔

اگر اردو ادب کی پانچ سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے اولین نثر اور نظم نگاروں نے اپنے کلام اور بیان کی تشہیر، تبلیغ اور حفاظت کا کبھی بھی خیال نہ کیا۔ صرف بادشاہوں، حکمرانوں، ملک الشعرا اور درباری شاعروں کے دیوان یا وہ قصائد، جو صرف ان کی شان میں ہوتے تھے، کتابی شکل میں نظر آتے، آج بھی محفوظ ہیں۔ عام لوگ اپنے اعتقاد اور مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مذہبی کلام کو بھی جمع رکھتے اور اس کام کے لیے اصل سے نقل کر لیتے اور بیشتر کلام مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہوتا تھا۔ بعض اوقات اساتذہ کا کلام ان کے شاگردوں کی جانب سے شائع ہوتا اور بعض اوقات شاگردوں کے نام ہی کا ہو کر رہ جاتا۔ تقریباً گذشتہ دو سو سال سے شاعروں کو اپنے کلام کی جمع آوری کا احساس ہوا، چنانچہ میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، میر حسن دہلوی، غلام ہمدانی مصحفیؔ، مرزا غالبؔ اور کئی دیگر نامور شعرا نے اپنی زندگی ہی میں اپنا دیوان مرتب کر کے شائع کروایا، لیکن کسی قسم کی رسم رونمائی انجام نہ دی، یہاں تک کہ دیوان شائع ہونے کے کئی سالوں بعد بھی لوگوں کو مکمل خبر نہیں ہوتی تھی۔ میر انیسؔ، مرزا دبیر اور کئی بڑے شعرا نے تو کلام کی جمع آوری اور اس کی حفاظت کی بالکل فکر نہ کی، جس کی وجہ سے ان کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ یہ عظیم شعرا اپنے اشعار کو اخروی منزل کا اساسہ اور زینت سمجھتے تھے اور تشہیر و تبلیغ سے گریز کرتے تھے، ورنہ میر انیسؔ کے پاس انتقال کے وقت اتنا پیسہ موجود تھا کہ تمام کلام کو بدرجہ احسن شائع کرا کر مفت تقسیم کر سکتے تھے۔ مغربی دنیا میں کتابوں پر تبصرہ Book Review کی رسم تقریباً ۱۵۰ سال سے جاری ہے، جس میں ایک قابل محقق اور مقبول تنقید نگار بڑی تمکنت اور نزاکت اور ادبی حوالوں سے اس کتاب پر تبصرہ کرتا ہے جس سے قاری اور مولف، دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

اردو ادب میں رونمائی عموماً مجموعہ کلام اور دیوان کی ہی ہوتی ہے۔ رونمائی درحقیقت ایک مثبت اقدام ہے، اگر اس کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو ادب کی خدمت ہو سکتی ہے۔ رونمائی کے مثبت نتائج میں سب سے اہم نکتہ صاحب دیوان کے کلام

کی تشہیر ہے' تا کہ بیشتر لوگ کلام سے واقف ہو سکیں' جو شاعر کی ہمت افزائی کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس کلام کا دوسرا مثبت اثر علمائے ادب اور ناقدین کی گراں قدر آرا اور مشورات ہوتا ہے' جس سے صاحب کلام اپنے کلام کے محاسن اور اس کی کمزوریوں سے بھی بڑی حد تک واقف ہو سکتا ہے' تا کہ آیندہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ تیسرا فائدہ ان ہی تقریبات کے عوض عام لوگوں میں ادب کا ذوق و شوق بڑھتا ہے اور یہی محفلیں ادب کے پرچار کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ آج کل رونمائی کی تقاریب اپنے اصلی مقاصد سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور تقریب رونمائی' خود سرائی اور خود نمائی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی تقریب رونمائی کی تقاریب شروع ہو جاتی ہیں۔ آج کل اردو ادب کے بعض ادیب' نقاد اور محقق ماہرین تقریظ ہو گئے ہیں' چنانچہ بغیر کتاب کے مطالعے کے لفظوں کے تومار' گدھے اور گھوڑے کو ایک ہی اصطبل میں باندھ کر' تقریباً ہر کتاب پر کچھ جملوں اور لفظوں کو بدل بدل کر وہی پرانی شراب نئے پیالوں میں انڈیل دیتے ہیں' جس کا نشہ صاحب دیوان شاعر پر بڑی مدت تک طاری رہتا ہے' چنانچہ اس کا دماغ آسمان پر اور اس کے پر ہوا میں معلق رہتے ہیں اور وہ بڑی مدت تک اپنے مقام کو بھول کر ہوائی محلوں کی سیر میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنے کو خدائے سخن جان کر اساتذہ شعرا ہی نہیں بلکہ غالب اور حافظ کو بھی اپنے برابر ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔

آج سے چند سال قبل کتاب کی رونمائی صرف ایک بار ایک ہی زمان و مکان میں کی جاتی تھی' لیکن آج کل ایک کتاب کی رونمائی مختلف اقساط میں' مختلف شہروں بلکہ مختلف ممالک میں' مختلف تاریخوں میں کی جاتی ہے' جس کے لیے مختلف انجمنوں' ادبی' سماجی' ثقافتی اداروں سے مدد لی جاتی ہے۔ مشاہدات بتلاتے ہیں اس قسم کی تشہیر کا اثر معکوس ہوتا ہے۔

ہماری نظر میں کتاب کی رسم رونمائی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ان نکات کا خیال رکھنا ضروری ہے:

☆ کتاب کی رونمائی سے زیادہ فکر کتاب کے کلام کی صحت' کتابت اور طباعت پر دینا چاہیے' کیونکہ کلام کے چھپ جانے کے بعد کوئی شاعر بھی اپنا معیار چھپا نہیں سکتا' یعنی جب تک شاعر کا کلام شائع نہیں ہوتا' اس کی مٹھی بند رہتی

ہے۔

☆ کتاب کی تقریظ اور محفل رونمائی کے مقالات کے لیے مشہور و معروف افراد کے بجائے ان افراد کو ترجیح دیں جو کتاب کو ایمانداری سے پڑھ کر محاسن اور عیوب کلام کی شناخت کر سکیں اور کتاب پر غیر جانبدارانہ اظہار کر سکیں۔ قاری کی نظر میں کتاب کی قدر و قیمت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب تصویر کے دونوں رخ اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ قاری کا اعتماد نفسِ شاعر کی نسبت بڑا اہم مسئلہ ہے' ورنہ بقول خالد عرفان:

کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں
کتاب چیخ رہی تھی کہ میں کتاب نہیں

☆ کتاب کی رونمائی صرف ایک بار اور وہ بھی اس شہر میں کی جائے جس میں شاعر سے لوگ کم و بیش واقف ہوں' اور اس کے علمی' اخلاقی' سماجی اور شعری اقدار سے آشنائی رکھتے ہوں۔

☆ جلسہ رونمائی میں کتاب برائے تقسیم یا برائے نام قیمت پر فروخت ہونی چاہیے' کیونکہ عموماً اس تقریب کا کچھ اثر کچھ دن تک سامع پر طاری رہتا ہے اور اسی وقفے میں وہ مجموعہ کلام کا مطالعہ کر سکتا ہے' ورنہ بعد میں کتاب کتب خانے کی زینت بن کر ہمیشہ کے لیے پڑی رہتی ہے۔

☆ صاحب دیوان شاعر کو چاہیے کہ کچھ منتخب کلام اپنے انداز بیان میں سنائے' تاکہ لوگ کلام بہ زبانِ شاعر سے حظ اٹھا سکیں۔

☆ مقامی روزناموں اور منتخب جرائد میں اس تقریب کی روداد مختصر اور صحیح دینی چاہیے' مبالغے سے حتی المقدور کنارہ کشی کی جائے' کیونکہ بقول مولانا روم:

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

☆......☆......☆

خالد عرفان کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ

اردو شعر و ادب میں تنقید کا رواج قدیم' اس کی تاریخ سقیم اور اس کا مزاج شاعر کی نسبت خصیم رہا ہے- تذکروں کی شکل میں اشعار سے زیادہ شاعروں کو ہدف بنایا گیا- تبصروں اور تفسیروں کے پس پردہ دل کی خلش اور خصومتانہ رویے کو کسی نہ کسی طرح پورا کیا گیا- کبھی گروہ بندی اور ترجیح کے باعث خزف کو الماس اور کبھی الماس کو خزف بنانے کی ناکام کوشش بھی جاری رہی' لیکن کیوں کہ حقیقی فن کار عیار خالص ہوتا ہے' اس لیے اس کا اثر معکوس رہا- تنقید دراصل گلستان میں خار کی تلاش نہیں' تنقید خار کی نوک سے گل کو پرپر کرنے کا نام نہیں- تنقید کسی شاعر کی درجہ بندی کرنے کا پیمانہ نہیں- تنقید ادب کی عدالتِ عالیہ کا اٹل فیصلہ نہیں- تنقید جزو سے کل پر حکم لگانے کا نام نہیں' بلکہ تنقید ایک اعلیٰ ترین فن ادراک ہے' جس کے حاصل کرنے کے لیے اچھی قدروں کا شعور لازم ہے اور حقیقت میں نقاد وہی ہے' جو ان اقدار کا مالک ہو' اسی لیے تو مشہور نقاد چڑدس نے کہا تھا: جو کام ایک ڈاکٹر' جسم کے لیے کرتا ہے' وہی کام تنقید' ادب کے لیے کرتی ہے' یعنی وہ ادبی صحت کا معیار قائم کرتی ہے' پس جو چیز بھی اس کے خلاف ہو گی' وہ کوئی اور شے ہو سکتی ہے لیکن تنقید نہیں ہے- کسی بھی شاعر کے اشعار' اس کی شخصیت کے حصار میں' روزن کے مانند ہوتے ہیں' جس کے ذریعے خود شاعر روشنیِ فکر (Vision) حاصل کرتا ہے اور دوسرے افراد انھی روزنوں کی وجہ سے شاعر کی فنکارانہ شخصیت کو دیکھ سکتے ہیں' لیکن اس کے لیے دیکھنے والے کو بھی روزن کی سطح پر آنا ضروری ہوتا ہے' ورنہ نیچے سے صرف روزن کو دیکھا جا سکتا ہے' لیکن حصار کے اندر کے حالات معلوم نہیں ہو سکتے- میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی مبصر یا نقاد کو کسی شاعر کی فنکارانہ صلاحیت کو سمجھنے کے لیے کم از کم اس کے تخیل کی بلندی تک اپنی عقل و فکر کو لانا ہو گا' ورنہ وہ خود اپنے اور شاعر کے خیالات کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا' اسی لیے یہ راستہ ادب میں

بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز اور ریشمی لچھوں سے زیادہ پیچیدہ ہے، چنانچہ اسی راہ پر کئی نقاد نما افراد کی لاشیں ادب کے قبرستان میں نظر آتی ہیں، جو دوسروں کے لیے عبرت کا سبق بن سکتی ہیں۔ بہرحال، بقول حکیم انصاری:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

معروف نقاد اور مشہور فنکار میریڈتھ کے اقوال سچ ہیں کہ سچی کامیڈی وہ ہے جو ہنسائے، مگر ہنسی کے ساتھ فکر کو بھی بیدار کرے۔ کسی ملک کے متمدن ہونے کی سب سے عمدہ کسوٹی یہ ہے کہ آیا وہاں ظرافت کا تصور اور کامیڈی کا رجحان ترقی پر ہے یا نہیں۔

اردو ادب کا دامن مزاحیہ اور طنزیہ اشعار سے ہمیشہ سجا رہا، کیوں کہ یہی اشعار عوام کی غذا بنے رہے اور اغلب انھی اشعار کی مدد سے عام لوگوں نے شاعری کو پہچانا۔ ظرافت اور طنز کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھی ظرافت میں ہمیشہ ایک پوشیدہ طنز ہوتی ہے، لیکن طنز کے لیے ظرافت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ظرافت کا اصلی حسن یہ ہے کہ:

کر جائے کام اپنا لیکن، نظر نہ آئے

اردو شاعری میں عہدِ عالمگیر کے مشہور مزاح اور طنز نگار شاعر جعفر زٹلی سے اس عہد کے شاعر خالد تک کئی نامور، مشہور، معروف مزاح و طنز نگار شاعروں نے مختلف ادوار میں اپنی شاعری کا سکہ جمایا۔ حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف کہا۔ غالب کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اعلیٰ درجے کی ظرافت اور طنز نگاری کا مرقع تصور کیا جاتا ہے۔

سودا کے ہجویات، نظیر کے چٹکلات، جان صاحب کی ریختہ گوئی اور اکبر الہ آبادی کی ظرافت کے علاوہ اس صدی میں ظریف دہلوی، فرقت کاکوری، بوم میرٹھی، ظریف لکھنوی، سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، احمق پھپھوندوی، محمود سرحدی، دلاور فگار، مجید لاہوری، شوق بہرائچوی، شیخ نذیر، ظریف جبلپوری، خیالی، خوامخواہ حیدر آبادی، انعام الحق جاوید، جعفر رضوی اور دیگر دہا شعرا دن رات اسی ریاضت میں مصروف ہیں اور اکثر مشاعروں کی تاریک راتوں میں مزاح کی پھلجھڑیاں جلا کر لوگوں کو بیدار اور سوتی محفلوں کو رونق بخشتے ہیں۔

اسی میدان کے ایک شہسوار کا نام خالد عرفان ہے، جو سچی بات کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے۔ برناڈ شا نے کہا تھا: لوگ سچی بات پر سب سے زیادہ ہنستے ہیں، کیوں کہ اس

کو جھوٹ سمجھتے ہیں۔ میرے پیش نظر خالدؔ عرفان کے مزاحیہ قطعات ہیں، جو تنقیدی مزاج میں خالدؔ کی شاعری کی زبان کی چاشنی اور خیال کی ندرت کا ثبوت ہیں۔ مشہور یورپین نقاد فرائیڈ کہتا ہے کہ ظرافت، یعنی بے تکی باتوں میں تک کی بات کی جائے، یعنی ظرافت Sense in Nonsense (WIT) ہے۔ معمولی ظرافت الفاظ سے پیدا کی جاتی ہے اور اعلیٰ ظرافت کے لیے خیال کی ندرت ضروری ہے۔ ذیل کے قطعے میں ندرتِ خیال اور الفاظ کا کمال صرف ایک ہی لفظ ''جنتا'' پر مرکوز ہے۔ شاعر نے صنعت ایہام سے مکمل فائدہ اٹھایا ہے۔ ''جنتا'' سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی رعایا یا عوام کے ہیں اور ہندی میں ''جنتا'' فعل شرطیہ ہے جو مصدر ''جننا'' سے بنایا گیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کا املا اور تلفظ ایک ہی ہے اور یہ عروضی وزن فعلن پر ہیں:

عوام الناس کو جنتا کہا جاتا ہے، بھارت میں
مری دانست میں اس کا عجب مفہوم بنتا ہے
ہمارے ملک میں تو بیویاں وجہ ولادت ہیں
مگر حیرت ہے یہ اس ملک میں شوہر بھی جنتا ہے

اسی طرح ایک اور قطعے میں بھی صنعت ایہام سے طنز اور مزاح کا مزا دوبالا کیا گیا ہے، یہاں بھی لفظ ''میاں'' اسم خاص اور اسم عام: دونوں طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے، اور اس قطعے میں جدید معاشرے پر بڑا طنز بھی کیا گیا ہے:

مردوں کو چاہیے کہ چلیں اب اٹھا کے سر
ان پر نگاہِ خاص، نئے حکمراں کی ہے

ہر گھر میں شوہروں پہ مسلط ہیں بیویاں
لیکن وفاق میں تو حکومت ''میاں'' کی ہے

مشہور مزاح اور طنز نگار رشید احمد صدیقی نے بہت صحیح کہا ہے کہ طنز و ظرافت کی مثال تنقلی عمل کی طرح ہے۔ اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم کو تجربہ ہے، شاید آپ نے بھی دیکھا ہو گا، جب شاعر طنز و مزاح کے قصد سے قطعہ کہنا شروع کرتا ہے تو سامعین اس سے اوج نشاط Climax کی امید رکھتے ہیں، اگر وہ اس نشاط کو اپنے الفاظ اور معانی سے فراہم نہیں کر سکے تو شعر کی تعریف تو ایک طرف، ہونگ

اور خلع لباس کی نوبت آ جاتی ہے' اس لیے ہمارا یہ مشورہ ہے کہ اس تیز و رواں پانی میں ہر شاعر کو کودنا نہیں چاہیے' کیونکہ اس میں سلامتی کے ساتھ باہر نکلنا تو کجا' بلکہ لاش کے بھی گم ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ شمالی امریکہ کی مختلف شعری نشستوں اور مشاعروں میں ہم نے خالد عرفان کو یہ عمل بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہوئے دیکھا' کیونکہ وہ فطری' وہبی مزاح گو ہیں لہٰذا یہ قارئین کو مایوس نہیں کرتے۔ شعر کی تخلیق میں ماحول کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے' اسی لیے ماحول کو بدلنے کے ساتھ ساتھ شعر کے عنوانات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نیویارک شہر کی زندگی میں رفت و آمد کے لیے کم و بیش ہر شخص تیز رفتار ٹرین' جسے "سب وے" کہتے ہیں' سے استفادہ کرتا ہے کسی ویگن میں پڑا بیئر (Bear) کا ڈبہ ٹرین کی حرکت کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر حرکت کرتا ہے اور بیٹھے ہوئے مسافروں کے قدموں پر رک جاتا ہے۔ اس معمولی کیفیت کو خالد کی قوت متخیلہ نے بڑے اچھوتے انداز میں جذب کیا اور فوراً اشہب طبع نے الفاظ کا جامہ مہیا کیا اور خیال' قطعے کی شکل میں برآمد ہوا۔ یقیناً' کیا کوئی شخص ان اشعار کی صداقت اور اس میں پوشیدہ طنز تخجری سے انکار کر سکتا ہے' کیا ایسے اشعار سچے شاعر کی پہچان نہیں ہیں:

لڑھکتا تھا بیئر کا ڈبا' ریل کے اندر
سیاسی زندگی کا آئینہ معلوم ہوتا تھا
وہ سر اپنا جھکا دیتا تھا یوں گوروں کے قدموں پر
جنوبی ایشیا کا رہنما معلوم ہوتا تھا

اردو میں ہجو' ہزل' ریختہ' بذلہ سنجی اور پھکڑ پن جیسی مزاح کی شاعری اٹھارویں اور انیسویں صدی میں عام تھی۔ طنز اگرچہ ننگی تلوار کی طرح ان اشعار میں نمایاں تھا اور عام طور سے یہ شاعری کسی خصوصیت یا نفرت کی وجہ سے کی جاتی تھی' چنانچہ وقت کے گزرتے ہوئے اس کا اثر بھی معدوم ہو جاتا تھا۔ کون باور کرے گا کہ مرزا جانِ جاناں مظہر جیسے عظیم شاعر نے اپنے ہم عصر شاہ مبارک آبرو کے لیے جو ایک آنکھ سے معذور تھے' ایسا بیہودہ شعر لکھا ہے:

آبرو کی آنکھ میں اک گانٹھ ہے
آبرو سب شاعروں کی ...... ہے

انیسویں صدی کے آخر ربعے میں اور تمام بیسویں صدی میں' مزاح' طنز اور